زخمِ دل اور مہک

اور مہک

واجدہ تبسم

اودرسینز بک سینٹر
پلاٹ نمبر ۵۴ - ا - نارتھ لنکن روڈ
جوہو ولے پارلے اسکیم
بمبئی نمبر ۵۸

فون نمبر ۵۷۸۲۶۳

بسلسلہ مطبوعات نمبر ۵

بار اوّل

فروری ۱۹۷۶ء

قیمت ------ ۲۰ روپے

تعداد اشاعت ------ ایک ہزار ۱۰۰۰

ناشر:- ٹیپو سلطان ------ اوور سیز بک سینٹر بمبئی ۵۸

طابع ------ سراج الدولہ

کتابت ------ ولی محمد خاں

مصنفہ کا پتہ

ریلوے بلاک ۱۳۱ فلیٹ نمبر ۱۰

سانتا کروز (ویسٹ)

بمبئی نمبر ۵۴

رحیمی پریس بمبئی ۸

اپنے چاہنے والے اشّو کے نام
جو میرا میاں بھی ہے، دوست بھی،
اور عاشق بھی

ـــــــــــــــــــــــــ

دجّو

فہرست

قوسِ خیال

یہ دسمبر سنہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔
پاکستان کے ریاض ملک رفعت پبلشرز نے میری ایک کتاب بغیر اجازت "شعلے" کے نام سے شائع کر دی۔ یہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن تھا۔ جو مجھے ملا۔ اس سے قبل کوئی اقبال عرشی مکتبہ کتاب نگر لاہور بھی (جس کے طابع محمد طفیل مالک نقوش پریس لاہور ہیں)۔ میری ایک اور کتاب "درد کا چاند" مئی سنہ ۱۹۶۶ء میں شائع کر چکے تھے۔ جس میں میری اجازت کو کوئی دخل نہ تھا۔ میں کیا کر سکتی تھی۔ اس کے خلاف احتجاج کے طور پر اس زمانے کے صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کو خط لکھا کہ اس دھاندلی کو روکئے۔ مجھے قدرت اللہ شہاب کا جواب آیا (جو اُن کے سکریٹری تھے۔ اور خود بھی بڑے ادیب) کہ

میں پاکستان آؤں میرے ساتھ انصاف ہو گا۔ مگر دونوں ملکوں کی سیاست نے میرے ساتھ انصاف نہ ہونے دیا۔ اگر بات یہیں تک ہوتی تو کوئی بات نہ تھی۔ ۱۹۶۸ء میں ریاض احمد چودھری نیا ادارہ لاہور نے میری ایک کتاب "توبہ توبہ" شائع کر ڈالی۔ جس کے کرتا دھرتا حنیف رامے تھے (جو بعد میں پنجاب کے چیف منسٹر بن گئے)

جب صورت حال یہ ہو کہ... جن پہ تکیہ ہو وہی پتے ہوا دینے لگیں، تو میں نے اُمید کی زنجیر کی ہر کڑی توڑ ڈالی۔ کیونکہ بات پاکستان کی تھی جو میرے لئے "شہر ممنوع" تھا۔ قارئین پر یہ بات میں واضح کر دوں کہ میری ایک کتاب کے معنی پچاس ہزار روپیہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ پاکستان میں ایک ایڈیشن ۵ ہزار کا چھپتا ہے۔ اور میری کوئی بھی کتاب دس روپیہ سے کم کی نہ تھی ـــــ یہ قصّہ پاکستان کا تھا۔ جس کا حساب انشاءاللہ مجھے کسی نہ کسی دن مل جائے گا۔

مگر میں جس ملک کی مکین ہوں یعنی بھارت کی، تو اب یہاں کے لوگوں نے بھی دھاندلی شروع کر دی۔ ۱۹۷۲ء میں "روبی" کے ایڈیٹر نے میری ایک کتاب "شیشوں کے محل" قسط وار روبی میں شائع کرنے کے لئے لی اور ۱۹۷۶ء میں وہی کتاب "کیسے کاٹوں رین اندھیری"

جیسے گھٹیا نام سے شائع کردی۔ کتابت کی ہزاروں غلطیاں۔ گھٹیا اخباری کاغذ اور طباعت اتنی ناقص کہ کتاب ہاتھ میں لیتے ہی اُبکائیاں آنے لگیں۔

میں یہ فیصلہ ۱۹۷۲ء ہی میں کر چکی تھی کہ اپنی تمام کتابیں اسی بمبئی شہر سے اپنی نگرانی میں چھپواؤں گی۔ ۱۹۷۴ء میں اورسیز بک سینٹر نے میری دوسری کتاب "آیا لبنت سکھی" اپنی نگرانی میں چھپوائی۔ چند وجوہات کی بنا پر دو سال کام بند رہا۔ مگر جنوری ۱۹۷۷ء میں "اترن" شائع ہوئی جس کی کتابت طباعت معیاری تھی۔ پھر جون ۱۹۷۷ء میں "ننھ کا بوجھ" شائع ہوئی جسے دیکھ کر مجھے امید بندھی کہ انشاءاللہ میری تمام کتابیں اسی طرح شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کریں گی۔

مئی ۱۹۷۷ء میں بیسویں صدی میں میری ایک کتاب -- "کیسے سمجھاؤں" کا اعلان ہوا۔ اور اکتوبر ۱۹۷۷ء میں دو کتابوں کا اعلان "روبی" اور "بیسویں صدی" میں شروع ہوا۔ میں نے مئی ۱۹۷۷ء میں ایڈیٹر "بیسویں صدی" کو روکا کہ آپ ایسے بے وقوفی کے اشتہار مت دیجئے۔ مگر وہاں بندر کے ہاتھ میں تلوار تھی ... جون ۱۹۷۷ء میں میں اپنی کتاب "ننھ کا بوجھ" میں اعلان کر چکی تھی کہ میں اپنی تمام کتابیں "اوورسیز بک سینٹر بمبئی" سے چھپواؤں گی۔ اور بغیر اجازت

کتاب چھاپنے اور بیچنے والا قانون کے ہاتھوں میں ہو گا۔ مگر ستمبر ۷۷ء میں "بیسویں صدی" بک ڈپو نے میرے آٹھ افسانوں کا مجموعہ "کیسے سمجھاؤں" جیسے گھٹیا نام سے شائع کر دیا ــــ یہ نام میں زندگی بھر نہیں رکھ سکتی تھی۔ مجھے ہنسی یوں آتی ہے کہ جن لوگوں کو قلم تک پکڑنے کا سلیقہ نہیں۔ قسمت سے کسی پرچے کے ایڈیٹر بن بھی جائیں تو جہالت سے تو بہر حال دامن نہیں چھڑا سکتے اور اپنی نااہلی کا مظاہرہ اس قسم کے نام رکھ کر ضرور کر دیتے ہیں۔ جاہل کتاب چھاپنا کیا جانیں۔ کسی کتاب کا خوبصورت نام رکھنا تو خیر بہت ہی بڑی بات ہے ..... میں نے اپنی اُسی کتاب کا نام "زخمِ دل اور مہک" رکھا تھا جس میں درحقیقت ۱۵ رومانٹک افسانے ہیں جس کا اعلان میں نے ۱۹۷۲ء میں اپنی کتاب "شہرِ ممنوع" میں کیا تھا۔ (اور اب یہ وہی کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے)

بیسویں صدی پبلیکیشنز نے ایک اور گھٹیا حرکت میرے نام کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کی کہ ایک کتاب "روزی کا سوال" نومبر ۷۷ء میں شائع کر دی..... یہ افسانہ (روزی کا سوال) میں نے انھیں ۱۹۷۶ء میں روبی کے لئے دیا تھا۔

میرا ایک اور مجموعہ جس کا اعلان میں ۱۹۷۷ء جنوری میں کر چکی تھی "نتھ اترائی" تھا۔ جس میں ۱۲ افسانے طوائفوں پر مشتمل تھے

بیسویں صدی والوں نے طوائفوں پر لکھے گئے چھ افسانے شامل کر کے یہ کتاب انتہائی گھٹیا کاغذ پر چھاپ دی۔ کتابت اور طباعت ماشاء اللہ۔

کتاب خریدنے والا صرف میرے نام پر کتاب خریدتا ہے اور اسے کتنی مایوسی ہوتی ہے جب اس کے ذوق کی تسکین دس بارہ روپے خرچ کرنے پر بھی نہیں ہوتی۔

پاکٹ بک سر بز والوں نے مجھے بارہا لکھا کہ میں اپنا کوئی مجموعہ یا ناول انھیں دوں۔ مگر میں اتنی چھوٹی چھوٹی کتابوں میں چھپنے کی قائل نہیں کہ لوگ اسے ایک بار پڑھیں اور بعد میں ردّی میں بیچ دیں۔ بیسویں صدی والوں نے میری جو کتابیں "کیسے سمجھاؤں" اور "روزی کا سوال" چھاپی ہیں وہ ردّی میں بیچنے کے لائق ہیں۔ یہ کتابیں نہیں ایک نا اہل اور جاہل ایڈیٹر کی جہالت کا منہ بولتا اشتہار ہیں۔ اور میں جب بھی ان کتابوں کا اشتہار کسی پرچے میں پڑھتی ہوں تو اس جاہل شخص کی عقل پر ہنس دیتی ہوں جو اپنی ہی جہالت کو مشتہر کر رہا ہے۔

جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ میری بیس۲۰ سالہ محنت ہے۔ ذہنی کاوش۔ اسے کوئی بھی لوٹنے کی کوشش کرے گا تو دنیا کی، عوام کی اور آخرت کی ہر عدالت میں ذلیل ہوگا اور سزا پائے گا۔

ہر ادیب کی زندگی کا سرمایہ اس کی کتابیں ہوتی ہیں اور میری زندگی کا بھی یہی سرمایہ ہے۔ اور آپ کہنے کی اجازت دیں تو کہوں۔ "خوبصورت سرمایہ" ہے۔ جسے میں خوبصورت ترین انداز میں چھپوا کر اپنے قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہوں۔ جنھوں نے آج مجھے یہ عزّت اور مرتبہ بخشا ہے۔ اللہ رسول ؐ کے بعد آپ لوگوں نے مجھے اس مقام پر پہنچایا ہے کہ میری شرکت سے رسالوں میں حُسن آجاتا ہے اور ہر اُس شمارے کی اشاعت کئی ہزار بڑھ جاتی ہے جس میں میری کہانی چھپتی ہے۔

یہ سب میں اس لئے لکھ رہی ہوں کہ روبی ہو یا بیسویں صدی یہ لوگ میرے منع کرنے کے باوجود میری کتابیں چھاپ کر اور اس کا اشتہار دیکر اپنا پرچہ فروخت کرتے ہیں۔ تو نہ صرف عوام کو لوٹتے ہیں بلکہ میرے بال بچّوں کا صدقہ کھاتے ہیں۔ جس کی سزا انشاء اللہ انھیں ضرور ملے گی۔ بے غیرتی اور بے شرمی کی انتہا ہے یوں تو بھیک مانگ کر بھی پیٹ بھرا جا سکتا ہے۔

اس بے غیرت، بے ہودہ اور نالائق ایڈیٹر نے دھاندلی کی انتہا یہ کی کہ میری بنا اجازت، بنا معاوضہ دیئے یہ دو کتابیں چھاپیں تو چھاپیں۔ حد یہ کہ یہ تک کتابوں پر لکھ دیا کہ "جملہ حقوق بحق بیسویں صدی پبلیکیشنز (پ) لمیٹڈ دریا گنج محفوظ ہیں"

انسان اتنا بے غیرت، تن آسان اور مفت کی کھانے والا ہو تو آمدنی کے بہت سے مسائل تو گھر کی خواتین سے بھی حل ہو سکتے ہیں ـــــ حیرت تو مجھے یوں ہے کہ اس عقل سے کورے شخص نے آمدنی کا اتنا آسان "دھندہ" چھوڑ کر کتابیں چھاپنے کا راستہ کیوں چُنا ـــــ

لیکن بعض نامرد محنت کی کمائی حرام سمجھتے ہیں۔ اور ہیرا پھیری اور دھوکہ دہی سے اپنا پیٹ بھرنا جانتے ہیں۔ انہی میں سے ایک یہ "روبی" اور "اکیسویں صدی" کا نام نہاد ایڈیٹر ہے جسے انگلش تو چھوڑیئے اپنی مادری زبان اُردو کا بھی ایک صحیح جملہ لکھنا نہیں آتا۔ جو دوسروں کی ذہانت کے بل بوتے پر ایڈیٹر اور پبلشر بنا دندناتا پھرتا ہے۔ لیکن مانگے کے اُجالے سے ہمیشہ ہی اپنا گھر روشن نہیں رکھا جا سکتا ـــــ

بہرحال میں آپ سے اتنا بتا دوں کہ میرے اپنے ادارے " اوورسیز بک سنٹر " بمبئی سے آپ کو میری خوبصورت چھپی ہوئی اور معیاری کتابیں پیش کی جاتی رہیں گی ـــــ

زیر نظر مجموعہ " زخمِ دل اور مہک " بھی اسی دعوے کی ایک خوبصورت مثال ہے ـــــ یہ سارے افسانے میں نے

اپنی افسانہ نگاری کے ابتدائی سالوں میں لکھے تھے۔ جن کی بنیاد صرف محبّت پر ہے۔ یہ افسانے بہت پسند کیے گئے ہیں۔ رسالوں میں اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ میں نے ایک جگہ کر دیئے ہیں کہ آپ بھی پڑھ سکیں اور محسوس کر سکیں کہ محبّت بہرحال دُنیا کی سب سے خوبصورت شے ہے اور اس موضوع پر لکھی کہانیاں کبھی پُرانی نہیں پڑتیں ــــــ یہ موضوع جتنا قدیم ہے، اُتنا ہی نیا ہے۔ اتنا ہی خوب صورت اور اتنا ہی دل موہ لینے والا ــــــ

اس کتاب کے بعد، جلد ہی آپ کے سامنے میری چار اور کتابیں۔ (۱) نتھ اترائی۔ (۲) شہر ممنوع۔ (۳) جیسے دریا۔ (۴) اور بند دروازے اسی ادارے "اوورسیز بک سنٹر" سے پیش کی جائیں گی۔ جس کے پاس میری ہر تصنیف کے دائمی حقوقِ اشاعت محفوظ ہیں ــــــ اور مجھے یقین ہے کہ خدا کے فضل سے آپ کو مایوسی نہیں ہو گی ــــــ

واجدہ تبسّم
بمبئی
۲۰ر جنوری ۱۹۷۷ء سنہ ۶

خوشبوؤں کا مری دُنیا میں گذر کم کم ہے
زخمِ دل اور مہک، اور مہک، اور مہک

واجدہ تبسم

کھوئی ہوئی منزل

میں کتنی دیر سے اپنی انگلیوں میں قلم تھامے بیٹھی ہوں۔ لکھنے کی کوشش کرتی ہوں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے الفاظ رنگین تتلیوں کی مانند اپنے حسین پر پھڑ پھڑاتے ہوئے دور نکل گئے ہیں اور میں بے بسی میں ہاتھ ملتی انھیں اڑتا دیکھتی رہ گئی ہوں۔ بہت کوشش سے میں نے سیاہی میں قلم ڈبو دیا ہے۔ یہ کیسی ہنسی ہے۔ یہ کیسا کھنکتا ہوا قہقہہ ہے؟؟

"تمھاری حماقتوں کا بھی جواب نہیں۔ قلم سیاہی سے تر ہے اور تم خواہ مخواہ اس کو بار بار سیاہی میں ڈبوئے جاتی ہو۔ یہ کیا چکّر ہے — ؟؟"

میں نے گھبرا کر سیاہی سے قلم نکال لیا ہے۔ قلم کو کیپ سے ڈھک کر میز پر ڈال دیا ہے۔ اور اب کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی ہوں۔ کبھی کبھی صرف سوچتے رہنا بھی کتنا بھلا لگتا ہے۔ جاگتے جاگتے خواب دیکھنا۔ لیکن میری تو ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ جاگتے ہوئے خواب دیکھتی ہوں۔ سوچتی ہوں اپنے ننھے سے دل میں اتنی آرزوئیں کیسے پال لیتی۔ آرزوئیں! جو اندر میرے دل میں ستاروں کی طرح جگمگائیں۔ لیکن ٹوٹے ہوئے ستاروں کی طرح کوئی منزل نہ پا سکیں۔ اپنے نصیب کے لحاظ سے تو میں

سچ مچ ایک ٹوٹا ہوا ستارہ ثابت ہوئی جو روشنی کی لکیر بناتا، تھوڑی دیر کے لئے
اندھیرے کو اجالے کا رُوپ دیتا ضرور ہے لیکن پھر تاریکی اور تنہائی کی گود میں اپنا
منہ چھپا لیتا ہے۔ اور اب ایسی ہی بے مقصد روشنی کی لکیریں میرے سر میں چمک
رہی ہیں۔ چاندی کے راستے، اُجالوں کی رہ گزر، وہ حسین کہکشاں جو پیا کے دیس بھی
لے جاسکتی تھی۔ مگر اندھیروں نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے تنہائیوں میں بھٹکنے کے
لئے چھوڑ دیا ہے۔ میں اپنے پیچھے سارے چراغ بجھاتی آئی ہوں۔ اب تو میں عمر کی
اُس حد پر آگئی ہوں جہاں سفید بال چمک چمک کر یہ یاد دلاتے رہتے ہیں کہ اس
روشنی سے سیاہ اندھیرے بہتر ہیں۔ میں جو سدا راہوں میں چراغ جلاتی آئی
آج اُجالے کو ترس رہی ہوں۔ کیسے دُکھ کی بات ہے؟
(کبھی کبھی صرف سوچتے رہنا بھی کتنا بھلا لگتا ہے)
میں حسبِ معمول اُس رات چراغ جلا کر ٹیرس کے شہ نشین پر رکھ رہی تھی کہ اندھیرے
اُجالے میں لپٹی ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔
"یہ تیل کا چراغ ــــ؟ اور اتنے بلبوں کی موجودگی میں ــــ؟!"
بڑے بھیّا کی ہنسی سے بھرپور آواز سنائی دی۔ "ہاں یہ پگلی سمجھتی ہے کہ اس طرح
مسافر راستہ نہیں بھولتے۔"
"اچھّا! بڑی نازک خیالی ہے بھئی!"
میں نے پلٹ کر دیکھا۔ چراغ کی جھلملاتی لَو میں، میں نے دیکھا ایک تو بڑے
بھیّا ہیں اور ایک ...... (تم کہتے ہوئے نہ مجھکو شہزادی ــــ" اور ایک وہ جس
نے میری راہوں میں اندھیرے بکھیر دیئے!!")
ملگجی روشنی (جس میں اندھیرا غالب تھا) میں، میں نے سفید اور چمکیلے دانتوں کی

ایک لڑکی چمکتی دیکھی۔ ہنسی کی کھنک پھر گونجی۔

میں دل مضبوط کر کے بولی۔

"جی ہاں دیکھئے، اتنی بلندی پر اگر کوئی روشنی چمکتی دیکھے تو لپکا چلا آئے گا اور یہ کتنی اچھی بات ہے کہ کوئی بے چارہ راستہ ڈھونڈھتے ڈھونڈتے اجالا پا جائے منزل مل جائے!"

میں چلنے لگی تو بڑے بھیّا ہنس کر بولے۔

"اے ری بگلی شنجو! میں نے تجھ سے صبح کہا تھا کہ وقار آنے والا ہے، سو یہی ہے وہ، نیچے اس کی بہن بھی ہے! ـــ تُو تو کسی سے ملتی ہی نہیں اور سُن، صبح وقت پر ناشتہ ملے گا یا یونہی بجھے ہوئے چراغ سمیٹتی پھرے گی؟" ـ بڑے بھیّا نے ایک ہی سانس میں اتنے سوال کر ڈالے۔ میں گھبرا کر ہنس دی۔

"دو آدمیوں کے بڑھنے سے ایسا کون سا کام بڑھ جائے گا، آپ پریشان نہ ہوں۔ آپکے مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے گی۔"

وقار نے بات پکڑلی۔

"آپ کے مہمان ـــ!" وہ بڑے بھیّا سے مخاطب ہوگیا۔ "نورضا صاحب سُن لیا آپ نے؟ ہم صرف آپکے مہمان ہیں۔ ان کے کوئی نہیں۔"

میں سٹ پٹا سی گئی۔ سانس لے کر کچھ بولنے ہی کو تھی کہ میری نگاہ وقار سے اُلجھ گئی۔ میں اور گھبرا گئی۔ وقار ہنس دیا۔

میں نے سنبھل کر پھر اُسے دیکھا۔ ہیروؤں والی کوئی بات اس میں نہ تھی نہ ہاتھ میں ریکٹ تھا، نہ گلے میں مفلر، نہ بالوں کے چھلّے ماتھے پر لہرا رہے تھے۔ نہ شوخ رنگوں کی بُش شرٹ ہی تھی۔ وہ تو بالکل گھریلو انداز میں ایک ٹانگ پر زور

دیئے کھڑا تھا۔ سفر کی وجہ سے اُس کی پینٹ اور شرٹ میلے اور پُرشکن ہو گئے اور وہ سیدھا سادہ سا، بے ضرر انسان تھا۔

"آپ مہمان ہوتے تو مہمان مانتی۔ آپ تو بالکل اپنے جیسے ہیں۔" میں نے پھر نہ اپنی بات کا ردِّ عمل وقار کے چہرے پر دیکھنے کی کوشش کی، نہ آگے کوئی بات کی اور ہلکے پھلکے قدم اٹھاتی زینے سے اُترنے لگی۔

صبح حسبِ معمول ساڑھے چھ بجے میری آنکھ کھلی تو میری شرمندگی کی انتہا نہ رہی۔ بائیں باغ والے فوّارے کے پاس وقار کھڑا اچھُواریں دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی نظروں سے بچ بچ کر کچن تک پہنچی ہی تھی کہ وہ دور ہی سے پکار کر بولا۔

"اپنوں کو اسی طرح تکلیف دی جاتی ہے۔ جناب میں صبح ساڑھے پانچ بجے کا جاگا ہوا ہوں اور کم بخت بیڈ ٹی لینے کی بڑی ذلیل عادت پڑی ہوئی ہے۔"

میں نے جھجک کر اسے دیکھا۔

پھر آپ ہی آپ ہنسی میرے ہونٹوں پر تیر گئی۔

"اپنے چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو معاف بھی تو کر دیا کرتے ہیں۔"

اور میں کچن میں گھس گئی۔

ساڑھے آٹھ بجے میں کچن سے نکل کر ڈائیننگ ہال میں گئی تو یہاں سے وہاں تک بچوں نے طوفانِ بے تمیزی مچا رکھا تھا۔

"ہے ہے تم کو کچھ تمیز آئے گی بھی یا نہیں۔ میں نے کب سے تمہارا ناشتہ بھجوا دیا تھا اور اب تک کشتی ہو رہی ہے۔ بھلا مہمان کب کھائیں گے؟"

اپنے شانے پر ایک نرم نرم سے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک مہربان، شفیق، میٹھی میٹھی سی موہنی صورت۔

"ہم مہمان تو نہیں ہیں شجّو! اور پھر پورے گھر کے کام کا تم نے کوئی ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا ہے۔"

وہ مسکراہٹ کے ساتھ پیچھے مڑیں اور سلمیٰ آپا سے بولیں۔

"سلّو! بھئی کل سے کام کی باری بندھ جائے گی۔ ایک دن تم انتظام دیکھو گی، ایک دن ثریّا، ایک دن میں اور ایک دن شجّو۔ کیوں شہزادی ٹھیک ہے نا؟"

وہ ہنس کر بولیں۔

"لیکن..... لیکن....." میں گھبرا کر سلمیٰ آپا کو دیکھتی ہوئی بولی۔"نکہت باجی! آپ تو غضب ہی کر رہی ہیں۔ ایسا کون بڑا کام ہے اور پھر مجھے کام کرنے کی عادت ہے۔ ایک دن کام کر کے تین دن خالی بیٹھی کیا کروں گی؟ اللہ! اور پھر آپ جانتی ہی ہیں سلمیٰ آپا اور ثریّا باجی کو کالج بھی تو جانا پڑتا ہے۔"

نکہت باجی نے پوچھا۔

"اور تم کیوں کالج نہیں جاتیں؟"

میں جلدی سے بول اٹھی۔

"پڑھائی میں میرا جی نہیں لگتا۔"

میں نے جلدی سے پیٹھ موڑ کر پلیٹیں جمانی شروع کر دیں۔ کہیں وہ میرے چھلکتے آنسوؤں کو دیکھ لیتیں تو!

مجھے ہنسی بس یوں آتی ہے کہ ماں باپ لاڈ چاؤ میں آ کر اپنی اولاد کے کیسے غلط سلط نام رکھ دیتے ہیں۔ میرا نام شہزادی ہے۔ بس زندگی میں کسی بات پر اگر جی کھول کر ہنس سکتی ہوں تو اسی بات پر۔ ورنہ پھر بڑے سے بڑا مزاحیہ سے مزاحیہ لطیفہ بھی میرے ہونٹوں پر ہنسی کی لہر نہیں لا سکتا۔ ممکن تھا میں اپنی امّی ابّا کے ساتھ

رہی ہوتی تو میری زندگی کا یہ رنگ نہ ہوتا۔ لیکن حالات کی گردش کو کیا کہیے۔ ابا اچھے خاصے ایم۔ اے پاس تھے۔ حکومت کے بڑے عہدے دار تھے۔ ساڑھے سات سو روپے ماہانہ ملتے تھے۔ جو ایک فیملی کے رکھ رکھاؤ کے لئے کافی تھے۔ امّی یونہی سی پڑھی لکھی تھیں۔ کسی کے کہنے سننے پر جلدی یقین کر لیتیں۔ میری پیدائش کے چند سال بعد ایک جیوتشی نے اُنھیں بتایا کہ یہ لڑکی آپ لوگوں کے سائے میں نہ پنپ سکے گی۔ اسے کسی کو سونپ دیجئے۔ امّی کو یہی دھڑکن لگ گئی۔ اور کوئی بھروسے کا دکھائی نہ دیا۔ سوائے اپنی سگی بڑی بہن کے۔ امّی نے بہن سے کہا اور ساتھ ہی کھانے پینے کے لئے سو روپے ماہانہ دینے کا بھی وعدہ کیا۔ خالہ جان کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ دن اچھے خاصے گزر رہے تھے کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ امّی ابا دوسرے بہن بھائی کے ساتھ پاکستان جا رہے تھے کہ ان کی ریل کو آگ لگا دی گئی۔ جیوتشی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میں ان کے سائے میں پنپ نہ سکوں گی۔ لیکن کون پنپ سکا؟ سبھی تو بھسم ہو گئے۔ اور اس آگ سے بھی سنگین آگ مجھے اپنی لپیٹ میں لے بیٹھی اور پھر میں نے جانا کہ اپنے پرائے کس طرح بنتے ہیں۔ سو روپے کی مستقل آمدنی ٹوٹ جانے نے میری ادھوری تعلیم، میری پوشاک، میرے کھانے پینے، میری زندگی کے ہر شعبے پر اثر ڈالا۔ اور میں جب ذرا سمجھ دار ہوئی تو ہر آئے گئے کے سامنے اس بات پر شرمندہ ہوتی رہی کہ میرا نام شہزادی ہے۔ اگر اس گھر میں، میں کسی ہستی کے پیار کے سہارے زندہ تھی تو وہ تھے بڑے بھیّا۔ ان کا دل آسمان کی طرح بلند اور سمندر کی طرح وسیع اور گہرا تھا۔ انھوں نے کبھی مجھ میں، سلمیٰ آپا اور ثریا باجی میں فرق نہ کیا۔ ان کا کام کر کے مجھے کبھی کوفت نہ ہوئی بلکہ جی چاہتا کہ ان کا ہر کام میں ہی کرتی رہوں۔ کپڑے دھونے سے لیکر اُن کے جوتے کو پالش تک میں ہی

کرتی۔ اور جب کبھی وہ اِن کاموں کے اس قدر پابندی اور مستعدی سے انجام دیئے جانے پر گنگو کو شاباشی دیتے تو وہ گھبرا کر بولتا۔

"چھوٹے سرکار! یہ سب کام تو شہزادی بی بی کرتی ہیں"

تو بھیّا پیار بھری ڈانٹ سے میری تواضع کرتے۔ جو مجھے لاکھ محبّتوں پر بھاری لگتی۔

انسان دن بھر کام کرتا رہے، تھک کر چور ہو جائے، مر جائے اور کوئی تعریف کے صرف دو بول کہہ دے تو ساری محنت سہل ہو جاتی ہے۔ بڑے بھیا نے نہ جانے کہاں سے محبت کا یہ انداز پالیا تھا۔ میں کانٹوں پر چل رہی تھی پھر بھی محسوس کر رہی تھی پھولوں کی گود میں پل رہی ہوں۔ ان کا کام کرتے تھکن کی بجائے تازگی محسوس ہوتی۔ ان کے غم میرے غم تھے۔ ان کی خوشیاں میری خوشیاں، ان کے پیارے میرے پیارے!

اور اب میرا دل یہ سوچ سوچ کر کیسے بیٹھا جا رہا تھا کہ میرے اتنے پیارے بڑے بھیّا پائلٹ بن جانے کی سوچ رہے تھے۔ ہائے ان طیّاروں کا کیا بھروسہ آسمان کی فضا میں چلے جاتے ہیں۔ ذرا کوئی خرابی آئی اور دھم سے زمین پر! کیا میں اپنے پیار کی آخری کرن کو بھی اندھیرے میں ڈوبتا دیکھوں گی؟ اس دن میں نے بڑی بے بسی سے بھیّا سے منّت کی تھی۔ "بڑے بھیّا بخدا کے لئے آپ کوئی اور لائن ڈھونڈیئے۔ یہ آپ کو کیا سوجھی۔ خدا نہ کرے کچھ ہو گیا تو؟ مجھے ان طیّاروں کو دیکھ کر کبھی کوئی اچھا خیال نہیں آتا۔"

بڑے بھیّا ہنس کر پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "نہ جانے کہاں کہاں سے بے سرو پا باتیں سن آتی ہے۔ کس نے تجھ سے کہہ دیا میں پائلٹ بن رہا ہوں۔

میں کہاں، وہ تو وکی سوچ رہا ہے۔"
اور جیسے وہ کچھ رک سے گئے۔
نہ جانے کہاں سے سرسر کرتی آگ کی بڑی بڑی لپٹیں آئیں اور جیسے میرے انگ انگ کو جلا گئیں۔ جھلس گئیں۔
" وکی ——— وکی ——— وکی ———" میں ذرا رکتے رکتے بولی۔
" مگر بھیا آپ انھیں منع کیوں نہیں کرتے؟"
اسی وقت سلمیٰ آپا، ثریا باجی، وقار سب کے سب کمرے میں گھس آئے۔
بڑے بھیا ہنس کر بولے۔
" شنجو! موت تو انسان کو ایک ہی بار آتی ہے اور قسمت کا لکھا ہوا کبھی ٹل نہیں سکتا۔ چاہے آدمی پرواز کرتا ہوا مرے یا زمین پر پڑے پڑے مر جائے۔"
وقار ہنس کر بولا۔
" ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے۔ کیوں یار! یہ پرواز وغیرہ کا کیا چکر چل رہا ہے؟"
بڑے بھیا بڑی سادگی سے بولے۔
" شنجو چاہتی ہے کہ تم پائلٹ نہ بنو۔ جہاز سے گر پڑو گے اور مر جاؤ گے۔"
وقار مجھے ایک نظر دیکھ کر بولا۔
" یہ زمین اور آسمان پر مرنے کا کیا سلسلہ ہے۔ کبھی کبھی تو کسی کو دیکھ کر بھی قضا آجاتی ہے۔"
سلمیٰ آپا نے بھنا کر مجھے گھورا۔
" یہ وہمی ماں کی وہمی لڑکی۔ خواہ مخواہ ہر بات میں برا پہلو ڈھونڈ نکالتی ہے ——!"

میں نے لرز کر انھیں دیکھا۔ آنسوؤں سے میری آنکھیں بھر گئیں۔

"اللہ نہ کرے آپا جو میں کسی کا بُرا چاہوں۔ یہ دل ہی کم بخت عجیب ہے۔" اور میں الٹے پاؤں وہاں سے نکل آئی۔

زندگی میں کبھی ایسی کیفیت نہیں ہوئی تھی۔ دل نے جیسے دھڑکنا چھوڑ دیا تھا۔ رات کو کتنی ہی دیر تک آنکھ نہ لگتی۔ لگتی تو کھل کھل جاتی۔ آنسو اپنے آپ اُمڈے چلے آتے۔ ایک دن میں نے بہت سہم کر سوچا۔

"مجھے وقار سے محبت تو نہیں ہوگئی ہے؟"

محبّت ہوتی کیسے؟ وقار کے اور میرے راستے الگ الگ تھے۔ دن بھر وہ سلمیٰ آپا، باجی ثریا کے ساتھ رہتا۔ جانے کیا کیا ہنگامے ہوتے رہتے۔ کبھی کبھار ہی وہ میرے کمرے کی طرف آتا۔ باتیں بھی بالکل سیدھی سادی ہیروؤں والی قطعی کوئی ادا نہیں۔ نہ اُس نے کبھی میری تصویریں ہی لیں، نہ کبھی سیر کرنے کو کہا۔ نہ کبھی میری تعریف کی، نہ اُلاہنہ دیا۔ اُس کا موضوع ہی باتیں ہوتی تھیں۔

"شبّو! اتنا کام کیوں کرتی ہے تو؟"

"شبّو! دیکھ تیرے کپڑے کتنے گندے ہوگئے ہیں!"

"شبّو! تیرا رنگ تو سانولا ہے لیکن بال کیسے سنہرے ہیں!"

"شبّو! تیری آنکھیں دیکھ کر بجھے ہوئے چراغوں کا خیال کیوں آتا ہے؟"

میرے پاس ان تمام سوالوں کا جواب خاموشی تھی۔ کتنی جلدی اُس نے تکلف کی ساری منزلیں طے کر ڈالیں۔ کس مزے سے میرا آدھا نام لے کر تو کہہ کر پکارتا ہے۔ میں ایک بار ہنس کر بولی۔

"یہ آپ مجھے کس مزے سے تو کہتے ہیں !"

" تو کہنے سے پیار جھلکتا ہے۔ تو مجھے اچھی لگتی ہے۔ تجھ پر پیار آتا ہے۔ بس اسی لئے تو کہتا ہوں۔ ورنہ اب یہ سلمیٰ ہے، ثریا ہے اور خود میری اپنی نکہت ہے۔ ان سب کو کبھی میں تو کہہ کر پکارتا ہوں!؟"

اور یہ بات اُس نے سب کے سامنے بڑی سچائی سے کہی تھی۔ سلمیٰ آپا نے اپنے کالے بالوں کو انگریزی دواؤں سے بھگو بھگو کر سنہرا کر لیا۔ خاموشی جان بوجھ کر اختیار کر لی کہ چہرہ اور آنکھیں غمگین نظر آئیں۔ بھڑک دار کپڑے چھوڑ کر سادہ کپڑوں پر اُتر آئیں۔ لیکن وقار نے کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔ ایک دن بڑی حیرت سے سلمیٰ آپا کو دیکھ کر بولا۔

" یہ اچھی طرح رہتے بستے جوگنوں کا سا بھیس کیوں لے لیا؟ قسم اللہ کی بڑی بونق نظر آنے لگی ہو۔ تم تو بس سجی بنی گڑیا ہی بھلی لگتی ہو۔ سادگی ہر کسی پر تو بھلی نہیں لگتی۔"

میں نے شانے کے پاس سے پھٹے ہوئے اپنے بلاؤز کو آنچل سے ڈھانکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں بڑی بے چارگی سے کہا۔

" وکی پلیز! خدا کے لئے رحم کرو۔ میں جینا چاہتی ہوں!"

اس دن حسب معمول میں ٹیریس پر چراغ جلائے بیٹھی تھی کہ پیچھے سے دبے پاؤں وقار آ گیا۔ میں نے مدھم سی چاپ سُن لی تھی۔ مڑ کر دیکھا۔ چراغ کا اُجالا اس کے چہرے پر محبت کا نور بن کر جگمگا رہا تھا (یا ممکن ہے میں ہی ایسا سمجھی ہوں۔)

"کب تک چراغ جلائے جاؤ گی شجو؟"

وہ ہنس کر بولا۔

"جب تک مجھے منزل نہیں مل جاتی!" میں جُھکے جُھکے ہی بولی۔
"اور اگر جان لو کہ منزل سامنے ہی ہے تو؟"
میں کانپ کر بولی۔
"پھر تو میں ایک چراغ کے بجائے ہزاروں چراغ جلاؤں گی۔ دیوالی مناؤں گی جیسے
پتہ ہے وکی جب رام بن باس پورا کر کے لوٹے تو ہر ہر قدم پر ساتھ چراغ ہی چراغ....."
میرا گلا خشک ہو گیا۔
میں نے بات ادھوری چھوڑ کر اُسے دیکھا۔
"تم کس رام کی سیتا ہو شنجو!؟"
وہ گیلی گیلی آواز سے پوچھ رہا تھا۔
"میں جس کی آس میں عمر بھر سے چراغ جلاتی آ رہی ہوں کہ میرے دُوارے اندھیرا
دیکھ کر وہ واپس نہ لوٹ جائے........."
اُسی لمحہ چراغ زور سے بھڑکا۔
"شاید تیل ختم ہو رہا ہے!"
"پروا نہیں، میں اپنے آنسوؤں سے اس روشنی کی زندگی بچا لوں گی۔"
وکّی نے پھونک مار کر چراغ بُجھا دیا۔
"جب صبح ہو جائے تو روشنی کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور پھر چراغ تو یوں بھی
حاسد مشہور ہے، جلنے والا!"
گھور تاریکی میں مجھے زندگی کے بھرپور اُجالے مِل گئے۔ وقار کے ہاتھوں کا صرف
ایک محبت بھرا لمس...... میرے ازلی دُکھ مٹ گئے۔ راہیں چمکیلی اور روشن
ہو گئیں۔ میں تنہا نہیں۔ ہم دو ہیں! دو ہیں!!' جیسے آپ ہی آپ میرا من گنگنا اٹھا!

اُس شام بڑے بھیّا باہر سے لوٹے تو ہنس کر وقار سے بولے ۔
" لاؤ یار مٹھائی کھلاؤ ۔ تمھاری پوسٹنگ کی خوشی میں !"
میں حیران رہ گئی ۔" پوسٹنگ ؟ کیسی پوسٹنگ ؟ ! ابھی تو کچھ ہوا ہی نہیں ، یہ سروس کیسی ؟"

پھر بھیّا نے بتایا کہ وقار بہت دنوں پہلے ٹریننگ ختم کر چکا ہے ۔ وہ اسی لیئے تو ہمارے پاس آیا ہے کہ اسی شہر میں اُس کی پوسٹنگ کے احکام آنے والے تھے ۔ مکان ملنے تک وہ بھیّا ہی کے ساتھ ٹھہرے گا ۔ میرا دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگا ۔ میرے خدا ! میں اس دل کا کیا کروں ؟ خداوندا ! تو میرے وقار کو میرے لیئے ہمیشہ زندہ رکھنا ۔ ورنہ میں بن موت مر جاؤں گی ۔

ماؤں کو بیٹوں کی نوکریوں اور پھر شادیوں کی کتنی خوشی ہوتی ہے ؟ اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد کی بات ہے ڈاک میں ایک گہرے گلابی رنگ کا لفافہ آیا ۔ پتہ پر وقار کا نام تھا ۔ میں نے لفافہ وقار کے کمرے میں پہنچا دیا ۔ گلابی رنگ کا لفافہ ! بار بار میرے دل میں شب عروسی کے سُرخ اور گلابی چمکیلے جوڑے کا خیال جگمگاتا رہا ۔ اس شام وقار شام کی چائے کے لئے باہر نہیں نکلا ۔ سیر کے لیئے بھی نہیں گیا ۔ مغرب کے وقت وہ اُٹھا اور باہر نکل گیا ۔ میں تیزی سے اس کے کمرے میں پہنچی ۔ ہوا کے ہلکوروں سے گلابی رنگ کا کاغذ کانپ رہا تھا ۔ بداخلاقی اور گناہ جانتے ہوئے بھی میں نے کاغذ اُٹھا لیا ۔

" عزیزم وقار ! تم نہیں سمجھ سکتے ایک ماں کا دل اپنے بیٹے کی کامیابی سے کتنا خوش ہوتا ہے اور یہ خوشی اُس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ایک چھم چھماتی بہو کا تصور بھی ساتھ ہو ۔ بیٹے ! میں اب بہت جلد اس مبارک فرض سے

سبکدوش ہونا چاہتی ہوں۔ اِدھر تم فارن جانے کے بارے میں بھی سوچ رہے ہو اس لئے جہاں تک بنے جلدی یہ کام ہو جائے تو اچھا ہے۔ پیام تو طے ہو چکا ہے بس تمھاری آمد کی دیر ہے۔

ضروری بات یہ کہنی ہے کہ نکہت نے مجھے تمھاری پسندیدگی کے بارے میں سب کچھ لکھ دیا ہے۔ کیا بیٹے تمھیں اپنی خاندانی روایتوں کا احساس نہیں آج تک ہمارے ہاں غیر خاندان سے لڑکی نہیں لائی گئی۔ پھر تم یہ انہونی کیسے کر سکو گے؟ رضا جاوید تمھارا بے حد جگری دوست ہے۔ اس کی بہن یقیناً بہت پیاری اور اچھی ہو گی۔ لیکن ہم روایتوں میں ایسے جکڑے ہوئے ہیں کہ قدم نہیں اٹھا سکتے۔ اپنے ابا کو تم جانتے ہو۔ پٹھان ہیں۔ ذرا سی بات پر جلال میں آجاتے ہیں۔ وہ کبھی تمھاری من مانی نہ ہونے دیں گے۔ اس لئے میرے بچے! اس بات کو وہیں بھول کر آجاؤ۔ ہم تمھارا برا نہ چاہیں گے۔ آخر میں تمھاری ماں ہوں۔ میرا بھی تم پر کچھ حق ہے۔

تم پر ممتا نچھاور کرنے والی

تمھاری ماں

میں ایسے بوجھل قدموں سے جیسے کسی عزیز کی لاش کو دفنا کر آئی ہوں۔ کمرے سے باہر نکل گئی۔

وہ دن گزرا ——

دوسرا دن بھی گزرا ——

زندگی میں کھوئے کھوئے پن کا احساس شدید سے شدید تر ہو گیا۔ اگر واقعی ایسا ہو گیا، میں وقار کی نہ ہو سکی تو کیسے جیوں گی۔

وقار اپنے کمرے میں تھا۔ میں چائے کی ٹرے سنبھالے داخل ہوئی۔ وہ کھڑکی سے پرے جانے کیا کھوج رہا تھا۔ چہرہ جیسے برسوں کا بیمار۔ پیلی زرد رنگت۔ میرے خدا! یہ وقار ہے؟ میں نے رُک رُک کر دھیرے سے کہا ؎

"دو روز ہی میں آپ کا چہرہ اُتر گیا!"

وقار نے بڑی غمگین نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اور پھر تڑپ کر میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"للّٰہ آپ مجھ سے محبّت نہ کیجئے!"

اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

میں وقار سے محبّت نہ کروں تو جیوں کیسے؟ اور پھر محبّت میں کرنے نہ کرنے کا سوال ہی کہاں رہ جاتا ہے۔ وہ تو چاند کی جگمگاتی کرنوں کی طرح میرے جیون میں چلی آئی ہے۔ اس چاندنی کو کیسے دُور کر دوں خدایا؟

میں نے بے بسی سے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

دن ایسے گزرنے لگے جیسے وقت کے پاؤں میں بوجھل پتھر بندھے ہوں گھسٹ گھسٹ کر۔ زندگی اُسی محور پر گھومنے لگی۔ کچن کے چکّر، بچّوں کے اُودھم شور، ہنگامے، شاپنگ، پکنک، سب کا سب جہاں کے تہاں ہوتے ہوئے بھی بدلے پن کا احساس دل کو ڈستا رہتا۔

اُس دن اپنی ڈھٹائی پر میں خود ہی حیرت زدہ رہ گئی۔ میں وقار کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھی۔

"وکی! میں شاہزادی ہو کر بھکارنوں کی طرح تمھارے آگے ہاتھ پھیلا رہی ہوں! کیا میری جھولی یونہی خالی رہ جائے گی؟"

وقار سُن رہ گیا۔

میں اُسی انداز میں بولی۔

"وکّی! میں تمھاری زندگی میں بہار بن کر آنا چاہتی ہوں۔"

اُس دن میں نے بڑے اہتمام سے قوسِ قزح کے رنگوں والی ساڑی پہنی تھی آنکھوں میں کاجل لگا رکھا تھا۔ ہمیشہ بکھرے رہنے والے بالوں کو میں نے ربن سے قید کر لیا تھا۔ وقار نے سر اٹھا کر مجھے بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ پھر بڑے ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

"میں تو خزاں رسیدہ باغ ہوں شبّو! وہاں پہنچتے پہنچتے تو بہار کی حسین پری کے پر جل کر راکھ ہو جائیں گے۔" وہ چہرہ ڈھانپ کر کرب سے بولے۔ "بھول جاؤ بھول جاؤ، خدا کے لئے اس خواب کو بھول جاؤ!"

میں حیرت سے چیخی۔

"وکّی یہ خواب نہیں ہے۔ میری طرف دیکھو۔ میں زندگی کی بھرپور حقیقت ہوں۔ میں تمھاری ہو کر جی رہی ہوں۔ تمھاری ہو کر مرنا چاہتی ہوں۔ وکّی اسے خواب نہ کہو۔ یہ تو زندگی کی بڑی سہانی سچّائی ہے۔ یہ تو محبت ہے وکّی!" —— وقار پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

میں آنسوؤں کے دیپ جلاؤں یا مسکراہٹوں کے پھول بکھیروں، میں کب تک منتظر رہوں؟ اب کون اس رہ گزر پر اپنے قدم رکھے گا؟ دل کے زخم پر کون مرہم کا پھاہا لگائے گا۔ بیڈ ٹی سرہانے پڑی پڑی برف ہو جائے۔ میں روزانہ حساب لکھتے ہوئے، دھوبن کو کپڑے دیتے ہوئے کسی کو خط لکھتے ہوئے یا بار بار سیاہی سے بھرا پین دوات میں ڈبوتی جاؤں کوئی یہ نہ کہے گا۔

"پاگل! قلم تو سیاہی سے تر ہے۔ پھر کیوں ڈبوئے جاتی ہے۔ یہ کیا چکّر ہے؟"
میرے بالوں کا سونا دمک دمک کر راہوں کو جگمگا دے۔ میرے جسم کی چاندی چمک چمک کر اندھیرے میں اُجالے بکھیر دے تو بھی ان راہوں پر چل کر کوئی مجھ تک نہ آئے گا۔

ہائے وہ مسافر کیسا راستہ بھولا ہے کہ شہ نشین پر جلتے ہوئے چراغ بھی اُسے راہ نہیں دِکھا سکتے۔

سب کہتے ہیں وہ ابھی نیا نیا تھا۔ اُس نے بھولے سے اپنا طیّارہ کسی چٹّان سے ٹکرا دیا ہوگا۔ لیکن میں کیسے یقین کر لوں۔ مجھے اُس کی الماری میں سے نکلا ہوا وہ کاغذ کا ننھا سا پرزہ بھولتا ہی نہیں۔" میں ان دنوں عجیب سے دوراہے پر کھڑا ہوں۔ خود کو زندگی میں اتنا لاچار میں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ میں چاہوں تو بغاوت کر سکتا ہوں۔ شنّو کو اپنا سکتا ہوں۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ لیکن امّی کے دل کا خیال آتا ہے۔ نہ انھوں نے شنّو کو دیکھا ہے، نہ اس کے بارے میں میری طرح سوچ سکتی ہیں۔ انھیں بس اپنی بھانجی کا تصوّر عزیز ہے۔ میں شنّو سے شادی کر بھی لوں تو وہ کیا کر لیں گی؟ لیکن ساری عمر میرے سینے میں یہ پھانس کھٹکتی رہے گی کہ میں نے ماں جیسی ہستی کا دل توڑا ہے۔ اور شنّو سے منہ پھیرتا ہوں تو زندگی میں کبھی سکھ سے سانس نہ لے پاؤں گا۔ اتنی معصوم موہنی شکل، جیسے ساری دُنیا کے غم اُسی کے چہرے کا مقدّر ہوں۔ میں یہ ظلم اُس پر ڈھاؤں تو جیوں کیسے؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں خود ہی راستے سے ہٹ جاؤں۔ کم از کم اپنی آنکھوں سے یہ تو نہ دیکھ سکوں گا کہ میں نے کسی دل کو تڑپتا چھوڑ دیا ہے۔ ہاں یہی ٹھیک ہے۔

کاش شنّو ایک بار یہ جان لیتی کہ میں اسی کے لئے جیا، اُسی کے لئے مرا ــــ!"

بہت دنوں بعد ایک اُداس سی سہ پہر کو کال بیل بجی۔ میں نے ڈرائنگ روم میں جاکر دیکھا۔ سفید شرٹ اور سفید پینٹ میں ملبوس ایک غمزدہ سی صورت نے میرا استقبال کیا۔

"آپ کو اُس جان لیوا حادثے کا علم تو ہوگا ہی۔" وہ گھُٹی گھُٹی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "وہ میرا جگری دوست تھا۔ آخری پرواز سے پہلے اس نے یہ امانت مجھے دی تھی کہ کبھی زندگی میں موقع ملے تو آپ تک پہنچا دوں۔"

اس نے منہ پھیر کر آنکھیں صاف کیں۔ اور پھر میرے بے جان، پھیلے ہوئے ہاتھوں میں ایک بوسیدہ سا لفافہ رکھ دیا۔

میں نے کسی غیبی طاقت کے زیرِ اثر وہ لفافہ کھولا۔ ایک تصویر تو میری اپنی اور دوسری خود وگّی کی تھی۔ اُس پر باریک حرفوں میں لکھا ہوا تھا ؂

خاک میں مل جائے گا جب میری ہستی کا نشاں
تازہ ہوگی یادگارِ زلیست اس تصویر سے

کھڑے کھڑے بہت دیر ہوگئی۔ نہ میں ہنس سکی نہ رو سکی۔ نووارد نے بھیگی بھیگی آواز سے پُوچھا۔

"میں نے ہمیشہ وقار کی جیب میں آپ کی تصویر دیکھی۔ میں جان سکتا ہوں کہ مرنے والے سے آپ کا کیا تعلق تھا؟"

زندگی بھر کی کنواری اور مُسکراتی آرزوئیں گُنگُناتی آئیں اور میرے ہونٹوں سے لپٹ پڑیں "میں اُس کی دُلہن تھی ـــــ میں اس کی دُلہن تھی ـــــ دُلہن ـــــ دُلہن ـــــ" مگر آنسوؤں نے میرے گلے میں پھندا ڈال دیا۔ اور میں کچھ نہ کہہ سکی۔

اب میں نے شہ نشین پر چراغ جلانے چھوڑ دیئے ہیں۔ کیوں کہ جس مسافر کو منزل پانی تھی وہ تو راستے سے بھٹک گیا۔ جن دو ساتھیوں کو ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر پیار کی راہیں طے کرنی تھیں۔ وہ بچھڑ چکے ہیں ——— وہ مسافر، وہ ساتھی اس تاروں بھری رہگزر پر قدم رکھتا دُور ——— دُور ——— اور دُور چلا گیا ہے اور میں اندھیروں کو دل میں پالے ہمیشہ گھٹتی رہوں گی۔

"میں اِس بھری پُری دنیا میں تنہا ہوں!"

"میں تنہا ہوں ———!!"

آواز تو دے کوئی

چھن چھن کرتا تانگہ کوٹھی کے شاندار پھاٹک پر آکر رُک گیا۔

"سواریاں اترو الو بھائی۔" تانگے والے نے ہانک لگائی۔ چوکی دار اپنا صافہ سنبھالتا زنان خانے کی طرف لپکا اور اندر منہ ڈال کر چلایا۔" ماما جی، کوئی زنانی سواریاں تانگے پر آئی ہیں ــــ"

تھوڑی ہی دیر میں بڑی سی کوٹھی میں بھگدڑ سی مچ گئی ــــ اے لو، جس کوٹھی میں ہمیشہ لمبی لمبی موٹر گاڑیاں آتی رہتی ہوں یہ نامراد تانگے پر لدکر کون آگیا۔ لڑکیاں بالیاں آنکھوں میں حیرت اور تجسس لئے لان میں نکل آئیں جہاں سے پھاٹک صاف نظر آتا تھا۔

" اللہ جانے کون آیا ہے؟" ماما بڑبڑائی۔ بیگم صاحب تو باہر گئی ہیں۔ نئے لوگ۔ اتاروں کیسے؟"۔

تانگے میں سے ایک سن رسیدہ بی بی اتریں۔ ان کے پیچھے سترہ اٹھارہ سال کی ایک نازک سی لڑکی۔

" او مائی گاڈ!" کوئی لڑکی چلائی ــــ" ایک دم ہم ہی لوگوں کی عمر کی ایک لڑکی بھی ساتھ ہے۔"

چار پانچ لڑکیاں کھسر پھسر کرتی آگے بڑھ آئیں، اتنے بڑے پھاٹک کے سامنے جہاں آنکھیں صرف کاریں ہی دیکھنے کی عادی ہوں تانگہ خاصا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ اور دیکھنے والیوں کو اچھا خاصا تماشا فراہم کر رہا تھا۔ کھسر پھسر اب ہلکی ہلکی ہنسی اور اور فقروں میں بدلنے لگی۔

"امی مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں ہم غلط جگہ تو نہیں آ گئے؟" تانگے والی لڑکی گھبرا کر اپنی ماں سے بولی۔

"ڈرنے کی کونسی بات ہے بٹیا۔ ہم غلط جگہ نہیں آئے۔ میں نے بارہا تصویروں میں یہ کوٹھی دیکھی ہے۔ یہ تمہاری خالہ ہی کی ہے۔ تم ذرا یہیں کھڑی رہو۔ اتنے میں ذرا معلوم کر کے آتی ہوں"

گیراج کے پاس دو تین ڈرائیور بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ذرا آگے بڑھ کر ایک بیحد قبول صورت صحت مند جوان لڑکا نیلے رنگ کی ایک کار کے نیچے اوندھا لیٹا کچھ کھٹر پٹر کئے جا رہا تھا۔ وہ ڈرائیوروں کے پاس جا کر کچھ ٹھٹھکیں۔

"سننا بھیا — کیا یہی خان محمد فیروز کی کوٹھی ہے؟"

ایک ڈرائیور نے آگے بڑھ کر شائستگی سے جواب دیا۔ "جی ہاں یہی خان صاحب کی کوٹھی ہے — آپ کو ان سے کچھ کام ہے؟ ویسے صاحب اور بیگم صاحبہ شاپنگ کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں۔"

اتنے میں وہ لڑکا کار کے نیچے سے برآمد ہو چکا تھا۔ کالک بھرے ہاتھ ایک چھوٹے سے تولئے سے پونچھتے، وہ کچھ حیران سا آگے بڑھ آیا۔

"فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

وہ نرم دلی سے مسکرائیں۔ "اللہ تمہیں خوش رکھے بٹیا۔ بس اتنا ہی یقین کرنا تھا

کہ ہم راستہ تو نہیں بھول گئے۔ ہمیں اسی کوٹھی میں آنا تھا۔" اتنا کہہ وہ جلدی جلدی تانگے کی کیطرف چل دیں ایک چھوٹا سا بکس، ایلومنیم کا ایک توشے دان، ٹونٹی والا ایک لوٹا ایک گلاس، ایک بانس کی ٹوکری ــــ وہ جلدی جلدی سارا سامان اتارتی گئیں۔

"شی! اے بھائی جان ششش!" ایک لڑکی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سرگوشی کے سے انداز میں بلانے لگی۔" ادھر تو آئیے ذرا۔"

امتیاز لڑکیوں کے قریب جا کھڑا ہوا۔

رباب ہنس کر بولی۔" یہ کون سے چڑیا گھر کے جانور ہیں۔" نگہت بناوٹی حیرت سے بولی۔" مجھے نہیں معلوم ــــ اری یہ سیدھے جنگل سے پکڑ کر لائے گئے ہیں۔" پھر تو سدھانے میں بہت دن لگ جائیں گے۔" دلشاد ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔"

تانگہ والا اپنی سیٹ پر چڑھ بیٹھا۔ پیسے گن کر اپنی جیب میں ڈالے اور کوڑا لہراتا ہوا ہوا ہو گیا۔ بس رسیدہ بی بی نے توشے دان بیٹی کو پکڑایا۔ خود بکس اور ٹرم سٹرم سنبھال کر ماما کا منہ دیکھنے لگیں لڑکی نے سر گھما کر پیچھے کھڑی لڑکیوں کو پہلی بار چھچھلتی نظر سے دیکھا۔

" انسان بھی اس قدر حسین ہو سکتے ہیں!" امتیاز حیرت سے بولا۔

یاسمین نے جل کر اُسے دیکھا۔

رباب ذرا تیزی سے بولی۔" بھائی جان! آپ بُک ہو چکے ہیں۔ اب کسی کے حُسن سے آپ کو کیا لینا دینا۔"

" ارے بھائی۔" وہ ہنس کر بولا۔" میں تو اس کی امّی کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ دیکھو تو کس درجہ حسین ہیں۔ نگاہ نہیں ٹھہرتی۔ اصل میں تم لوگوں کے دل میں چور ہے نا حاسد مرغیو؟"۔

" ویسے آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ماں بیٹی کے حسن میں صرف عمر کا ہی فرق ہے۔

بیٹی بالکل ماں کا ہی عکس ہے۔ لیکن اس حسین عکس کا فائدہ!" یاسمین نے ناک چڑھا کر امتیاز کو انگوٹھا دکھایا۔

اتنے میں زور زور سے ہارن بجا اور ایک لمبی سی گاڑی کوٹھی میں داخل ہوئی۔ سب اپنی اپنی جگہ سمٹ گئے، گاڑی کے رکتے ہی باوردی ڈرائیور لپک کر اترا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔ پیچھے کی سیٹ سے پہلے ایک معمولی شکل و صورت کی بھاری بھرکم خاتون اتریں۔ ان کے پیچھے ایک بے حد وجیہہ اور بارعب شخصیت انھیں دیکھتے ہی تانگے والی خاتون لپکیں اور "باجی جان" کہہ کر ان سے لپٹ گئیں۔

"ارے ثریا، تم؟" وہ ذرا بناوٹی خوشی کا اظہار کرتی ہوئی پیچھے ہٹیں۔ "کہو اچھی طرح آگئیں نا؟ ہماری کوٹھی کا پتہ تو ٹھیک طرح مل گیا؟" پھر وہ حیرت سے تکتے بچوں کی طرف مڑیں۔

"ارے بچو ــــ ان سے ملے ــــ یہ تمہاری خالہ ہیں ــــ ہاں سگی خالہ۔ یہ میری سگی چھوٹی بہن ہیں۔ اتفاق کچھ ایسا رہا کہ تم لوگوں نے بڑے ہو کر انھیں دیکھا ہی نہیں اور نہ یہ کبھی ہمارے ہاں آئیں۔ لاکھ خط بلاوے بھیجے مگر کبھی اپنا گھر نہ چھوڑا۔ بس یہ بھلی، ان کا گھر بھلا۔ خود آتیں نہ آتیں، کم از کم اپنی لڑکی کو بھیجا ہوتا، وہ بھی نہ ہوا۔" وہ ایک دم کچھ چونکیں۔ "ارے ثریا، تمہاری بیٹی کہاں ہے؟"

اور یوں جیسے اودی اودی بدلیوں سے سنہرا چاند جھلکے، اس نے اپنا چہرہ ڈرتے شرماتے اٹھایا ــــ لانبی لانبی پلکوں تلے سنہری سنہری بولتی ہوئی آنکھیں اچانک پتہ نہیں کس احساس سے گیلی گیلی ہو گئیں۔ اس نے سہم کر توشے دان نیچے رکھا اور سونے کا ہنجہ کندن ایسی دمکتی پیشانی سے چھوا دیا۔

وہ حیرت سے ایسی سن رہ گئیں کہ سلام کا جواب دینا بھی نہ سوجھا ــــ

اچانک وہ سنبھلیں۔ "ثریا، نام کیا رکھا ہے بیٹی کا؟"۔

"میرے اجڑے کھنڈر سا یہی تو ایک چراغ ہے، باجی جان۔ جب کبھی مجھے زندگی میں شدید اندھیرے کا احساس ہوا میں نے اسے روشنی کا نام دے دیا۔ جب کبھی خزاؤں نے مجھے آنسو بخشے، میں نے اپنی بیٹی کو بہار کہہ کر بلایا۔ جب کبھی مایوسیوں نے مجھ سے حوصلے چھیننے میں نے اپنی بیٹی کو امید کہہ کر پکارا۔ جب کبھی مجھے احساس ہوا کہ زندگی صرف غم ہی غم ہے میں نے اسے مسرت کہہ کر بلایا۔ یہ میرے لئے روشنی بھی ہے، بہار بھی، امید بھی، مسرت بھی۔"

جذبات محبت بن کر ثریا بی بی کے چہرے پر چھا گئے مگر زبان خاموش رہی تو وہ خود اسی سے مخاطب ہو گئیں۔ "لڑکی کیا نام ہے تمہارا۔؟"

لڑکی —

لڑکی —

لڑکی —

آپ جو میری ماں کی سگی بہن ہیں۔ میری سگی خالہ۔ اگر آپ کو میرا نام نہیں بھی معلوم تو بھی آپ مجھے بیٹی کہہ کر تو مخاطب کر ہی سکتی تھیں —— امی اس کوٹھی کی دیواریں بہت اونچی ہیں۔ بہت اونچی، اگر ہم یہاں رہ گئے تو قید ہو کر رہ جائیں گے۔ کبھی ان دیواروں کو پھلانگ نہیں سکیں گے —— "خدا کے لئے یہاں سے چلی نکلئے امی میرا سر چکرا رہا ہے...."

ثریا بی بی ایک غمناک سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔" باجی جان اس کا نام اس کے ابو نے شبنم رکھا تھا"

"بڑا ہی صاف شفاف نام ہے"۔ خاں صاحب نے پہلی بار زبان کھولی۔

امتیاز کو پر شوق نگاہوں سے شبنم کی طرف دیکھتا پا کر بیگم صاحبہ خفگی سے بولیں۔

"صاحب زادے، یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ کیا سارے ڈرائیور اور میکانک مر گئے تھے جو آپ پھر گاڑی کی تیمارداری میں جٹ گئے تھے؟"۔

امتیاز گھبرا کر بولا۔ "وہ — وہ .... جی ...... ممّی ..... دراصل م — م — میں ......"

"یوں ہکلانا چھوڑیئے، نہا دھو کر شریف آدمی بنئے اور یاسمین اور بہنوں کو ساحلِ سمندر پر اپنی گاڑی میں گھما لائیے۔" پھر وہ اپنی پیشِ خدمت کی طرف مڑ کر بولیں۔ "اتا جی کے برابر والا کمرہ ان مہمانوں کے لئے ٹھیک کر دو۔"

جاتے جاتے وہ رکیں۔ "اور سنو ثریا، انسان کو ماحول کا غلام بننا پڑتا ہے۔ تم خود دیکھ لوگی کہ یہاں ہمارے ملنے جلنے والوں کا ایک حلقہ ہے۔ خیال رہے کہ تم ہماری رشتہ دار ہو —" انھوں نے کچھ ٹھٹھک کر شبنم کی طرف نظر ڈالی۔ "تمھاری عمر کی یہاں کئی لڑکیاں ہیں۔ ان کے کپڑے تمھارے ٹھیک آجائیں گے — آیا —" انھوں نے دور کھڑی ایک نوکرانی کو مخاطب کیا۔ "دلشاد کے دو تین پرانے جوڑے نکال کر انھیں دے دو — اور سنو شبنم، نہا دھو کر ذرا سلیقے کی لڑکی بن جاؤ — ویسے تم ہو کافی خوبصورت؟"۔

"بہت بہتر خالہ امّی —" شبنم نے سہم کر جواب دیا۔

"ذرا رکو۔" وہ رعونت سے بولیں۔ "آؤ تمھیں بتا دوں کہ یہاں کون کون ہیں — یہ یاسمین ہے۔" انھوں نے ایک بے حد ماڈرن، بیل باٹم سوٹ پہنے ہوئے لڑکی کی طرف اشارہ کیا جس کے بال لڑکوں کی طرح چھوٹے چھوٹے تھے اور بڑی مشکل سے گردن تک پہنچ پا رہے تھے۔ "یہ صاحب زادہ امتیاز کی ہونے والی دلہن ہے اور یہ ہیں میری تین لڑکیاں — رباب، نکہت اور دلشاد۔ میرا چھوٹا لڑکا اعجاز کانونٹ گیا ہوا ہے۔ پھر ادھر کوٹھی ہیں خان صاحب کی بہن کے بچے ہیں اور بھی دوسرے

غریب رشتے دار ہیں۔ سب سے مل جل کر رہنا ۔۔۔ اور یہ میرے بڑے لڑکے صاحبزادہ امتیاز خاں ہیں۔ دراصل ان ہی کی شادی کی تیاری کے سلسلے میں میں نے ثریا کو اور تمھیں بلایا ہے۔ یوں بھی رباب کا جہیز بھی تیار کرنا ہے اور یاسمین کا چڑھاوا بھی۔ ڈھیر سارے کام ہیں۔ لوگ بھی ڈھیر سارے ہیں لیکن مجھے یاد تھا کہ بچپن میں ثریا بے حد نفیس سلائی کڑھائی کرتی تھی مجھے یقین تھا کہ اس نے تمھیں بھی اپنے ہی نقشِ قدم پر چلایا ہو گا ۔۔۔" یہاں انہوں نے رک کر ذرا مسکرا کر ثریا بی بی کو دیکھا جو تصویرِ حیرت بنی بہن کی باتیں سُن رہی تھیں۔

"بھلا بازاروں میں بھی کہیں گوٹے کناری کار چوب اور سلمے ستارے کے نفیس، کام ہو سکتے ہیں؟ خدا نے ہر عیش دیا، ہر خوشی دی، بس اب ایک خوشی کی اور تمنا ہے صاحبزادے کا چڑھاوا ایسا ہو کہ سارے شہر والے منہ دیکھتے رہ جائیں۔"

شبنم نے اپنی دھواں دھواں نگاہیں اٹھا کر انھیں دیکھا اور دھیمے سے بولی۔

"خالہ امی اطمینان رکھئے۔ اللہ نے چاہا تو آپ کی یہ خوشی بھی پوری ہو کر رہے گی۔"

دلشاد کے پرانے جوڑے وہیں ٹیبل پر رکھے رہے۔ شبنم نے نہا کر اپنے ہی پاس کے کپڑے پہن لئے تھے۔ ہلکے سنہری رنگ کا چوڑی دار پاجامہ، ڈھیلا کرتا اور اسی رنگ کا ململ کا دوپٹہ۔ بالوں کا شہد کے رنگ والے بالوں کا ایک ڈھیر اس کی پیٹھ پر جھول رہا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور وہ چہرہ کھٹ کی پٹی سے لگی ہتھیلی میں چہرے کا چاند لئے یوں اداس بیٹھی تھی کہ کٹھور سے کٹھور دل بھی اسے اس حال میں دیکھتا تو کانپ اٹھتا۔

"امی اپنی شدید غریبی اور بیوگی کے باوجود مارے غیرت کے اپنے سگوں سے دور رہنے کا فیصلہ کتنا اچھا تھا! مگر امی ۔۔۔ خالہ امی کے اچانک بلا دینے پر آپ کیسے کیسے خوش ہوئی تھیں؟ آپ خوشی سے بے حال ہو ہو کر کہہ رہی تھیں۔ شبو بیٹی دیکھا! خون

آخر خون ہی ہوتا ہے؟ مدتوں بعد غریب بہن کا خیال آ ہی گیا۔ کس طرح جتن سے لکھا ہے۔ ثریا تمہیں کسی بھی حال میں آنا ہی پڑے گا۔ اگر تم نہیں آؤ گی تو میں اپنے بیٹے کی شادی کا ہنگامہ کھڑا ہی نہیں کروں گی۔ دیکھو اس طرح شدید اصرار سے کبھی کسی نے بلایا ہوگا؟ بیٹی لو اب تو ماضی کی سب یادیں دفن ہی کر دیں اور چلے چلیں میں کیسے کیسے کہتی تھی کہ امی اپنی کٹیا بھلی۔ کسی کے محلے دو محلے جا کر کیا لینا ہے۔ مگر آپ تو یوں خوش تھیں جیسے جنت مل گئی ہو؟ اپنی کٹیا میں جیسے بھی تھے اپنے مالک تھے۔ یہاں تو آتے ہی نوکروں کا رتبہ مل گیا —— امی، امی! غریبی نے زندگی بھر سب سے دور رکھا تھا۔ آج بھی رہتے مگر......؟"

اُس نے یہ سب کہنا چاہا لیکن مظلوم اور دکھیا ماں کے چہرے کو دیکھ کر حوصلہ نہ ہوا۔ وہ آپ کڑھی جا رہی تھیں۔ قدرت کا ہے کا انتقام لے رہی ہے؟ زندگی میں ایک بھی دن سکون اور آرام کا نصیب ہوا تھا جو اب حالات نے یہ ایک اور نئی کروٹ لے لی۔؟

جا نماز پر بیٹھی اس کی امی خدا کے حضور گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہی تھیں۔

"خدایا میں نے اپنی زندگی میں اپنی بیٹی کی خوشیوں کے سوا کسی چیز کی چاہت نہیں کی ——"

"مالک اُسے سدا خوش رکھنا....."

بڑی سی ڈائیننگ ٹیبل کے گرد پورا خاندان بیٹھا ہوا تھا۔ ابھی بیروں نے سروس شروع نہیں کی تھی۔ اچانک امتیاز بول اٹھا۔

"ممی —— خالہ جان ....."

ممی نے خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔ "صاحب زادے ہوش میں رہئے،"

رشتے اپنی حیثیت کے لوگوں کے لگائے جاتے ہیں۔ ہر نتھو خیرے کے نہیں۔"

"لیکن ممی، وہ آپ کی سگی بہن تھیں اور پھر ...."

"صاحب زادے ___ کھانا شروع کیجئے۔"

"بیرا ___ کم ہیر۔" صاحب زادہ امتیاز خاں نے بیرے کو قریب بلایا۔ ڈش میں سے خود ہی بہت سا مرغ کا قورمہ انڈیلا ___ پھر شیرمالوں سے بھرا طشت اٹھا کر چھپاک سے کمرے سے باہر نکل گئے۔ لڑکیاں ڈر کے مارے وہیں سہم کر دبک گئیں۔

"کھانے دوا سے اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھ کر ___ لڑکیو شروع کرو۔"

لیکن صاحب زادے امتیاز خاں اپنے کمرے میں نہیں گئے۔ کھانا لے کر سیدھے وہ مہمانوں کے کمرے میں پہنچ گئے۔

شبنم انہیں اس طرح آتا دیکھ کر رونا رلانا بھول کر ہکا بکا سی کھڑی رہ گئی۔

"صاحب زادے ___ آپ ___" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

"شٹ اپ۔" وہ چلّایا۔ "میرا نام امتیاز ہے۔"

اچانک وہ اپنے لہجے پر شرمسار ہو اُٹھا۔ دھیرے سے وہ ثریا بی بی کے پاس بیٹھ گیا۔ "خالہ جان مجھے سخت افسوس ہے۔"

آنسو پونچھ کر وہ مسکرا کر بولیں۔ "افسوس کاہے کا بیٹا، ایسی تو کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔"

وہ سر جھکائے مناسب الفاظ تلاش کرنے لگا۔

"خالہ جان! وہ سر کھجاتے ہوئے اٹک اٹک کر بولنے لگا۔ میں نے زندگی میں کوئی غم نہیں دیکھا تھا۔ دل میں کوئی کسک محسوس نہیں کی تھی۔" وہ بات روک کر شبنم کی طرف دکھ بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ "لیکن ان چند گھنٹوں میں جب سے آپ دونوں آئی ہیں، میرا دل ___ اندر سے بکھرا بکھرا ٹوٹا ٹوٹا سا ہو گیا ہے۔ خالہ جان مجھے ایسا

لگ رہا ہے جیسے میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

ثریا بی بی نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔" ایسی بُری بُری باتیں منہ سے نہیں نکالتے بیٹا۔ پاگل ہوں تمھارے دشمن۔" وہ آنسوؤں سے بھری آواز میں بولیں۔

" بیٹا جتنی پیاری صورت خدا نے تمھیں دی ہے اس سے کہیں زیادہ پیاری اور حسین تمھاری سیرت بھی ہے۔"

وہ کچھ شرماتا ہوا اٹھا اور شبنم کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔" چلو ہم سب کھانا کھالیں۔ آئیے خالہ جان۔"

" نہیں، نہیں۔" شبنم ڈر کر بولی۔

" صاحب زادے، آپ ہم لوگوں کے ساتھ کھانا نہ کھائیے، خالہ امی ناراض ہوں گی۔ آپ کو ان سب کے ساتھ کھانا چاہئے۔"

وہ تیزی سے اپنی خالہ کی طرف مڑا۔" خالہ جان! اس لڑکی کو سمجھا دیجئے کہ مجھے صاحب زادہ نہ کہا کرے۔ میرا نام امتیاز ہے۔"

" نام بدل جانے سے آسمان زمین نہیں ہو جایا کرتا ـــــ آپ آسمان ہیں، آسمان ہی رہیں گے۔ وسیع اور بلند۔" شبنم دھیرے سے بولی۔" زمین کو اتنا بلند نہ کیجیے۔"

" لیکن آسمان کو بلندیاں عطا کس نے کی ہیں؟ زمین کی پستیوں نے ہی نا۔"؟

کھانا کھلانے کے بعد جب امتیاز کمرے سے چلا گیا تو شبنم سوچنے لگی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب کوئی دل کو بہت اچھا لگنے لگتا ہے تو جس جگہ زمین پر وہ پاؤں دھرتا ہے اس جگہ سجدے کرنے کو بے اختیار جی چاہنے لگتا ہے۔!

دوسری صبح بڑی سہانی تھی۔ گزرے ہوئے دن کی ہلکی سی کسک بھی کسی دل میں باقی نہیں رہ گئی تھی۔ شبنم منہ ہاتھ دھو کر اپنے کمرے میں یونہی بیٹھی ہوئی تھی کہ ایک

نوکرانی نے آکر اطلاع دی کہ "بیگم صاحبہ یاد فرما رہی ہیں۔"

ماں بیٹی لونگ روم میں پہنچیں تو دیکھا ساری لڑکیاں پہلے سے ہی وہاں موجود ہیں۔ بیگم صاحبہ کے سامنے رنگ برنگی ساڑیوں، سلمے، ستارے، گوٹے کناری، چمکیوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ انھوں نے دونوں کو دیکھتے ہی نیچے اشارہ کیا۔

"بیٹھو۔ بیٹھو۔"

دونوں صوفوں سے نیچے زمین پر بچھے قالین پر بیٹھ گئیں۔

"ثریا ــــ" انھوں نے بہن کو مخاطب کیا۔ "یہ کچھ ساڑیاں ہیں۔" انھوں نے ایک بڑے سے ڈھیر کو "کچھ" کہتے ہوئے اشارہ کیا۔ اس پر ماہی حال بنانا ہے سلمے سے۔ اس پر گوٹے کی ٹپا پٹی بنانی ہے۔ اس پر کامدانی بنانی ہے، بادلہ یہ رہا۔ اس سُرخ ساڑی پر سیاہ چمکیوں سے بیل بنانی ہے اس ہری ساڑی پر......"

شبنم نے گھبرا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ پھر خالہ کو۔ پھر بڑی ڈری ہوئی نیچی آواز میں بولی۔

"خالہ امّی! یہ سب میں بنالوں گی۔ امّی کی آنکھیں ذرا کمزور ہیں ان سے نہ بن پائیگا۔"

"اے لڑکی کام ہی کون سا بڑا سا ہے۔ صرف چودہ ہی تو ساڑیاں ہیں، ابھی غرارے، پاجامے، شرارے تو میں نے نکالے ہی نہیں۔"

پتہ نہیں اسی دم کس کام سے امتیاز وہیں لونگ روم میں آگیا۔ پہلے تو وہ یہ دیکھ کر ہی حیران رہ گیا کہ سب لوگ صوفوں پر بیٹھے ہیں اور صرف یہ دونوں ماں بیٹی نیچے بیٹھی ہیں ــــ پھر تھوڑی دیر رُک کر جب اُسے پتہ چلا کہ ممّی کیا چکّر چلا رہی ہیں تو وہ خفگی سے بولا۔ "ممّی شہر میں کارچوبی کام کی ایک نہیں ہزار دوکانیں ہوں گی پھر دماغ سوزی کا یہ کام آپ ان بے چاریوں کو کیوں دیئے دے رہی ہیں؟"

"صاحبزادے!" وہ غصّہ سے بولیں۔ "میں معلوم کر آئی ہوں۔ بازار میں ایک ایک ساڑی کی کام بنوائی پانچ پانچ سو روپے ہے۔ اب اتنی ساڑیوں کے دام لگایئے — ہزاروں روپے تو یونہی اٹھ جائیں گے۔ کیا حرج ہے اگر گھر کا پیسہ گھر ہی میں رہے"۔
"تو کیا آپ ان دونوں کو مزدوری دینا پسند کریں گی" وہ جلے بھنے لہجہ میں بولا۔
"مزدوری! آپ کو شرم نہیں آتی؟ کیا میں اپنی سگی بہن اور بھانجی کو مزدوری دوں گی؟"
"بہت اچھے ممی — بہت اچھے! آنکھیں پھوڑ کام بھی لیں گی اور سگا رشتہ جتا کر پیسے بھی نہیں دیں گی! تو پھر آپ یہ اتنی ساری نکمّی لڑکیوں سے جو کھا کھا کر صرف موٹی ہو رہی ہیں، کام کیوں نہیں لیتیں"۔
ثریا بی بی دہل کر کھڑی ہو گئیں۔ "بیٹے کمال کر رہے ہو۔ بیٹھے بیٹھے اتنا سا کام کر دیا تو اس کے لئے اتنے ہنگامے کی کیا ضرورت ہے؟ عورتوں کے لئے تو یہ کام ہیں ہی — اٹھاؤ بیٹی شبنم یہ سارا سامان اپنے کمرے میں لئے چلتے ہیں۔ چند ہی دن کی تو بات ہے یہ ساری کڑھائی سلائی"۔
بیگم صاحبہ کا غصّہ تو اپنی جگہ رہا — لڑکیاں ناگنوں کی طرح الگ دھواں پھوں دھواں پھوں کر رہی تھیں۔
"او گاڈ — حد ہو گئی — یعنی کل کی آئی ہوئی ایک حقیر سی لڑکی اتنی پیاری ہو گئی کہ سب کے سامنے ممی کے منہ آنے لگے"۔
"اور وہ تو ٹھیک ہے کہ مجھ سے انگیج منٹ ہو چکی ہے جناب کی۔ ورنہ بس چلتا تو وہ اس چڑیل سے شاید شادی بھی کر لیتے" یاسمین جل کر بولی۔
"اور کیا بھابی" لڑکیاں جو شادی سے پہلے مارے شوق کے یاسمین کو بھابی

کہنے لگی تھیں۔ اس کی ہاں میں ہاں ملا کر بولیں۔ "یہ بھائی جان تو ایسے ہیں کہ انھیں ڈانٹ کر بھی رکھا کیجئے گا ـــــ ہاں۔"

جب سارا سامان ـــــ ساڑیاں، گوٹا کناری، چمکیاں، زری بادلے کے تارے، سلمہ ستارے لے کر دونوں ماں بیٹی اپنے کمرے میں چلی گئیں تو بیگم صاحبہ نے امتیاز کو تیز نظروں سے گھورا۔

صاحب زادے پاؤں کی جوتی پاؤں ہی میں بھلی لگتی ہے۔ اتنا خیال رہے۔"

"لیکن ممّی ـــــ یہ تو حد ہے، آپ کو خود سوچنا چاہئے کہ خالہ جان کتنی کمزور سی ہیں۔ اتنا بار ان کی آنکھوں پر پڑے گا تو وہ تو دو ہی دن میں اندھی ہو کر رہ جائیں گی۔ آخر وہ آپ کی سگی بہن ہیں ممّی ـــــ ایسا ہی ظلم کرنا تھا تو انھیں بلایا ہی کیوں۔"

"میں نے تو انھیں یوں بلایا ہے کہ جن کی ساری زندگی ہی غم کھاتے آنسو پیتے اور غریبی میں گذری ہو۔ انھیں چند روز تو زندگی کا سکھ مل جائے، اچھا کھانا کیا ہوتا ہے۔ اچھے کپڑے جسم کو کیسے محسوس ہوتے ہیں۔ کار میں بیٹھنے سے کیسی خوشی ملتی ہے۔ بڑی سی کوٹھی کی کھلی ہوائیں کیسے دل کو بشاشش کر دیتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ اگر بیٹھے بیٹھے دو ہاتھ بھی ہلا دیئے تو کیا برا ہے۔" اچانک وہ بگڑ اٹھیں۔ "صاحبزادے! یہ ٹھیک ہے کہ آپ کے سینے میں ایک درد مند دل ہے۔ لیکن بار بار ان لوگوں کی پشت پناہی کرنے سے یاسمین اور اس کے ممّی پپا خفا بھی ہو سکتے ہیں، اتنا یاد رہے۔"

امتیاز نے ترس بھری نظروں سے ماں کو دیکھا۔ "ممّی دولت کی زیادتی نے آپ کے دل کی ساری نرمی چھین لی ہے۔" وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

حسب معمول رات کو اپنے کمرے سے ملے ہوئے باغیچے میں چہل قدمی کر کے

جب امتیاز لوٹنے لگا تو چلتے چلتے اس نے یوں ہی خالہ جان کے کمرے میں جھانک لیا۔ اتنی رات گئے بھی دونوں ساڑیوں کی سجاوٹ میں لگی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر تو وہ یوں ہی کھڑکی کے پاس کھڑا رہا پھر ایک دم کمرے میں چلا آیا۔

" خالہ جان میں شبنم کو ذرا کوٹھی گھمالاؤں ؟"

" لے جاؤ بیٹا ـــــ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے ۔"

امتیاز نے لپک کر شبنم کا ہاتھ پکڑا اور اسے تقریباً کھینچتا ہوا ٹیرس پر لے آیا۔

" اب مجھے بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئی ہو ؟" وہ دانت پیس کر بولا ۔

" صاحب زادے ـــــ" وہ نرمی سے بولی ۔ " آپ مجھے کوٹھی گھمانے لائے تھے شاید ۔"

" کوٹھی جائے جہنم میں ۔ میں کہتا ہوں تم یہاں سے چلی کیوں نہیں جاتیں ۔"

شبنم نے سر اٹھا کر بڑی نرمی سے پوچھا ۔" گھر آئے مہمانوں سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے ، صاحبزادے ۔"؟

ایک دم وہ بھڑک اٹھا ۔" میں کہتا ہوں تم یہ صاحبزادے کا خطاب کب واپس لوگی ۔"؟

" آپ بڑے ظالم انسان ہیں ۔" وہ دکھ سے بولی ۔

" میں ـــــ؟ ظالم ـــــ ؟" وہ حیرت سے بولا ۔

" جی ، اور کون ؟ سب کے تلخ سلوک پر ہمدردی کا مرہم ایک آپ کی محبت نے رکھا ہے ۔ اگر میں آپ سے بے تکلف ہو جاؤں ۔ اگر میں کوٹھی کی دوسری لڑکیوں کی طرح رشتہ لگا کر بات کروں تو خالہ امی کے دل میں میرے لئے جو تھوڑا بہت نرم گوشہ ہے وہ بھی سخت ہو کر رہ جائے گا ۔ کیا آپ کو یہ اچھا نہیں لگ رہا ہے کہ میں نوکر کے روپ میں ہی ، لیکن آپ کی توجہ کی حق دار تو ہوں ۔"

ایک دم ساری بات امتیاز کی سمجھ میں آگئی۔ وہ بے بسی سے بولا۔ "ٹھیک ہے شبّو ٹھیک ہے۔ میں تمہارے لئے صاحبزادہ ہی رہوں گا ــــ مگر خدا کے لئے مجھے غلط نہ سمجھنا شبّو، شبّو!

شبنم نے بس آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا ہی تو تھا ــــ شبّو! ــــ آپ کو پتہ ہے پورے ناموں کو چھوٹا اور ادھورا اور بگاڑ کر کہنے کا حق کس کو ہوتا ہے؟ صرف ایک ہستی کو! صرف ایک ہستی کو ــــ تو کیا آپ میرے لئے وہی درجہ پا گئے ہیں؟ ــــ اس نے ایک دم گھبرا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

"دیکھو شبّو۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ٹیرس کی منڈیر کے قریب لاتے ہوئے بولا۔ "یہاں سے تمھیں وہ موٹروں کی قطار سی نظر آ رہی ہے نا؟ ان کاروں میں ایک پپا کی ہے، ایک ممّی کی، ایک لڑکیوں کی، ایک مہمانوں کی (جس میں شاید تم کبھی نہ بٹھائی جاؤ گی)، ایک ــــ" وہ کچھ رکتے رکتے بولا۔ "میری۔ پھر یہ جو خوب بڑی ساری کوٹھی یہاں سے وہاں تک پھیلی پڑی ہے، اس میں بے شمار کمرے ہیں۔ کئی ڈرائنگ روم ہیں۔ کئی مہمان خانے یعنی گیسٹ روم ہیں۔ ان سب کمروں میں سجاوٹ کا ایسا قیمتی سامان ہے کہ سب کی قیمت جوڑنے بیٹھو تو جوڑ بھی نہ پاؤ۔ سامنے کھلے کھلے ہرے بھرے لان ہیں، پچھواڑے باغ ہیں جن میں موسم کا ہر پھول اور پھل اپنی بہار لٹاتا ہے۔ اور پھر اسی کوٹھی میں اس کوٹھی کے مکین بھی ہیں جن کے سینوں میں گوشت پوست کے دل نہیں پتھروں کے ٹکڑے ہیں۔ تمھیں ان ہی پتھروں کے بیچ میں رہنا ہے۔"

وہ کہے جا رہا تھا، وہ سنے جا رہی تھی۔ اچانک وہ رُکا۔

"میں ایک بات کہوں۔"

وہ بولی کچھ نہیں، بس سر اٹھا کر اُسے دیکھے گئی۔

"جب سے تم آئی ہونا ــــ میرا جی چاہ رہا ہے تمہیں اٹھا کر اپنے دل میں چھپاؤں۔"

"نہیں!" وہ گھبرا کر تقریباً چیخ اٹھی اور پاس پڑی ہوئی سنگ مرمر کی سفید سی بنچ پر گر سی پڑی۔

"کیا حقیقت کا اظہار جرم ہے شبّو؟" وہ بے بسی سے بولا۔

"آپ پاگل ہو گئے ہیں ــــ" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "آپ کو شاید یہ پتہ نہ ہو جوتی کتنی قیمتی کیوں نہ ہو اس میں ہیرے ہی کیوں نہ جڑے ہوں بہرحال وہ پہنی تو پاؤں میں ہی جاتی ہے۔"

وہ اچانک اس کے پیروں میں بیٹھ گیا، لیکن بعض پاؤں اتنے مقدس ہوتے ہیں شبّو کہ انھیں سجدہ بھی کیا جا سکتا ہے۔" اور وہ پاگلوں کی طرح اس کے پیروں پر اپنا چہرہ رگڑنے لگا۔

"خدا کے لئے مجھے یوں گناہ گار اور شرمسار نہ کیجئے۔" وہ اپنے پاؤں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "آپ کو پتہ نہیں آپ کیا کر رہے ہیں۔ خدا کے لئے ہوش میں آئیے۔ یوں پاگل نہ بنئے۔"

"تمہارے قرب کی تمنّا پاگل پن اور دیوانگی ہے تو خدا کرے میں سچ مچ پاگل ہو جاؤں"

شبنم کے پاکیزہ اور جھلمل قطرے اس کی سنہری آنکھوں سے ٹپکنے لگے۔

"دنیا کے ایک سرے پر کھڑی ہو کر تم مجھے آواز تو دے کر دیکھو میری جان!"

دوسرے دن کی صبح کوٹھی میں ایک نیا، شاندار ہنگامہ لائی۔

خان محمد فیروز اپنے بڑے صاحبزادے امتیاز خاں کی شادی سے پہلے سارا کاروبار اور جائداد اس کے نام کر دینا چاہتے تھے تاکہ وہ ہر ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں اور صاحب زادے خود کو ذمہ دار محسوس کر کے اتنا وسیع کاروبار سنبھال سکیں۔

اس کارروائی کے لئے باقاعدہ ایک زوردار فنکشن اناؤنس کیا گیا۔ ویسے دیکھا جائے تو بات صرف کاغذات کی منتقلی کی تھی۔ لیکن بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ ایسی شاندار پارٹی دی گئی کہ جس نے بھی دیکھا بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ لان کے پودوں میں جتنے پھول پتے تھے۔ اتنے ہی جگمگاتے قمقمے ہوں گے۔ یہاں سے وہاں تک سبز مخمل سے لان پر بڑی بڑی میزیں لگا دی گئیں۔ اجلی سفید وردیوں میں مؤدب اور مستعد بیرے ٹرے لئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ شہر کے بڑے بڑے رئیس لوگ بڑی لمبی لمبی چکنی چکنی مچھلیوں کی طرح پھسلتی گاڑیوں میں تشریف لا رہے تھے۔ ساتھ میں ان کی بیگمات ایک دوسری کو شکست دینے کا تہیہ کئے جگمگاتی پوشاکیں اور آنکھوں کی بینائی چھین لینے والے زیورات پہن پہن کر گویا رقص کرتی بل کھاتی چلی آرہی تھیں۔

یہ تو باہر کی جگمگاہٹ تھی۔ اندر کوٹھی میں رنگ ہی اور تھا۔ یہ ایک ایسا گھرانہ تھا، جہاں کی خواتین مشرقیت سے مغربیت کی طرف للچا کر بڑھی تھیں۔ جہاں پرانے پن کی ذرا سی بھی جھلک یا چھاپ ذلت میں شمار کی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہر فرد خود کو ماڈرن تہذیب کا نمونہ بنا کر پیش کرنے پر تلا ہوا تھا۔ البتہ بے چاری غریب رشتہ دار بیبیاں جن کا رتبہ بس نوکروں سے ذرا ہی اوپر ہوتا ہے، ابھی بھی اپنے اسی پرانے رنگ ڈھنگ میں نظر آتی تھیں۔ ایسے ہی موقعوں پر یہ بیبیاں پاندان کے حوالے کر دی جاتی تھیں کہ آج کل کی مغرب زدہ تہذیب میں پانوں کا بھی ایک زبردست فیشن چل نکلا ہے۔ اور پر تکلف ڈنر اور کافی کے بعد جہاں کشتیوں میں چیونگ گم، چوکلیٹ اور سوئٹس پیش کی جاتی ہیں، وہیں پانوں کو بھی بڑی اہمیت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

ایک سے ایک بھڑک دار اور شاندار پوشاک، نئے نئے ڈیزائن کے بیل باٹم،

چوڑی دار تنگ مہریوں کی شلواریں، رنگین پتلونیں، غرارے ساڑیاں جسے دیکھو نئی وضع قطع میں۔ لڑکیاں آپس میں کھتی پھر رہی تھیں۔

"بھائی جان کو آفس سونپنے کی پارٹی اتنی زوردار ہے تو ارے گڈ! ذرا سوچو خود ان کی شادی کیا غضب ڈھائے گی۔"

"اوہ نو — میں نہیں سوچ سکتی۔"

"یاسمین از سو لکی۔"

"سچ یاسمین کس قدر خوش نصیب ہے۔ اتنا ہینڈسم، اتنا رچ — اتنا لونگ ہسبینڈ ملا۔"

"بٹیا — ثریا بیگم جو پان بنانے پر مامور تھیں۔ کسی لڑکی سے ملائمیت سے پوچھنے لگیں۔ "یاسمین بٹیا کیا ہمیشہ یہیں رہتی ہیں؟"۔

وہ شاید کوٹھی کی لڑکیوں میں سے کسی کی سہیلی تھی، حیرت سے بولی۔ "آپ کو پتہ نہیں؟ وہ اکثر یہاں آیا جایا کرتی ہے۔ شادی سے پہلے پتہ چل جائے شوہر کیسا ہے۔ کن خیالات کا ہے۔ سسرال والے کیسے ہیں — تو اس طرح زندگی گزارنا بعد میں آسان ہو جاتا ہے۔"

ثریا بیگم حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

پتہ نہیں کہاں سے امتیاز آنکلا تھا۔ طنز سے بولا۔ "امی طرح ہمیں بھی پتہ چل گیا ہے کہ یاسمین کیسے رہتی ہیں۔ دن بھر میں پانچ چھ جوڑے کیوں بدلتی ہیں۔ سہیلیوں کے بغیر ان کی زندگی کیسے بورنگ گزرتی ہے۔ کچن کیوں انھیں کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ پارٹیوں کے ہنگامے کیوں ان کی زندگی بنے ہوئے ہیں — ارے خالہ جان، آپ کو پتہ نہیں شادی سے پہلے چند دن کا ساتھ مل جانا کیسی نعمت ہے۔ ساری پول

کھل کر رہ جاتی ہے۔"

ثریا بیگم نے گھبرا کر انھیں دیکھا۔ "بیٹیا باہر مہمان آ رہے ہوں گے۔ تم یہاں کیا کرنے آ گئے؟ جاؤ، باہر جاؤ۔"

"خالہ جان میں یونہی بس پان کھانے آ گیا تھا۔" وہ ہنسا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک دم اس کی نظر بس جہاں اٹھی تھی وہیں رک گئی۔

حسن کے سارے انداز آج جیسے شبنم پر ختم تھے۔ سفید معمولی جارجٹ کی یہی کوئی پندرہ بیس روپے میں ملنے والی سستے قسم کی ساڑی، سفید ہی کہنیوں تک آستین کا بلاوز ــــ نہ آنکھوں میں کاجل، نہ ناک میں لونگ میک اپ سے بے نیاز چہرہ، شاید نہا کر اٹھی تھی کہ شہد رنگ بالوں نے اس کے حسین چہرے کے گرد ایک جال سا بُن دیا تھا۔ سنہری آنکھوں سے کیسی جوت پھوٹی پڑتی تھی کہ اس کا سارا چہرہ دمک اٹھتا تھا۔ ہر میک اپ اس کے سامنے ہیچ تھا۔

ثریا بیگم نے دہل کر یہ منظر دیکھا۔ ہوش و حواس سے بیگانہ بھانجے کو دیکھ کر وہ ذرا زور سے بولیں۔ "شبنم ــــ کہاں چلی گئی تھیں، بٹیا؟ ابھی کتنے بیڑے موڑنے ہیں۔ دیکھو تو۔"

امتیاز نے گھبرا کر چونک کر اپنی نگاہیں شبنم پر سے ہٹائیں۔ ثریا بی بی کتھے کی پیالی ہاتھ میں اٹھا کر اس میں چمچی گھولنے لگیں۔ وہ دھیرے سے ان کے پاس آ کر جھک گیا۔

"خالہ جان، پتہ نہیں کیا بات ہے، اب ساری دنیا میں اگر کہیں سکون ملتا ہے تو بس آپ کے پاس۔!" اور وہ شرارت سے شبنم کو دیکھ کر مسکرایا۔

ثریا بی بی کوئی بچہ تو نہیں تھیں۔ مارے گھبراہٹ کے ان کے ہاتھ سے کتھے کی پیالی چھوٹ پڑی۔

اگر...... اگر...... انھوں نے ڈرتے ڈرتے سوچا۔ "اگر شبنم کو بھی اسی طرح پلیٹر پر ہاتھا ٹکانے میں سکون ملا تو ـــــ ؟"۔ "نہیں نہیں" وہ دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگنے لگیں۔ "میری بیٹی کو اتنا بڑا داغ نہ دینا خدایا! نہیں ـــ نہیں"۔ اور ان کی آنکھوں سے بن بات کے موتی ٹوٹنے لگے۔

اُسی دم بہت سارے بچّے شور مچاتے ادھر ہی آ نکلے۔

"خالہ جان! پلیز ایک پان۔"

"شبنم باجی، ایک پان ـــ پلیز۔"

شبنم نے پان ہاتھ میں لے کر ہاتھ بڑھایا تو اعجاز نے اس کا ہاتھ ہی منہ میں بھر لیا۔ شبنم ہنسی۔

امتیاز حسرت سے بولا "یار اجو! تم چھوٹے ہو۔ جو چاہو کر سکتے ہو۔"

اعجاز ہنس کر بولا۔ "آپ کو پتہ ہے بھائی جان! شبنم باجی کتنی سوئیٹ ہیں؟ کتنے سارے کام انھیں آتے ہیں۔ اتنے کم دنوں ہی میں نے انھیں ہر کام کرتے دیکھا ہے کچن میں کل کھانا پکا رہی تھیں۔ رات کو ساڑیوں پر کام بنا رہی تھیں۔ صبح کو باغ میں پودوں کی کاٹ چھانٹ کر رہی تھیں۔ اور اب اتنے مزے مزے کے پان بنا رہی ہیں ـــ سچ، رباب باجی کے تو ٹھاٹ ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"رباب کے؟ امتیاز تعجب سے بولا۔" رباب سے شبنم کا کیا واسطہ۔؟"

" اعجاز ہنسا۔" ارے بھائی جان آپ کو نہیں معلوم؟ ممّی کل کہہ رہی تھیں کہ انھوں نے شبنم باجی کو اسی لئے بلایا ہے کہ رباب باجی کی جب شادی ہو گی اور وہ سسرال جائیں گی تو کام کاج اور گھر کی دیکھ بھال کے لئے ہمیشہ کے لئے شبنم باجی کو ان کے ساتھ کر دیں گی۔" ایک دم وہ مڑا۔ "پلیز شبّو باجی، آپ نہیں جایئے نا! بس یہیں رہیئے

ہم لوگوں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے۔"

لیکن امتیاز کچھ نہیں سن رہا تھا۔ وہ کھڑے کھڑے ایک بے نام سی آگ میں جلا جا رہا تھا ۔۔۔ " پیش خدمت! ہونہہ! تو اب پتہ چلا کہ برسوں بعد بچھڑی بہن اور بھانجی اس لئے یاد آئے تھے کہ بیٹی کے جہیز میں ایک پیش بندھی کی ضرورت تھی۔ جو بن داموں مل جائے اور ساری زندگی لونڈیوں کی طرح خدمت میں بغیر معاوضہ بندھی رہے۔

ثریا بیگم اور شبنم حیرت سے کبھی ایک دوسرے کو، کبھی اعجاز کو اور کبھی صاحبزادہ امتیاز کو دیکھے جا رہی تھیں۔ اچانک وہ اٹھا ۔۔۔ ہنگاموں سے بیگانہ، کھویا کھویا سا پھر پاگلوں کے سے انداز سے اِدھر اُدھر دیکھتا کوٹھی کے اندر چلا گیا۔

اپنی ممی کے کمرے میں جا کر وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ الماری سے زیورات کا بکس نکال رہی تھیں۔ آہٹ پا کر مڑیں۔

" کوئی خاص بات ہے صاحبزادے؟" وہ اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر بولیں۔

" ممی آپ شبنم کو رباب کے جہیز میں دینا چاہتی ہیں نا؟ باندی بنا کر؟" اس نے غیر ارادی طور پر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ لئے۔

" آپ نے ٹھیک سنا ہے ۔۔۔ رباب کو گھر گرہستی کرنا ٹھیک طرح نہیں آتا۔ میں نے اتنی کم مدت میں شبنم کو پرکھ لیا ہے۔ رباب کو سسرال میں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔"

" ممی!" وہ اسی انداز میں بولا۔ " آپ کو رباب سے زیادہ پیار ہے یا مجھ سے؟"

بیگم صاحبہ کچھ دیر کو ٹھٹھکیں ۔۔۔ پھر ذرا مسکرا کر سچائی سے بولیں۔ دل کی جو پوچھئے تو آپ سے زیادہ مجھے کوئی پیارا نہیں صاحبزادے۔"

"تو ممّی ـــ جو نعمت آپ رباب کو دے رہی ہیں، کیا مجھے نہیں دے سکتیں؟ میرا مطلب شبنم سے ہے، لیکن مجھے وہ باندی یا لونڈی کے روپ میں نہیں، بیوی کے روپ میں دیجیئے۔" وہ اسی طرح کہے گیا۔ "میرے خیال سے رباب سے زیادہ بہتر طریقے سے اُسے میں رکھ سکوں گا۔"

"صاحبزادے!" بیگم صاحبہ زور سے چلّائیں۔ "آپ پاگل ہو گئے ہیں! آپ اپنے ہوش میں نہیں ہیں جاکر ٹھنڈے پانی سے شاور کیجئے۔" دھڑ سے انھوں نے زیورات کا سیف بند کر دیا۔

"آئندہ اس قسم کی کوئی بات آپ کے منہ سے نہیں نکلنی چاہئے۔" وہ چنگھاڑیں۔

باہر جب کھانے کی دھوم مچی تو صاحب زادہ امتیاز کی ڈھونڈیا پڑی سب مہمان اور معزز حاضرین منتظر ہی تھے کہ صاحبزادہ امتیاز دھیرے دھیرے داخلِ محفل ہوئے۔

"آیئے بیٹے۔" خانصاحب نے انتہائی شفقت سے انھیں بلایا۔ "سب آپ کے منتظر ہیں۔ اب آپ ولی عہد ہیں، مالک ہیں، بے تاج بادشاہ ہیں۔ آپ کے پیچھے ہم سب ہیں۔" وہ ذرا مذاق سے حاضرین کی طرف دیکھ کر بیٹے سے کہنے لگے۔

امتیاز ٹیبل کے قریب آکر رک گیا۔

"ڈیڈی ـــ میں کھانا ایک شرط پر کھاؤں گا۔"

"فرمایئے۔" وہ ذرا محبّت سے ہنسے۔

"میں ٹیبل پر کھڑا ہو کر کھانا کھاؤں گا۔"

آس پاس بیٹھے ہوئے سب لوگ ہنسنے لگے۔ مگر خانصاحب نے ذرا چونک کر بیٹے کو دیکھا۔

"یہ بھی ممکن ہے کہ میں ٹیبل کے نیچے چھپ کر بلیوں کتوں کی طرح کھاؤں"۔
سب پھر ہنسنے لگے۔ لیکن خانصاحب اچانک سنجیدہ ہو گئے تھے۔ کہیں بے پناہ
دولت کی ملکیت کے احساس سے صاحب زادے کا دماغ تو نہیں چل گیا ہے؟ کہیں —
کہیں — وہ دل ہی دل میں ڈرتے ڈرتے سوچتے رہے۔ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو گیا ہے۔
امتیاز کے چہرے پر دور دور تک مذاق کے آثار نہیں تھے۔
"صاحبزادے، آپ پہلے بیٹھ تو جائیے"۔
"میں تو لیٹوں گا"۔ اور صاحب زادے امتیاز وہیں گھاس پر سچ مچ لمبے
لمبے لیٹ گئے۔
خان صاحب تو امتیاز کے پہلے ہی جملے پر کھٹک گئے تھے مگر مہمانوں کی موجودگی
کا خیال کر کے اسے ذرا مزاح کا رنگ دے رہے تھے۔ لیکن جب امتیاز سچ مچ ہی
گھاس پر لیٹ گیا تو وہ بوکھلا کر چلّائے۔ "ڈاکٹر! ڈاکٹر مرزا کو فوراً بلا لاؤ"۔
فیملی ڈاکٹر ہونے کے ناطے ڈاکٹر مرزا بھی آج کی دعوت میں مدعو تھے۔ وہ ذرا
ہٹ کر دوسری میز پر اپنے دوستوں کے ساتھ مشروب پی رہے تھے۔ اپنا نام
سُن کر وہ لپکے آئے۔ امتیاز کو زمین پر پڑا دیکھ کر وہ خود بھی گھبرا گئے۔
"وہاٹ از رونگ خان؟" وہ خانصاحب کے گہرے دوستوں میں سے تھے
اور بے تکلفی سے انھیں صرف خان ہی کہا کرتے تھے۔ "کیا ہو گیا ہے صاحبزادے کو؟"
خان صاحب گھبرائی ہوئی آواز سے بولے۔ "پتہ نہیں ڈاکٹر میرے بیٹے کو کیا
ہو گیا ہے آپ خود ہی دیکھ لیجئے۔ مگر ڈاکٹر، خدا کے لئے ایسی کوئی بات مجھے نہ
سنانا جسے میں برداشت نہ کر سکوں"۔
ڈاکٹر مرزا نے نبض دیکھی، دل کی دھڑکن محسوس کی، ٹمپریچر دیکھا۔ سب بظاہر

نارمل تھا، لیکن امتیاز تھا کہ پاگلوں کی طرح رہ رہ کر اِدھر اُدھر کچھ جیسے ڈھونڈے جاتا تھا۔

ڈاکٹر مرزا پریشانی سے بولے۔ "خانصاحب مجھے لگتا ہے کسی صدمے کا دماغ پر سخت اثر ہوا ہے۔ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ ہم انہیں ہاسپٹل لے چلیں۔"

"نہیں نہیں۔ ڈاکٹر" خانصاحب چلاّئے۔ "میں اپنے دل کے ٹکڑے کو اپنے سے دور نہیں کر سکتا۔ آپ شہر کے سارے ڈاکٹرز یہیں بلا لیجئے۔ میں لاکھوں روپیہ اپنے بچے پر سے صدقہ کر کے پھینک سکتا ہوں۔ لیکن ڈاکٹر پلیز...... اور وہ سسک اُٹھے۔

یہاں سے وہاں تک ساری کوٹھی میں عجیب سی افراتفری مچ گئی۔ مہمان بیبیاں، مرد مہمانوں میں آکر گھبرا گھبرا کر اسی طرف جھانکنے لگیں جہاں امتیاز پڑا ہوا تھا۔ بیگم صاحبہ چیخیں مارتی ہوئی لپکیں اور دھڑ سے گھاس پر گر پڑیں۔ بہنیں الگ بدحواس۔ یاسمین اپنی سہیلیوں کے جمگھٹے میں پریشان چلاّ رہی تھی۔ "او گاڈ! اب میرے نیوچر کا کیا ہوگا۔؟"

شادی کا سا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ امتیاز کو ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر بگ روم میں پہنچا دیا گیا۔ مہمانوں میں کسی نے کھایا۔ جو دردمند تھے وہ یوں ہی بغیر کھائے پیے چل دیئے۔ چار پانچ ڈاکٹروں کو فون کر کے بلا لیا گیا۔ کسی کی کچھ رائے تھی کسی کی کچھ۔ امتیاز اب تو منہ سے کچھ بول رہا تھا نہ کسی کو پہچان ہی رہا تھا۔ بس وحشت زدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھے جاتا تھا۔

اس سارے ہنگامے سے دور ثریا بی بی اور شبنم اپنے کمرے میں یوں بیٹھی تھیں جیسے کسی نے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ رہ رہ کر شبنم کے دل میں بس یہ خیال آتا تھا کہ صاحبزادے

کی تباہی کی تنہا وہی ذمہ دار ہے۔ اس خیال نے اتنا زور باندھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہائے کم بخت یہ حُسن، اس کی امی بھی اپنی جوانی کے زمانے میں اسی حُسن کی بدولت ہی کانٹا بن کر سب کی آنکھوں میں کھٹکتی تھیں۔ اور وہ بھی آج ......

اللہ جانے رات کیسے بیتی ---- صبح کوٹھی پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اس بات پر متفق تھے کہ کسی شدید ذہنی صدمے نے امتیاز کو عارضی طور پر ہی سہی، مگر پاگل کر دیا ہے۔ علاج گھر پر ہی ہونا طے پایا۔ ڈاکٹر مرزا کی کوششوں سے مریض کو نہ کسی ہاسپٹل میں داخل کیا گیا نہ پاگل خانے میں لے جانے کا سوچا گیا۔ انھوں نے خان صاحب سے کہہ دیا تھا اللہ نہ کرے جب معاملہ ہاتھوں سے نکلنے ہی کو ہو جائے تب ہاسپٹل میں لے جانے کی سوچیں گے۔

بڑے بڑے پیسے والے لوگوں میں کون ان دونوں ماں بیٹی کو پوچھنے جاتا؟ لیکن اصلیت یہ تھی کہ شبنم خود بھی پاگل سی ہو کر رہ گئی تھی۔ جب سب امتیاز کے پاس سے ہٹ جاتے تو وہ نظر بچا کر کھڑکی سے باہر جا کر کھڑی ہوتی اور ایک ٹک اسے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھے جاتی۔

دو چار دن یونہی نکل گئے۔ خان صاحب نے ایک نرس کا انتظام کیا۔ جس دن وہ نرس امتیاز کے کمرے میں داخل ہوئی، امتیاز ایک دم بھڑک اٹھا۔ اب تک وہ خاموش ہی تھا۔ لیکن اس دن اچانک اول فول بکنے لگا۔ نرس نیند کی دوا لے کر اس کے کمرے میں پہنچی تو اس نے دوا کا پیالہ تو اٹھا کر پھینکا ہی، نرس کے پیچھے اتنی تیزی سے دوڑا کہ وہ گھبرا کر چیختی ہوئی کمرے سے نکل بھاگی۔ باہر یاسمین اپنی امی، کچھ سہیلیوں اور امتیاز کی بہنوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ بھائی کو اس حال میں دیکھ کر بہنوں کے تو چہرے اتر گئے، یاسمین اور اس کی سہیلیوں کو جیسے کوئی چھوٹا موٹا تماشا مل گیا ہو۔ وہ

ذرا دلچسپی سے دیکھنے لگیں کہ اب کیا ہوتا ہے۔

امتیاز نے سب کو خونخوار نظروں سے دیکھا اور چلّا کر بولا۔ "اگر میرے کمرے میں کسی نے قدم بھی دیا تو ٹانگیں توڑ ڈالوں گا"۔

بیگم صاحبہ روتے ہوئے بولیں۔ "ہائے میرے بچّے کو کس کی نظر لگ گئی! ارے یہ کچھ کھائے گا پئے گا نہیں تو زندہ کیسے رہے گا"۔

ان کی ہونے والی سمدھن ہاتھ چلا کر بولیں۔ "اب بھئی نرس ہی کو نہیں آنے دیتے تو اور کون پاگل کے پاس جانے کی ہمّت کرے"۔

بیگم صاحبہ تڑپ کر چلّائیں۔ "خدا کے لئے مسز اکرم، میرے بیٹے کو میرے ہی سامنے یوں پاگل تو نہ کہیئے"۔ آنسوؤں سے ان کا گلا رندھ گیا۔

"اب پاگل ہونے میں کسر ہی کون سی رہ گئی ہے؟ چپ چپ سے تھے تو چلو کچھ ٹھیک بھی تھا۔ اب مارنا، ٹھونکنا، اور گالیاں دینا بھی شروع ہو گیا ہے۔ اب کیا شک باقی رہ گیا؟" وہ بے رحمی سے بولیں۔

اسی وقت سب کی نگاہوں نے ایک عجیب ناقابل یقین منظر دیکھا۔ جہاں سب امتیاز سے ڈرے دبکے جا رہے تھے، شبنم اپنی روئی روئی غمگین آنکھوں والا اداس چہرہ لئے سامنے آئی اور اتنے لوگوں کی موجودگی کے احساس سے بیگانہ، امتیاز کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "چلئے اپنے کمرے میں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے"۔

وہ ہاتھ جھٹک کر دھاڑا۔ "تم کون ہوتی ہو میرا ہاتھ پکڑنے والی؟ شہر میں اور بہت لوگ ہیں، جا کر کسی اور کا ہاتھ پکڑو"۔

اس پر کوئی ہنسا، کسی نے مزہ لیا، کسی نے غم سے سسکی لی۔

شبنم دھیمی آواز میں بولی۔ "اس ہاتھ کو پکڑنے کے بعد؟"

ایک دم اُدھر سے ڈاکٹر مرزا نکل آئے۔ تیزی سے آگے بڑھ کر انھوں نے امتیاز کا ہاتھ تھاما۔ پھر شبنم کی طرف دیکھ کر کچھ ٹھٹھک سے گئے۔

"کون ہو تم؟ پتہ نہیں یہ دماغی مریض ہے۔ اگر مار وار دیتا تو ——؟ جاؤ اندر۔"

"ڈاکٹر انکل۔" وہ ان کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی۔ "اگر یہ مار دیتے تو میں جی اٹھتی۔" وہ ان کے پاؤں پکڑ کر روتے ہوئے بولی۔ "خدا کے لئے انھیں اچھا کر دیجئے —— خدا کے لئے۔"

ڈاکٹر مرزا نے بڑے دُکھ سے اس درد مند دل رکھنے والی لڑکی کی طرف دیکھا۔ سامنے بیگم صاحبہ آنکھوں سے آنسو پونچھتی کھڑی تھیں۔

انسان بڑے سے بڑے غم کا عادی ہو جاتا ہے —— خدا نے انسان کا دل ہی وہ چیز بنا دیا ہے کہ پہاڑ سے غم بھی سہہ جائے —— ساری دنیا امتیاز کی بیماری کی عادی ہو گئی۔ کسی نے اسے تماشا بنا لیا۔ کسی نے وقت گذاری کا ذریعہ۔ یاسمین خانصاحب کے قریبی دوست کی بیٹی تھی۔ ساتھ کا اٹھنا بیٹھنا، روز کا آنا جانا لگا تھا۔ بیویاں بھی آپس میں دوست تھیں۔ دولت مند گھرانہ تھا۔ خانصاحب سیر تھے تو اکرم صاحب سوا سیر۔ امیر ماں باپ کی خود سر بیٹیاں جیسی پلتی بڑھتی ہیں ویسی ہی یاسمین اور اس کی بہنیں بھی پلی بڑھی تھیں۔ بیگم صاحبہ نے ہی یہ رشتہ سوچا تھا۔ یہ عجیب بات ہے پیسے والے پیسے والوں ہی میں گھستے ہیں۔ دولت دولت کو کھینچتی ہے۔ خاندان میں اوبھی کئی غریب یا متوسط گھرانے کی بیٹیاں تھیں۔ یاسمین سے ہزار درجہ اچھی۔ پھر جان پہچان والوں میں بھی لڑکیوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن اپنے اپنے ظرف کی بات تھی۔ بیگم صاحبہ کو اپنے سے بھی زیادہ امیر لوگوں سے میل جول بڑھانے کا خبط تھا۔ جب دو گھرانے قریب آئے تو بچوں میں بھی دوستی بڑھی۔ لڑکیاں لڑکیاں آپس میں چھیڑ چھاڑ میں رشتے

لگانے لگیں۔ دو چار بار امتیاز کے ساتھ سب مل کر گھومنے پھرنے پکچر دیکھنے بھی چلی گئیں۔ بیگم صاحبہ نے سمجھ لیا کہ امتیاز کا دل یاسمین پر آگیا ہے بس رشتہ دے دیا۔ امتیاز نے سُنا تو کچھ غور ہی نہیں کیا نہ اچھا نہ بُرا۔ معلوم تھا کہ ایک دن شادی ہوگی۔ اب کسی سے بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے۔ کسی نہ کسی لڑکی سے تو ہوگی ہی۔ پھر ممّی کی پسند کی ہی کیوں نہ ہو جائے؟ اور شاید یہ سب اس لئے بھی تھا کہ محبت کی مار ابھی اس کے کچے دل نے سہی نہیں تھی۔ ویسے بھی امتیاز ان بچّوں میں سے تھا جو بڑے ملنسار، مہذب اور خدمت گزار قسم کے ہوتے ہیں جو سراپا محبت ہوتے ہیں۔ وہ بھلا ممّی کے آگے ہیر پھیر کیا کرتا؟ لیکن پہلی محبت کی نظر نے، محبّت کی پہلی ہی جھلک نے اسے یہاں سے وہاں تک اتھل پتھل کر ڈالا۔ وہ جو بچپن ہی سے اتنا حساس اور درد مند دل رکھتا تھا کہ نوکر چاکر تک سے "آپ آپ" کہہ کر بات کرتا۔ اپنی ہی سگی خالہ کی بیٹی سے ماں کا یہ سلوک برداشت نہ کر سکا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ چند ہی ماہ میں اس کی شادی ہونے والی ہے۔ وہ ایک انہونی سی آرزو کا اظہار کر کے اپنی دنیا مٹا بیٹھا۔

لیکن شاید اب ہر چیز، ہر بات کو بہت دیر ہو چکی تھی۔ وقت کے نقّارے پر آخری چوٹ پڑ چکی تھی۔ اب ایک پاگل کی شادی کیا اور محبّت کیا؟

بیگم صاحبہ ایک دن بہت غم کے ساتھ خان صاحب سے بولیں۔ "کیا صاحبزادے کا علاج ناممکن ہے؟"

پتہ نہیں بیگم ـــ سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن ایک بات رہ رہ کر میرا دل نوچتی ہے۔ ڈاکٹر مرزا کہتے ہیں صرف کسی صدمے نے امتیاز کے دماغ پر اثر کیا ہوگا۔ آخر وہ کیا صدمہ ہو سکتا ہے؟ میں تو سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

بیگم صاحبہ رُکتے رُکتے بولیں۔ "میں نے آپ کو بتایا نہیں۔"

"کیا؟" وہ اچھل کر بولے۔

"وہ شبنم سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ بس اسی وقت سے یہ حالت ہے۔"

خان صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کے تصور میں وہ معصوم، غمگین سی لڑکی ابھر آئی، جو صبح سے شام تک، رات سے لیکر دن تک ـــ دن رات بلا کسی معاوضہ اور لالچ کے امتیاز کی خدمت کئے جا رہی تھی۔ کبھی امتیاز کے لئے سوپ بنا رہی ہے، کبھی موسمی کا رس نکال رہی ہے، کبھی اس کی گھڑکیاں اور ڈانٹ کھا کر آنسو پی پی کر اسے ترس بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ کبھی اس کی غلاظت صاف کر رہی ہے ـــ آئے دن امتیاز سوپ اور رس کی ٹکلیاں اس کے کپڑوں پر یا فرش پر کر دیتا، وہ خود ہی فرش صاف کر لیتی۔ اپنے کپڑوں کو چپ چاپ جا کر دھو لیتی ـــ خان صاحب بچہ نہ تھے۔ سب دیکھتے تھے کہ یاسمین، اس کی سہیلیاں، اس کی ممی امتیاز کو اب صرف تماشا سمجھتی ہیں۔ پاگل تو پاگل ہی ہوتا ہے کبھی امتیاز بندروں کی طرح خوخیاتا تو وہ سب کھل کھلا کر ہنس پڑتیں۔ ایک بار ان کا دل ترس سے بھر گیا مگر کر بھی کیا سکتے تھے۔ سمدھیانے کا معاملہ تھا۔ انھوں نے خود دیکھا تھا اور بیگم صاحبہ کو بھی بتایا تھا کہ امتیاز کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر کے وہ سب اُسے چھوٹے چھوٹے کنکر پھینک کر مار رہی تھیں اور جب امتیاز غصہ سے تلملاتا تو قہقہے لگا اٹھتیں۔

"بیگم ـــ" وہ غصے سے بولے۔ "میرے خیال سے آپ نے اچھا نہیں کیا۔"

بیگم صاحبہ حیرت سے بولیں۔ "اچھا نہیں کیا؟ اور یوں بن بات اتنی مدتوں تک کی پکی بات بلا وجہ توڑ دیتی تو شہر والوں کو اور دنیا کو کیا منہ دکھاتے؟"

"کہہ دیتے لڑکے نے خود اپنی پسند سے شادی چپکے سے کر لی ہے۔ ہمیں خود پتہ نہ تھا

کیا آپ کی بیٹی کی زندگی برباد کر دیتے ۔"

"حیرت ہے آپ ایسا کہہ رہے ہیں ۔۔۔ اب دیکھئے نا اکرم صاحب کے گھر والوں کی شرافت، اتنی خراب حالت ہے امتیاز کی لیکن کبھی یہ بات زبان پر نہ لائے کہ پاگل ہے کیسے بیٹی بیاہی۔ ایک دو بار ذکر آیا بھی تو بس یہ کہا کہ کیا دکھ بیماریاں آیا نہیں کرتیں۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا بیگم ۔ یہ دولت کے انبار، یہ عزت، یہ شہرت ۔۔۔ سب کچھ بے معنی ہو کر رہ گیا ہے ۔ کتنے دن ہو گئے امتیاز کی حالت میں ذرا بھی سدھار نہیں ۔" وہ دل پکڑ کر ذرا رُکے ۔" مجبوراً یہ طے کر لیا ہے کہ کسی مینٹل ہاسپٹل میں داخل کرا ہی دیا جائے کیونکہ ادھر چند روز سے وہ کچھ تشدّد پر اتر آیا ہے ۔ اگر لوگوں کو مارنے پیٹنے لگا تو یہ قانونی کیس بن جائے گا ۔ کسی کی جان بھی لے سکتا ہے۔ ذمّہ داری تو ہماری ہو گی ۔"

بیگم صاحبہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھے جا رہی تھیں ۔

شبنم کے شب و روز آنسوؤں میں ڈھل کر رہ گئے تھے ۔ کیسے نصیب لے کر دنیا میں آئی تھی ۔۔۔ وہ سوچتی ۔۔۔ بچپن گذرا جوانی آئی ۔۔۔ وہی غم، وہی آنسو پھر قسمت یہاں لے آئی ۔ اندھیرے یہاں بھی ساتھ میں آئے لیکن ان ہی اندھیروں سے جگمگاتا سورج بھی نکلا ۔ ہائے وہ دو تین دن جو ساری زندگی کی خوشیوں پر بھاری تھے ۔ وہ اُن کی شدید محبّت ! وہ دنیا سے لڑ جانے کا جذبہ ! ماں کو بے باکی سے طعنے اُلاہنے دینا سب کے سامنے امّی کی اور میری طرفداری ۔ پھر اُن کا میرے قدموں سے لپٹ پڑنا ۔ ہائے میں نے کیسی خوشی پائی تھی کہ اپنی ہی نظر لگ گئی ۔ ان چند گھنٹوں پر تو میں اپنی ساری دنیا وار سکتی ہوں ۔۔۔ اور ان پر ۔۔۔ خود ان پر تو یہ زندگی بھی ۔۔۔ اس نے حسرت سے صاحبزادے امتیاز کے اجڑے ہوئے چہرے کو دیکھا ۔ ان کی نظر سے نظر ملی تو

وہ بے قابو ہوگئی۔ ایک ایک آنکھ سے آٹھ آٹھ چھوڑ سو سو آنسو نکلنے لگے ــــ وہ نہ دیکھ لیں ــــ وہ آڑ میں ہوگئی ــــ پچھلی طرف سے اس کے کانوں نے سرگوشیاں سی سنیں۔

"ممّی، باجی کی شادی ایک پاگل سے کردیں گی آپ؟" یاسمین کی چھوٹی بہن شاید اپنی ماں سے پوچھ رہی تھی۔

"پاگل ہے تو کیا ہوا کروڑپتی تو ہے۔ مہر میں آٹھ دس لاکھ بندھوا کر شادی تو کرلیں بعد میں پاگل پن کے نام پر فارغ خطی دلوالیں گے۔ کیا یاسمین کے لئے لڑکوں کی کمی ہے؟"

"سچ ممی ــــ یہ ممکن ہے ممّی؟" خود یاسمین کی خوشی بھری آواز!

"اور کیا ــــ ہم اپنے منہ سے کیوں انکار کریں اور کیوں آتی ہوئی دولت کو ٹھکرائیں؟"

شبنم نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ خدا کے لئے یہ سب کچھ صاحبزادے نے نہ سنا ہو! کس قدر قریب کھڑی ہوکر وہ یہ سب باتیں کررہی ہیں، لیکن ہائے وہ تو ہر احساس سے بیگانہ اور عاری ہو چکے ہیں۔ اس نے آنسو روکنے کی ناکام سی کوشش کی۔ صاحب زادے کے پاس سے ڈاکٹر انکل اس کے پاس چلے آئے

"بیٹی تم کیوں خواہ مخواہ روتی رہتی ہو، جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔"

"ڈاکٹر انکل ــــ میں یہ سب کچھ نہیں سہہ سکتی۔ آپ انھیں اچھا کر دیجئے۔ میری جان لے لیجئے مگر انھیں شفا دے دیجئے۔ آپ کو پتہ نہیں ان کے خلاف کیا کیا باتیں ہوتی ہیں۔ کاش میں آپ کو سب کچھ بتا سکتی۔"

ڈاکٹر مرزا حیرت زدہ سے، اس کا سر تھپ تھپا کر اسے خاموش کرنے کی ناکام کوشش

کرتے رہے۔

رباب، نکہت اور دلشاد جو شبنم سے بلا وجہ ہی یا شاید اس کی بے پناہ خوبصورتی کی وجہ سے اس سے کٹی کٹی رہتی تھیں، اب اسے امتیاز کی بے پناہ خدمت کرتا دیکھ کر اس سے شرمندہ سی رہنے لگی تھیں۔ ہوتے ہوتے وہ شبنم سے ایسی خاموش محبت کرنے لگیں جو صرف محسوس کی جاسکتی تھی۔ وہ جب تک امتیاز کی تیمار داری میں مشغول رہتی ان سب کی یہی کوشش ہوتی کہ اس کے بغیر نہ کھانا کھائیں، نہ آرام کریں۔ مصیبت یہ تھی کہ امتیاز اگر کسی کے زیر اثر تھا تو بس شبنم کے۔ منہ بھی شبنم ہی دھلائے۔ کنگھا بھی وہی کرے اور تو اور گالیاں اور دھکے بھی وہی کھائے۔ کوئی بات ناگوار گزرتی تو اسے دھکا دے کر غرّاتا۔ چلّا چلّا کر کہتا۔ "تم بھکارن کہاں سے آن ٹپکی ہو جو میرے سامنے سے ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔"

شبنم منہ سے کچھ نہ بولتی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے اُسے دیکھے جاتی کبھی کبھی کہتی۔ "میں بھکارن ہوں۔ ہاں ہوں۔ لیکن مجھے بھیک میں اپنے آپ کو دے دیجئے۔" وہ خاموش بیٹھا سنتا رہتا۔ شبنم بولے جاتی۔ "آپ اچھے ہو جایئے بس چلی جاؤں گی۔ میں تو چلی بھی جاتی۔ مر ہی جاتی۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کو چھوڑ کر چلی گئی تو شاید میری طرح کوئی آپ کی فکر نہیں کریگا۔ میں مرگئی تو کسے غم ہے لیکن آپ کی جان کو کچھ ہو گیا تو یقین کیجئے کہ میں قبر میں بھی چین نہ پا سکوں گی۔ مجھے آپ کی دولت زیور، گاڑیاں، کوٹھیاں کچھ نہیں چاہیئے۔ صرف آپ کی صحت اور خوشی مطلوب ہے۔ جس دن آپ صحت مند ہو جائیں گے، میں سمجھوں گی خدا نے مجھے دنیا ہی میں جنّت دے دی۔" وہ اس طرح باتیں کئے جاتی جیسے کوئی ماں اپنے معصوم بچّے سے یہ سوچے بغیر بولے جاتی ہے کہ سننے والا کچھ سمجھ بھی رہا ہے یا نہیں!

وہ بھیانک دن بھی آہی گیا جب سب کے مشورے سے امتیاز کو پاگل خانے میں داخل کرنے کی بات طے ہو گئی۔ اُس دن ساری کوٹھی پر صبح ہی سے ایک عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سب سہمے سہمے، دبے دبے قدموں سے چل رہے تھے خانصاحب نے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر بیٹے کو پیار سے پکارا۔" امتیاز بیٹے ادھر دیکھئے۔"

امتیاز پر کوئی اثر نہ ہوا — جیسے جانے کون پکارتا ہو۔

" بیٹے — میں آپ کا باپ ہوں خانصاحب۔"

امتیاز آستین چڑھا کر بولا۔ خانصاحب ذرا مقابلے پر آؤ تو بتا دوں کیسے خانصاحب اور کہاں کے خانصاحب۔"

ڈاکٹر مرزا نے ہار کر خانصاحب کی طرف دیکھا — " لاحاصل ہے — میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا، اب پاگل خانے میں داخل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

" ڈاکٹر —" خانصاحب بے بسی سے ہاتھ مل کر بولے۔" محبت کا مارا باپ ہوں۔ چاہتا تھا کسی بہانے یہ حادثہ ٹل جائے ایک بار — بس ایک ہی بار وہ مجھے پہچان لے تو مجھے دنیا مل جائے۔ مگر اب تو لگتا ہے کہ بالکل ہی ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ میرے خدا! یہ کن گناہوں کی سزا ہے۔" وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر رو دیئے۔

سارے جاز، پہچان کے لوگ امنڈ آئے تھے۔ ان میں رشتہ دار بھی تھے۔ ملنے جلنے والے بھی اور ہونے والے سمدھیانے کے لوگ بھی۔ جیسے برات چڑھتی ہے اور دولہا کو دیکھنے کے لئے لوگ ٹوٹے پڑتے ہیں، اسی طرح سب آگے پیچھے ہوئے جا رہے تھے۔ ماں، بہنوں کی آنکھوں سے جھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ غریب خالہ الگ دیوار سے لگی سسک رہی تھیں — یاسمین حیرت زدہ سی اپنی ممی بہنوں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ سب ہی کی آنکھوں میں آنسو اور چہروں پر غم کی چھاپ تھی۔ بس ایک شبنم تھی جس کا چہرہ ست ہو کر رہ گیا تھا۔

اس کی آنکھیں اتنے آنسو بہا چکی تھیں کہ اب وہ خشک سی ہو چکی تھیں۔ سنہری رنگت اب زرد پڑ چکی تھی۔ شہد کے رنگ کے تروتازہ بال اب روکھے جانے سے بن گئے تھے۔ اس کے وہ بھرے بھرے ہونٹ جو غریبی اور پریشانی میں بھی ایک معصوم سی مسکراہٹ سے کھلے رہتے تھے اب مرجھا سے گئے تھے۔

"ڈاکٹر انکل ـــ" وہ ڈاکٹر مرزا سے سرگوشی میں بولی۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ میں ہاسپٹل میں صاحب زادے کے پاس رہ سکوں؟"

ڈاکٹر مرزا دکھ سے مسکرائے۔ "بیٹی تمہیں پاگل خانوں کے قانون نہیں معلوم ـــ وہاں کوئی اٹنڈنٹ ساتھ نہیں رہ سکتا۔"

"انکل!" وہ جلدی سے بولی۔ "بی۔اے میں میرا مضمون ڈومسٹک سائنس تھا۔ تھوڑی بہت نرسنگ مجھے آتی ہے۔ میں ان کا بہت اچھی طرح خیال رکھ سکوں گی۔"

ڈاکٹر مرزا نے جواب میں صرف اس کی پیٹھ تھپ تھپائی اور وہ کسی کی موجودگی کا خیال کئے بغیر چلا چلا کر رونے لگی۔

روتے روتے اچانک وہ پاگلوں کی طرح مڑی اور اپنی امّی سے کہنے لگی ـــ "امّی! اب یہاں میرے لئے کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے۔ میں اب یہاں زندہ نہیں رہ سکوں گی خدا کے لئے چل نکلئے امّی!" اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنی امّی کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے دیوانگی کے انداز میں باہر بھاگنے لگی۔

"شبّو! تم یہاں سے نہیں جاؤ گی ـــ اور اگر جاؤ گی تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی آؤں گا۔"

امتیاز کی آواز سن کر شبنم بھونچکی سی پیچھے مڑی۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ حیرت زدہ سا رہ گیا۔ اچانک امتیاز آگے بڑھا اور ڈاکٹر مرزا کو مخاطب کر کے بولا۔ ڈاکٹر انکل

میرے خیال سے اب اس ڈرامے کو یہاں ختم ہو جانا چاہیئے۔"

"جیسی تمہاری مرضی بیٹے ۔۔" وہ سعادت مندی سے بولے۔

خان صاحب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی بیٹے کو، کبھی ڈاکٹر مرزا کو دیکھنے لگے۔

امتیاز مسکرایا، طنز سے بھرپور مسکراہٹ۔

"انکل ۔۔ پپّا کو بتا ہی دیجئے، اب سب کچھ۔"

"ہاں خان۔ یہ سچ ہے امتیاز پاگل نہیں ہوا تھا، بن گیا تھا۔ اور اس ڈرامے میں اس نے مجھے بھی ایک رول دیا تھا جسے میں نبھانے پر مجبور تھا۔"

مسز اکرم، یاسمین، بہنیں سب اپنی جگہ چونکنے سے ہو گئے۔

امتیاز نفرت سے سب کو گھورتے ہوئے بولا۔

"امّی جان محترمہ ۔۔۔ اس سارے عرصے میں مجھ پر بھی، آپ پر بھی، پپّا پر بھی اور ڈاکٹر انکل پر بھی یہ بات کھل چکی ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ سب نے یہ بھی دیکھ لیا کہ دن رات کا چین حرام کر کے کس نے میری نام نہاد بیماری میں تیمارداری کی کس نے اپنی راتوں کی نیند قربان کی۔ کس نے دن کا چین صدقہ دیا۔ میری بیماری کو سچا سمجھ کر یہ مشورے بھی میرے کانوں نے سُنے کہ مہر میں آٹھ دس لاکھ روپیہ بندھوا کر مجھ سے طلاق یا فارغ خطی حاصل کر لی جائے اور دوسری جگہ یاسمین کی شادی کر دی جائے۔ میں صرف آپ پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ آپ کا انتخاب صحیح نہیں ہے۔ ممکن ہے شبنم میری زندگی میں نہ آتی تو میں یاسمین ہی سے نباہ کر لیتا، لیکن جنّت سامنے ہوتے ہوئے میں دوزخ میں ۔۔۔ جلتی آگ میں نہیں کود سکتا تھا۔ امّی جان! آپ سوچیں گی اس بات کے لئے اتنا بڑا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی ۔۔۔ تو میری پیاری ممّی، آپ شبّو کی خوبیاں اس طریقے کے سوا اور کسی طور پر پرکھ ہی نہیں سکتی تھیں۔

اس نے جس طرح میری خدمت کی، میرے لئے دعائیں مانگیں، میرے لئے روئی۔ اسے دیکھتے ہوئے اب میں ساری دنیا سے ٹکرانے کا حوصلہ اپنے آپ میں پاتا ہوں۔ ایک طرف مجھے یہ دکھ ضرور ہوگا کہ میں نے ماں باپ کی نافرمانی کی ـــــ لیکن اگر ایسے محبت بھرے دل کو توڑ کر میں نے کوئی قدم اٹھایا تو شاید خدا بھی مجھے معاف نہ فرمائے گا۔ اس لئے میں جا رہا ہوں ممی۔ خدا نے یہ دو ہاتھ دیئے ہیں۔ یہ کمائیں گے بھی اور اپنی محبت کو سہارا بھی دیں گے ......"

اچانک شبنم کا ہاتھ پکڑے خان صاحب آگے بڑھے۔ "نہیں بیٹے، کم از کم مجھے اتنا پتھر دل نہ سمجھو۔ خدا نہ کرے جو تم یوں تنہا جاؤ۔ ہم بھی تو تمہارے ساتھ ہیں بیٹا۔"

"نہیں پپا ـــ جس گھر میں شبنم کو عزت نہیں مل سکتی وہاں میں بھی نہیں رہ سکتا۔"

"بیٹے، عزت چھوٹوں کی نہیں کی جاتی، بزرگوں کی کی جاتی ہے۔" پیچھے سے آواز آئی۔

"چھوٹے تو محبت کئے جانے کے قابل ہوتے ہیں۔ دل میں بٹھانے کے لئے ہوتے ہیں۔"

امتیاز چونک کر پیچھے پلٹا۔ ممی بڑی محبت سے ہاتھ پھیلائے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ایک ہاتھ سے بیٹے اور دوسرے سے بہو کو گلے لگاتے ہوئے بولیں۔ "دولت کی چکا چوند میں میں تو اندھی ہی ہوگئی تھی بیٹا کہ یہ تک نظر نہ آیا کہ ایسے ایسے پاکیزہ موتی خدا نے خود میرے دامن میں ڈال رکھے ہیں۔"

شبنم کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو ابل پڑے۔ مگر بیٹی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ہمیشہ دکھی ہو جانے والی ثریا بی بی آج آنسوؤں سے غمگین نہیں ہوئیں۔ وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہنے لگیں۔ "میرے مالک یہ آنسو نہیں، خوشیوں کے چراغ ہیں ـــ انھیں سدا روشن رکھیو۔" اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں یہ کہتے ہوئے ان کی اپنی آنکھوں میں بھی یہ چراغ جل اٹھے۔

زرد چاند

ہوا کے ایک تیز جھونکے نے تمام ڈالیوں کو ہلا دیا۔

روشن دان سے ایک کومل سا، گلابی گلابی، ہرا ہرا پتّہ میرے سر پر آگرا۔ گڈّو جو سامنے ہی بیٹھا اپنے کھیل میں مگن تھا۔ میرے سر پر پتّہ دیکھ کر ناچ اُٹھا۔

"آہا جی! —— اوہو جی!!"

پھر وہ تالیاں بجا بجا کر گانے لگا۔

"ایک کے سر پہ چاندی
وہ ہماری باندی"۔

وہ رُکا، ہنستا ہوا میرے قریب آیا۔ اور پتّہ اُٹھا کر بولا۔

"دیکھئے ڈیڈی! آپ کے سر پر پتّہ!"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا، بہار کے موسم کا یہ پہلا پتّہ۔ خوشیوں کا پیامبر۔ جو ہرا ہرا لباس پہنے گڈّو کی ہتھیلی پر لرز رہا تھا۔ وہ جھک کر میرے کان میں بولا۔

"ڈیڈی! بہار آگئی!!"

موسمِ بہار کا وہ ہرا پتّہ میرے دیکھتے دیکھتے پیلا پڑ گیا۔ سارے میں زردی سی چھا گئی۔

"بہار ــــ ؟ ــــ بہار آگئی ــــ ؟؟"

بھلا اب بہار کیسے آسکتی ہے؟ ہاں ہر سال بے رنگ اور سوکھے پودے پھر سے لال ہرے ہو جاتے ہیں۔ کیا یہی بہار ہے، اسی کو بہار کہتے ہیں؟ لیکن اگر یہ بہار ہے تو میرے دل میں پھول کیوں نہیں کھلتے؟ اگر یہ بہار کی ہوائیں ہیں تو پھر میرے دل میں خوشی کی لہریں کیوں نہیں اٹھتیں ــــ اگر یہ بہار ہے تو ــــ تو ــــ !! میرے سر پر پیلے پتّے گر رہے ہیں ــــ لیکن گڈّو کہتا ہے بہار آگئی ــــ یہ کیسی بہار ہے۔

ہاں اب کبھی بہار نہ آئے گی۔ بہاروں کے پھول تو اُسی دن مرجھا گئے ــــ جس دن ــــ .....

یہ اُس دن کی بات ہے جب ہم آنگن میں بیٹھے یوں ہی اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ نیلے آسمان پر پونم کا پورا زرد چاند چم چم چمک رہا تھا۔ ننھّا ــــ بار بار ضد کئے جاتا تھا۔

"امّی میں تو چاند پکڑوں گا!"

"امّی جی مجھے تو چاند چاہیئے۔"

خالہ جان اُسے بہلاتی رہیں۔ بچّوں نے اپنا ہر حربہ آزما لیا۔ مگر وہ یہی رٹ لگائے تھا۔

مجھے تو چاند چاہیئے ــــ میں تو چاند لوں گا!"

"اسے رخشندہ کو دے دے۔ وہ بھی تو چاند ہی جیسی ہے۔"

رخشندہ ٹھنڈے صحن میں شطرنجی پر آدھی لیٹی، آدھی بیٹھی نیلے اُون سے اُلجھ رہی تھی۔ سلائیاں ٹک ٹکاتے ہوئے اُس کی گلابی گلابی، سفید سفید سی اُنگلیاں آپس میں مل جاتیں

پھر الگ ہو جاتیں۔ خالہ جان کی بات سُن کر سبھی چونک پڑے اور مُڑ مُڑ کر روشی کو دیکھنے لگے۔ بچّے اُس کے آس پاس گھوم گھوم کر ستانے قہقہے لگانے لگے۔

"روشی بجیا چاند ـــــ روشی بجیا چاند!"

روشی نے گھبرا کر جدھر نگاہ اٹھائی وہیں کسی نہ کسی کو اپنی طرف دیکھتے پایا۔ سلائیاں چھوٹ کر اس کے سینے پر گر پڑیں اور اُون کا نیلا نیلا گولا دُور تک کھلتا چلا گیا۔ سب سے آخر میں اُس نے میری طرف دیکھا۔ اور ایکدم کچھ شرما کر، کچھ سہم کر آنکھیں جُھکا لیں۔ میں ہنس کر بولا۔

"خالہ جان! چاند اور روشی کا بھلا کیا مقابلہ؟"

میری بات سُن کر روشی کا چہرہ کچھ بجھ سا گیا۔ جیسے چاند بدلی میں چلا جاتا ہے۔ خالہ جان مُڑ کر بولیں۔

"کیوں بھلا، کیا روشی چاند جیسی نہیں ہے؟"

میں پھر ہنسا۔

"چاند میں تو داغ ہے اور روشی تو اتنی......"

بات پوری ہونے سے پہلے میں نے دیکھ لیا کہ روشی کے چہرے کا چاند پھر بدلی سے نکل آیا تھا۔ اُس کی شلوار کا پائنچہ ذرا اوپر کھسک آیا تھا۔ وہ اپنے گورے گورے پنجے کو چھپاتی سر جھٹک کر اُٹھ بیٹھی۔ گری ہوئی سلائیاں اٹھا کر پھر بُننا کرنے لگی۔ اور ہنس کر بولی۔

"مگر ایسا چاند بھی کس کام کا جو اجالا ہی نہ پھیلائے؟"

جانے اس نے یہ بات کیسے کہی۔ کس مطلب سے کہی کہ اک دم پھر وہی تاریکی اُس کے آس پاس پھیل گئی۔ یہ روشی اتنی عجیب لڑکی ہے۔ میں اُسے چپ چاپ دیکھتا رہا۔

ننھا تیزی سے اُٹھا اور اُس کی گود میں جا بیٹھا۔ اُس کی ٹھوڑی پکڑ کر بولا۔

"ہاں بجیا! چاند تو آسمان پر چمکتا ہے نا ـــــ تم اگر چاند ہو تو تمھارا آسمان کون سا ہے ؟"

روشی یوں اُچھلی جیسے اُسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ اُون کا سمٹا ہوا گولہ پھر دور تک بہہ گیا۔ وہ دھیرے سے بولی۔

"میرا آسمان ـــــ ؟ ـــــ میرا آسمان ـــــ ؟"

اُس کی آنکھوں میں دم بدم لپکتے کوندے دیکھ کر میں کچھ خائف سا ہو گیا۔ بات بدلنے کو خالہ جان سے بولا۔ "ہاں خالہ جان! لوگ کہتے ہیں ہر آسمان کے پہلو میں ایک چاند چھپا ہوتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے ؟"

خالہ جان الجھ کر بولیں۔

"چاند واند کا میں نہیں جانتی۔ بس پہلو میں سیدھا سادہ دل ہوتا ہے جو سدا اوندھی سیدھی باتیں سوچتا رہتا ہے۔"

تب تک شاید روشی کو اپنا جملہ پورا کرنے کے لئے الفاظ مل گئے تھے۔ وہ ننھے سے کہہ رہی تھی۔

"میں جس آسمان کی چاند ہوں وہ میری آنکھوں میں بستا ہے۔"

وہ کسی سے مخاطب نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ یوں جیسے اُس نے آسمان کو سدا کے لئے اپنی آنکھوں میں قید کر لیا ہے!

روشی ایسی ہی بے تکی لڑکی تھی۔ سدا ایسی باتیں کرتی جو کسی کی سمجھ میں نہ آئیں بھلا کیسے ممکن ہے آسمان کی سی وسیع چیز کسی کی آنکھوں میں بس کر رہ جائے۔ میں جانتا ہوں ماضی کی یادیں وہ یادیں ہوتی ہیں جو صرف آنسو ہی دے سکتی ہیں۔ لیکن خزاں

کے یہ زرد پتے جنھیں دیکھ کر گڈو تالی بجاتا ہے اور کہتا ہے۔ بہار آگئی! میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ماضی کی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

چھٹیوں میں ہم سب کیرم اور لوڈو کھیلتے کھیلتے چلغوزے اور آئس کریم کھاتے کھاتے بور ہو چکے تھے۔ دل چاہتا تھا کوئی ہنگامہ ہو۔ لیکن کیسا ہنگامہ؟ پکنک کو جا نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ ڈیڈی ان دنوں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے اور گھر پہ حاضر رہنا بھی ضروری تھا۔

سب لڑکے لڑکیوں نے سوچ سوچ کر ایک پروگرام گھڑ ہی لیا۔ طے کر لیا کہ راشدہ کی منگنی مسعود سے کر دیں۔ یوں دونوں کی منگنی تو بچپن ہی سے ہو چکی تھی لیکن اُسے پھر سے "ری نیو" اس لئے کیا کہ ذرا ہنگامہ رہے۔ ڈنر کے بعد ایسا کوئی پروگرام ہم نے نہیں بنایا تھا۔ مگر جب نیلے نیلے ٹیوب لائٹ کی روشنیوں میں رات دن جیسی بن گئی تھی اور ہر طرف رنگ و بو کا طوفان اُمڈ پڑا تھا، کہ ایک طرف سے بہت سی لڑکیاں ہنستی جھومتی، مسکراتی آئیں اور بولیں۔ "اب ٹیبل یونہی رہنے دیجئے ذرا "بنڈل گیم" کھیلیں گے۔"

مسعود جھینپا جھینپا سا بیٹھا تھا۔ کیونکہ بیچارے کو دوبارہ منگنی کا دولھا بننا پڑا تھا۔ حیرت زدہ ہو کر بولا ـــــ؟"

"کیسا کھیل ـ ـــ؟"

رضوانہ ہنس کر بولی۔

"ریڈ اینڈ پلے (READ AND PLAY) نام کا کوئی کھیل آپ نے کبھی کھیلا ہے نوشہ میاں؟"

مسعود پھر بھی اُسے حیرت سے دیکھتا ہی رہا تو نیلو اُسے ہنس ہنس کر سمجھانے لگی۔

بھئی دیکھئے، ایک بنڈل میں بہت سی پرچیاں رکھی ہوتی ہیں جن پر مختلف عبارتیں

لکھی رہتی ہیں۔ جب بنڈل گھومتے گھومتے آپ کے پاس آئے اور آپکے نام پر جو پرچی نکلے تو اُسے پڑھیئے اور اس پر جو لکھا ہے اُسے پورا کیجیئے۔ مثلاً اگر آپ کے نام پر لکھا آئے۔

"اسی وقت گانا گائیے!"

تو چاہے آپ گدھے کے باپ ہی کیوں نہ ہوں، آپ کو گانا ہی پڑے گا۔"

ہنستی ہوئی لڑکیاں چاروں طرف بکھر گئیں اور پرچیاں نکلنی شروع ہوگئیں۔

انور کے نام جو پرچی آئی اُس پر لکھا تھا۔

"آپ کی جیب میں جتنے بھی پیسے ہیں حاضرین میں تقسیم کر دیجئے۔ تاکہ ان کے چاکلیٹ کھائے جاسکیں۔"

انور نے بور ہو کر جیبیں اُلٹ دیں۔ پچیس روپے گیارہ آنے نکلے۔

نوشابہ کے نام لکھا تھا۔

"گھونگھرو ہوں نہ ہوں یوں ہی ناچ کر بتایئے۔"

پہلے تو نوشابہ جھینپی، شرمائی۔ پھر مسکراتی ہوئی اُٹھی اور دو تین باریوں ہی گول گول گھوم کر اپنی جگہ جا بیٹھی۔ صابرہ کے نام کی پرچی پر لکھا تھا۔

"ضروری نہیں کہ آپ پامسٹ ہی ہوں۔ بہرحال کسی کا ہاتھ دیکھ کر اُس کی قسمت کا حال بتایئے۔"

صابرہ کی بغل میں روشی بیٹھی ہوئی تھی۔ صابرہ نے اس کا ہاتھ کھینچا تو وہ سہم کر بولی۔

"صبّو! مجھے میری قسمت کا حال نہ بتانا۔ میں جانتی ہوں میری قسمت میں کیا لکھا ہے۔"

صابرہ نے زبردستی ہنستے ہوئے اُس کی ہتھیلی پکڑی اور بولی۔

"یہ ضرور کسی سے محبت کرتی ہے!"

روشی سچ مچ کا چاند بن گئی۔ گلابی سنہری ہو کر چمکنے، شرمانے لگی ہتھیلی چھڑا کر اس نے جلدی سے پیر سکوڑے اور ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اس میں مُنہ چھپا لیا سب لوگ حیرت سے روشی کو دیکھنے لگے۔ اک دم شہناز نے ذاکر کے نام والی پرچی پڑھ کر سُنائی۔

"آپ اسی وقت ساحر کی کوئی سی چیز پڑھ کر سُنائیے۔ مگر شرط یہ ہے کہ لان میں کُمھار نہ گھُس پڑیں۔"

ذاکر نے اپنی بھونڈی بھدی آواز سے پہلے تو کچھ گنگنانا پھر گانا شروع کیا۔

"میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو

روشی نے تیزی سے بدلی میں اپنا منہ چھپا لیا اور الجھ کر بولی۔

"ذاکر بھائی! ساحر نے اس سے اچھی بھی کئی چیزیں کہی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" ذاکر ہڑبڑا کر بولا۔

"دوسری چیز ——— کوئی دوسری چیز ——— یہ نہیں ——— نہیں ——— !"

وہ سہم کر کہے جا رہی تھی۔

چار چھ پرچیاں اور نکلیں۔ پھر میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی پرچی پڑھی۔

"اللہ کو حاضر و ناظر جان کر بتایئے۔ بالکل سچ سچ بتایئے کہ آپ کس سے محبت کرتے ہیں؟"

"بتایئے فرحت بھائی!"

"چھپایئے گا نہیں بھیا! ——— ہاں!!"

میں ہنسنے لگا۔

ایک ایک کر کے سارے چہرے میری آنکھوں سے پھسلتے گئے۔ ایک لمحے کو میری نگاہیں روشی کے چہرے پر بھی رُکیں۔ وہ چاند پھر بدلی میں چلا گیا۔ وہاں سے بھی پھسل پڑیں۔ میں نے ہنسکر اعلان کر دیا۔

" خدا کو حاضر و ناظر جاننے کا سوال ہے تو سچ پوچھو تو میں کسی سے بھی محبّت نہیں کرتا!"

" رابی بجّو سے بھی نہیں؟"

نمو ہنس کر بولی۔

رابی کے نام پر میرا دل ہنس پڑا۔

" میں اُس سے شادی کرنے والا ہوں اس لئے؟"

سارے میں ہنسی کی دھوم مچی ہوئی تھی کہ کسی ویران سے لمحے میں اپنی گلابی گلابی ہتھیلی ٹھوڑی سے ہٹا کر روشی نے آنکھوں سے قریب کر لی۔ اور جیسے لکیروں کو پڑھتے ہوئے بولی۔

" تم کس سے محبّت کرتی ہو روشی بی بی! تم کس کو چاہتی ہو؟"

میں نے یوں ہی اُچٹتی نظروں سے دیکھا تو اس کا چہرہ اتنا بے رنگ نظر آیا کہ عید کے دن بھی نہ تھا۔

عید کے دن ہم سب خالہ امّی کے ہاں انوائٹ کئے گئے تھے۔ ان دنوں تو ہم سب کو ہنگامے کرنے اور غل غپاڑے کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ بزرگوں کی ٹولی الگ جا بیٹھی تو ہم سب خالہ امّی کے لِونگ روم میں اُٹھ آئے۔ روشی وہاں صوفے پر بیٹھی پروین باجی کے ننھے بچّے کے لئے موزے بن رہی تھی۔ اور ہم سب یوں ہی باتیں کر رہے تھے، شور مچا رہے تھے کہ ذاکر ہنس کر پروین باجی سے بولا۔

"بجیا! فرحت بھیا پھولوں کی اسٹڈی کر رہے ہیں!"

پروین باجی نے ذرا حیرت سے ذاکر کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں میں تمہارا مطلب بالکل نہیں سمجھی۔

ذاکر ہنس کر بولا۔

"ہم میں سے کوئی بھی اپنی پسند کے پھول کا نام لے دے۔ تو فرحت بھائی مزاج، عادات، اطوار، کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت فیوچر کا حال بھی بتا سکتے ہیں!"

پروین باجی ہنس کر بولیں۔

"اچھا تو فرحت! میرے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ مجھے سُرخ گلاب پسند ہے۔!"

"آپ کے تین بچے ہیں!" میں سنجیدگی سے بولا۔

سارے میں ہنسی پھیل گئی۔ پروین باجی بھی ہنس دیں۔

"بھئی عجیب ہو تم بھی۔ آنکھوں دیکھی بات کی سند نہیں۔ کچھ آگے پیچھے کی باتیں بتاؤ!"

"اچھا تو اب سچ مچ سُنئیے۔ گلاب کے سرخ پھول کی سُرخی اس بات کی علامت ہے کہ آپ کے مزاج میں ذرا تیزی ہے۔ اور بات بات پر آپ سُرخ پڑ جاتی ہیں۔"

پروین باجی زور سے ہنسنے لگیں۔

"ہاں سچ، مذاق نہیں۔ اور یہ کہ آپ کے مزاج میں لطافت بھی ہے۔ آپ جانتی ہیں نا کہ گلاب کی خوشبو کتنی میٹھی اور مدھر ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی.....

عظمیٰ مذاق سے بات کاٹ کر بولی۔

"یہ ساری باتیں تو میں بھی بتا سکتی ہوں۔"

جب سبھوں نے اپنی اپنی پسند کا نام بتا دیا تو آخر میں سلائیاں ٹک ٹک کاتے ٹک ٹکاتے یوں ہی بے پروائی سے روشی بولی۔

" اور مجھے گیندے کا پھول پسند ہے!"

میں نے ایک لمحے کو غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ اور بولا۔

" زردی کا پسند ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمھاری زندگی میں بہت کم بہاریں آئیں گی۔ تم جانتی ہو خزاں زردی کی عبارت ہے۔"

روشی کے ہاتھوں میں سلائیاں کانپیں۔ مگر چھوٹیں نہیں۔ گریں نہیں۔ اُس کا چہرہ بالکل بے رنگ ہو گیا۔ مگر وہ سنبھل گئی۔ اس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھول کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اور جیسے میری آنکھوں میں اُتر کر بولی۔

" ہاں فرحت بھائی! دنیا میں کوئی پھول ہرا بھی ہوتا ہے؟ "

میں نے ذرا اُلجھن سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

" ہرا پھول؟ —— میں نے تو کبھی نہیں سُنا۔ لیکن کبھی ہوتا بھی تو تم کیا کر لیتیں؟ "

" میں وہی ہرا پھول پسند کر لیتی اور یوں میری زندگی بہاروں سے بھر جاتی۔ بہار ہرے پتّوں سے اور رنگین پھولوں سے عبارت ہے نا —— ؟؟ "

یہ ہرا پتّہ میرے سر پر کانپ رہا ہے۔ روشی بھی یہی کہتی تھی۔ بہار ہرے پتّوں سے عبارت ہے۔ پھر مجھے اس بہار کی ہری ہری پتّیوں میں زردی کیوں کھنڈی نظر آتی ہے۔ بہار کے سُرخ پھولوں کی بجائے یہ گیندے کے زرد پھولوں جیسی زردی کہاں سے میری آنکھوں میں بھر گئی ہے —— ؟

روشی سوئٹر، موزے، ٹوپیاں بُنتے بُنتے آپ ہی آپ یوں چونک پڑتی تھی کہ

بار ہا اُس کے ہاتھوں سے سلائیاں گر جاتیں۔ اُس کی گلابی سفید انگلیاں یوں ہی گردش کرتے کرتے تھم جاتیں اور وہ سمندر جیسی گہری اور رات جیسی کالی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی۔ سہم سہم کر، ڈر ڈر کر، یوں جیسے ڈرنا اس کے لئے یونہی اہم چیز ہو۔

چھٹیوں میں جب چچا ابا لکھنؤ سے آتے تو پھر بچے کبھی نچلے نہ بیٹھ سکتے۔ کبھی موٹروں میں لد لدا کر پکنک پر جا رہے ہیں تو کبھی آؤٹنگ کو۔ کہیں تاریخی مقامات دیکھنے کی دھن سمائی ہے تو کبھی سینما دیکھنے کے پروگرام بن رہے ہیں اور جو کچھ نہیں تو گھر میں بیٹھ کر لطیفے یا دل لگی ہو رہی ہے۔

اُس دن سارے بچوں میں گھر کر روشی دیوانی جیسی ہو گئی۔ سب اُس سے کہہ رہے تھے، کوئی سی کہانی سنایئے۔ پہلے تو وہ ٹالتی رہی۔ پھر اُکتا کر بولی۔

"کہانی وہانی تو مجھے آتی نہیں، ہاں کھیل کھیلتے ہیں ایک!"

"کون سا کھیل؟"

سب چیخ کر بولے۔

"بھول بھلیاں!" وہ حسبِ عادت سہمے سہمے بولی۔

"بھول بھلیاں؟" بچے حیرت سے بولے ہم نے تو کبھی ایسے کھیل کا نام نہیں سنا!"

"میں تمھیں بتاتی ہوں۔ دیکھو ـــــ"

اک دم وہ آنکھیں بند کر کے ایڑیوں کے بل گول گول گھومتی چک پھیریاں کھانے لگی۔ کوئی دس پانچ پھیرے پورے ہو گئے تو رک کر بولی۔

"میرا مُنہ کدھر ہے؟" اس کی آنکھیں بند تھیں۔

"آپ کا مُنہ اس وقت انار کے پودے کی طرف ہے!" ذکی بولا۔

اُس نے ہنس کر آنکھیں کھول دیں اور بولی۔

"بس ایسے ہی کھیلا کرتے ہیں یہ کھیل۔ جہاں بھی قدم رک جائیں وہاں آنکھیں کھول کر دیکھو۔ فرض کرو تمھارے سامنے سورج ہے تو سمجھو تم روشنی کی طرف جا رہے ہو۔ جو چاند ہو تو جانو اُجالوں کی طرف لپک رہے ہو۔ ہاں! مگر دس پھیروں کے بعد رک جانا چاہیے۔"

"اور جو کبھی کانونٹ کی طرف منہ ہوا تو؟" بتی بور ہو کر بیزاری اور بھولپن سے بولی۔

"تو سمجھو تم کانونٹ جا رہی ہو۔"

روشی ہنس کر بولی۔

بتی ناک چڑھا کر بولی۔ "ہمیں تو نہیں بھایا یہ کھیل۔!"

لیکن دوسرے بچے اس بھول بھلیاں میں اپنی اپنی قسمت کی راہیں تلاش کرنے لگے۔

اک دم روشی ہنستے ہنستے سنجیدہ ہو گئی اور نیلو سے بولی۔

"دیکھنا ذرا، میں بھی گھوم کر دیکھ لوں۔ میری منزل کہاں ہے؟ کیا ہے؟!"

وہ بولتے ہوئے اور پھر تیز تیز گھومنے لگی۔ اُس کے آسمانی دوپٹے کے آنچل دونوں طرف لہرا کر گول گول ہونے لگے۔ چوٹیاں کھل کر شانوں اور پیٹھ پر پھیل گئیں۔ اُس کے چاند جیسے مُنہ پر ہلکا سا خوف تھا اور پلکیں لرز رہی تھیں۔ گھومتے گھومتے وہ دسویں پھیرے پر رُک گئی۔ اور قدم جما کر آہستہ سے بولی۔

"میرا مُنہ کدھر ہے؟"

اِک دم ہنسی کا شور مچ گیا۔ نیلو بے حال ہوتی ہوئی بولی۔

"آپ کی منزل تو فرحت بھائی ہیں!"

"کیا مطلب ____؟"
اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔
"ہاں دیکھیے نا! ____ آپ کے بالکل سامنے اُن ہی کا تو کمرہ ہے!!!"
اس نے آنکھیں جھپکا جھپکا کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ جہاں میں بیٹھا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ یونہی ہنس کر میں بولا۔
"ہاں روشی میں تمہاری منزل ہوں!؟"
اُس نے بہت ____ بہت دُور سے ستاروں کی سی چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور ڈوبتی آواز سے بولی۔
"فرحت بھائی! آسمان تک کون پہنچ سکا ہے؟"
اور اُس ایک رات کو، جب سارے ستارے ایک ایک کر کے آسمان پر جگمگا اُٹھے تھے۔ سارے میں چھکا چھک چاندنی تھی۔ اتنے میں چاند بھی بیچوں بیچ جا ٹکا۔ روشی حوض میں پیر ڈالے چھپا چھپ پانی اُڑا رہی تھی۔ پانی کی لہروں کے ساتھ ساتھ چاند اور ستارے بھی جھولا جھول رہے تھے۔ کبھی لہر کے ساتھ اِدھر تو کبھی اُدھر۔ اک دم اُس نے پانی میں سے پیر نکال لئے۔ چھپا کے اُڑانے سے اس کی کاسنی رنگ کی شلوار گھٹنوں تک بھیگ گئی تھی۔ وہ منڈیر پر پاؤں جما کر بیٹھ گئی۔ اور تھوڑی دیر میں پانی ساکت ہو گیا۔ اب چاند اور ستارے ایک جگہ ٹھہر گئے۔ چم چم، چم چم۔ وہ حیرت سے بولی۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا، چاند کا کیا مصرف ہے؟ اگر ان ستاروں کے بیچ چاند نہ ہوتا تو بھی آسمان یونہی جگمگایا کرتا۔"
میں اُسے پانی سے کھیلتے دیکھتے دیکھتے ابھی ابھی بنچ پر لیٹ گیا تھا۔ میں نے وہیں سے

چونک کر پوچھا۔

"روشی! تم نے مجھ سے کچھ کہا؟"

وہ مُڑ کر بولی۔

"نہیں میں کہہ رہی تھی، چاند کی کیا ضرورت تھی بھلا؟"

میں ادھ جلے سگریٹ کو تھامے تھامے اُٹھ بیٹھا۔ حیرت سے اُسے دیکھ کر بولا۔

"چاند کی ضرورت؟ تم اتنی بھولی ہو روشی۔ چاند کی زندگی کا مقصد یہی ہے کہ وہ دوسروں کو روشنی دے۔ جانے اندھیرے راستوں پر بھٹکنے والے کتنے لوگوں کو چاند نے اجالے دیئے ہوں گے۔"

اُس کی دم بدم جلتی بُجھتی نگاہیں مجھ پر ٹھہر گئیں۔

"بس چاند کا یہی مقصد ہے فرحت بھائی؟"

"ہاں اور کیا!" میں ہنس کر بولا۔ "تم بھی تو چاند ہو نا!"

یہ بات تو میں نے یونہی کہہ دی۔ لیکن زرد چاندنی میں میں نے دیکھا کہ وہ یوں لرز کر رہ گئی جیسے ہوا کے تیز جھونکے سے ہلکی پھُلکی ڈالی لرز کر رہ جاتی ہے۔

"ہاں سچ! —— میں بھی تو چاند ہوں!" وہ اجنبی سے لہجے میں پوچھنے لگی۔ "لیکن فرحت بھائی! اگر چاند خود کسی منزل کا تمنّائی ہو تو پھر —— ؟"

میں اور زور سے ہنس پڑا۔

"روشی! تم تو بالکل بچّی ہو۔ عجیب عجیب سی باتیں پوچھتی ہو۔ بالکل جیسے بچّے پوچھتے ہیں نا۔"

اِک دم وہ بپھر گئی۔

"میں بچّی ہوں —— میں بچّی ہوں!" —— وہ تیز لہجے میں بولی۔ فرحت بھائی

مجھے یوں ہی بچی نہ سمجھ لیجئے۔ پورے اٹھارہ سال کی ہو رہی ہوں۔ اور اُس نے یہ کہتے ہوئے اپنے ہاتھوں، پیروں اور جسم کو یوں جھٹکا دیا کہ اس کا سارا بدن زبان بن گیا۔ تنگ تنگ آستینوں کے نیچے اُس کے زرد بازو مچل اُٹھے۔ گیلی شلوار میں، جو اُس کے ٹخنوں اور گھٹنوں سے چپک گئی تھی اس کی پنڈلیاں تھرک اٹھیں۔ لمبی پلکیں جو کبھی نیچے جھک جاتی تھیں تو گالوں پر ایک ساتھ ـــــ صبح شام کا منظر کھنچ جاتا تھا۔ سانپ اٹھیں۔ کہیں سے دو آبدار موتی اس کی آنکھوں میں آ بیٹھے۔ اور وہ ان موتیوں کو سنبھالنے کی کوشش میں گھٹے گھٹے لہجے میں بولنے لگی۔

" فرحت بھائی! سبھی باتیں تو ایسی نہیں ہوتیں کہ انھیں ہنسی میں ٹال دیا جائے۔ آپ کبھی کسی کے دل کو سمجھنے کی کوشش بھی کیا کیجئے۔"

اور وہ زرد چاندنی میں زرد زرد سی مورت یوں دوپٹہ لہراتی چلی گئی کہ میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

بچّوں کے بیچ گھر کر وہ بالکل ننھی بچّی بن جاتی تھی۔ پھر اُسے یہ یاد نہ رہ جاتا تھا کہ وہ بچّی نہ تھی۔ ہنستے ہنستے اُس کے گالوں میں گلابی رنگ کے چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ جاتے تھے۔ دوپٹے میں اپنے سفید سفید دانت اور سُرخ ہونٹ چھپا کر وہ دھیرے دھیرے گنگناتی ہنسی ہنسے جاتی ـــــ اب مجھے خیال ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے اپنے غموں پر پردہ ڈالنے کے لئے ہنسی کا ساتھ ڈھونڈھ لیا ہو۔ ورنہ ایسے دل میں جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہو وہاں منہ پر روشنی کا چراغ کیسے جل سکتا ہے؟ خواہ اُس چراغ کی روشنی زرد ہی کیوں نہ ہو۔

جب گرمیوں میں خنک اور سہانی راتوں میں چاند کے سائے زیادہ روشن ہو جاتے تو ہم لوگ باغ میں جا کر بیٹھ جاتے۔ رات گئے تک بچّے کھیلتے۔ بڑے

باتیں کرتے اور جوان بیکار کے ہنگاموں میں خود کو اُلجھائے رکھتے۔ ایسے میں
روشنی پلاسٹک کے بیگ میں اُون کے گولے ڈالے نٹنگ کرتی رہتی۔
اُس رات کھیلتے کھیلتے بچوں میں سے کسی نے پُکارا۔
" روشنی بجیا! آیئے نا، بھول بھلیاں کھیلیں۔"
روشنی ہر بار کی طرح چونکی نہیں۔ بڑے سکون سے بولی۔
" میں ڈرتی ہوں، ان بھول بھلیوں میں الجھ کر نہ رہ جاؤں۔"
نیلو بڑے پیار سے ہنس کر بولی۔
" آپ بھلا کیسے اُلجھ سکتی ہیں بجیا! آپ کی منزل تو فرحت بھائی ہیں سوچی سمجھی
منزل ـــــ جانے پہچانے راستے، بھلا ـــــ"
سلائیاں پھینک کر روشنی نے نیلو کے مُنہ پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھ دیا۔
" خاموش ہو جاؤ نیلو۔ اپنی زبان سی لو۔ تم تو کچھ بھی نہیں جانتیں۔ بالکل بچی ہو!"
میں دُور سے بیٹھے بیٹھے روشنی کو ستانے کے لئے بولا۔
" بچی تو تم ہو روشنی!"
میں جانتا تھا وہ اُس رات کی طرح الجھ جائے گی۔ اُسے ستا کر کچھ یوں ہی مزہ سا
آتا تھا۔ وہ بڑے کرب سے بولی۔ وہی بے رنگ سا جملہ۔
" میں بچی نہیں ہوں۔ پورے اٹھارہ سال کی ہوں!"
" لیکن میرے لیے تو بچی ہی ہو۔ تم اٹھارہ سال کی ہو اور میں پورے چھبیس سال کا!"
میں ہنستے ہوئے اس کے پاس آیا۔ اور اس کے سر پر پیار اور بزرگی سے
ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔
" چلی بھی جاؤ گڑیا ـــــ بچے تمھارے ساتھ کھیلنے کو بے چین ہیں۔"

اِکدم اپنے گرم گرم ہاتھوں سے اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ کچھ دیر پکڑے رہی پھر دھیرے سے چھوڑ دیا۔ مدھم سی آواز میں وہ زیرِلب بولنے لگی۔

"اگر یہ ہاتھ ــــــ"

جانے وہ کیا کہتی کہ اُس کا گلا رُندھ گیا۔ آواز اُس کے حلق ہی میں گھُٹ کر رہ گئی۔ اُس نے جلدی سے اپنا سامان سمیٹا۔ اور تیز تیز قدموں سے ڈولتی ہوئی یوں چل دی کہ اب گری اب گری۔ اگر میرے دل کی آنکھیں کھلی ہوتیں تو اُسی رات کو سمجھ جاتا، کہ جب روشی آنکھوں میں آنسو لئے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی تو چاند جگمگا رہا تھا پھر بھی سارے میں گہرا اندھیرا کیوں چھا گیا تھا۔ اگر میرے دل کے کان کھلے ہوتے تو میں اسی رات کو سمجھ جاتا کہ مدھم سی آواز میں اُن کانپتے ہونٹوں نے محبت کا ایک دھڑکتا پیغام دیا تھا۔

"اگر یہ ہاتھ میرے سر پہ نہ رکھ کر آپ میرے ہاتھ میں دے دیتے تو ــ تو ــ تو ــ؟"

لیکن وہ خاموش آواز میرے کانوں تک پہنچ ہی نہ سکی۔ میں یہ کیوں بھول رہا ہوں کہ بعض لوگ دنیا میں اسی لئے پیدا ہوتے ہیں کہ آنکھوں سے دیکھنے کی بجائے آنسو بہانے کا کام لیا کریں ــــ!

ایک دن شروع جاڑوں میں جب کہ سردیاں تیز بھی نہ ہوئی تھیں صبح ہی صبح روشی سورج کی زرد کرن کی طرح میرے کمرے میں چلی آئی۔ اس نے ہاتھوں میں کوئی چیز چھپا رکھی تھی۔ سورج کی وہ زرد کرن میرے سرہانے آکھڑی ہوئی جہاں اب تک میز پہ بیڈ ٹی رکھی ہوئی تھی۔

وہ حیرت سے بولی۔

"اب تک آپ نے چائے بھی نہ پی؟"

میں مُسکرا دیا۔

"یونہی رضائی میں سے ہاتھ باہر نکالنا میری جان پر آرہا تھا۔ تم پلادونا!"
اس نے پلٹ موڑ کر الماری کھولی۔ اور کوئی چیز خانے میں رکھ کر میرے قریب آئی۔

اور کپ میرے منہ سے لگادیا۔
"آپ کو بہت سردی لگتی ہے۔"
وہ بچوں کی طرح عجیب معصوم سے لہجے میں بولی۔
"ہاں کچھ ایسا ہی حال ہے۔ دیکھو نا ابھی تو جاڑے شروع بھی نہیں ہوئے ہیں!"
وہ لپک کر الماری میں سے اپنا رکھا ہوا بنڈل نکال لائی اور اسے کھولتے ہوئے بولی۔
"دیکھئے میں نے آپ کے لئے سوئٹر بنایا ہے۔"
کھڑکھڑاتے کاغذوں میں سے زرد رنگ کا سوئٹر نکل آیا۔
مجھے ہنسی آگئی۔
"حد ہے روشی! جب دیکھو تم نٹنگ کرتی رہتی ہو۔ میری مانو تو کوئی دکان کھول لو۔ خوب چل نکلے گی۔"
ہو سکتا ہے اُس نے سوچا ہو میں لپک کر اُس کا تحفہ لے لوں گا۔ اس تحفۂ محبت کو سینے سے لگا لوں گا۔ شکریئے کے طور پر پیار بھری باتیں کروں گا۔ لیکن یہ سب کچھ بالکل نہ ہوا۔ میرے یہ کہنے پر اُس کا چہرہ بھی سوئٹر ہی کی طرح زرد پڑ گیا۔
اکدم وہ غیر متعلق موضوع پر اُتر آئی ——
"کیوں فرحت بھائی! ڈاکٹر لوگ دنیا میں ہر بیماری کا علاج کرتے ہیں؟"
میں نے ایک ڈاکٹر کے سے خاص انداز سے اس کی طرف دیکھا اور ہنس کر بولا۔
"کیوں تمھیں کون سا روگ ہے؟"

" اگر غم کسی بیماری کا نام ہے تو مجھے غمگین رہنے، دُکھی رہنے کی بیماری ہے۔ آپ کے پاس اس کا علاج ہو تو مجھے تندرست کر دیجئے۔"

میں اُس کی طرف غور سے دیکھنے لگا تو وہ بڑی دُکھی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

" میں نے تو یوں ہی سُنا ہے فرحت بھائی! ڈاکٹر لوگ بہت مہربان ہوا کرتے ہیں!"

میں نے مذاقاً کہا۔

" نیند سارے غموں کو، سارے دکھوں کو بُھلا دیتی ہے۔ میں تمھیں خواب آور گولیاں دوں گا۔ انھیں کھا کر تم سو جاؤ گی۔ اور سارے دُکھ بھول جاؤ گی۔"

اُس کا چہرہ اُس لمحے بالکل بے رنگ ہو گیا۔ سُرخ تو کبھی تھا ہی نہیں سفید بھی نہ رہا۔ زردی بھی کہیں کھو گئی۔ وہ ڈوبتے لہجے میں بولی۔

" ہاں میں سو جانا چاہتی ہوں تاکہ سارا دکھ بھول جاؤں۔" وہ اپنے آپ ہی سے جیسے دہرانے لگی ——— "سو جاؤں گی!" ہاں ضرور سو جاؤں گی........

پھر اس نے اپنا چہرہ اُٹھا کر عجیب سے التجا آمیز لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

" آپ مجھے سُلا دیں گے نا؟ سچ میں سو جانا چاہتی ہوں۔"

اتنے میں میں نے سگریٹ سلگانے کے لئے سگریٹ لائٹر ڈھونڈھنا چاہا تو اُس نے لپک کر میرے ہاتھوں میں لائٹر تھما دیا۔ لائٹر کے ساتھ اُس کی دہکتی انگلیاں بھی میرے ہاتھوں میں آ گئیں۔ اس لمحے میں ایک ڈاکٹر بن کر بولا۔

" تمھارا ہاتھ گرم کیوں ہے روشی۔ بخار تو نہیں؟"

" بخار ———" وہ چونک کر بولی ——— " بخار تو بالکل نہیں ہے۔ میرا دل جلتا رہتا ہے فرحت بھائی! اُسی کی تپش میری روح میں رچ بس گئی ہے۔"

مجھے اس پر رحم آ گیا۔

"ہاں روشی! تم نے بہت کم خوشیاں دیکھی ہیں۔ تمھیں اپنی امّی کی یاد بھی تو آتی ہوگی؟"
میری اس بات کے جواب میں جن نگاہوں سے اس نے مجھے دیکھا تھا وہ مجھے آج تک یاد ہیں۔ لیکن اُس وقت میں کچھ نہ سمجھا تھا۔ اور سگریٹ پینے لگا تھا۔
اِکدم وہ چونکی۔ اس نے نیچے گرے ہوئے سوئٹر کی طرف دیکھا اور ذرا سا مُسکرا کر بولی۔
"آپ کو پسند نہیں آیا۔ لیکر چلی جاؤں۔"
میں نے یوں ہی بڑے بے پروائی سے کہا۔
"ارے اب رہنے بھی دو روشی! دی ہوئی چیز واپس نہیں لیا کرتے!"
اُس نے اپنے پتلے پتلے ہاتھوں سے سوئٹر تہہ کیا اور میرے سوٹ کیس میں ٹھونستے ہوئے بولی۔
"ہو سکتا ہے کبھی اسے دیکھ کر آپ کو میری یاد آجائے!"
وہ دبے پاؤں یوں کمرے سے نکل گئی جیسے ہوا کا جھونکا غیر محسوس طور پر نکل جاتا ہے۔

جاڑوں کے بعد گرمیاں آئیں۔ گرمیاں چھُٹّیاں لائیں۔ اور چھُٹّیاں ہنگامے لائیں۔ اب کی گرمیوں میں یو۔پی والی چچی امّاں آئیں۔ چچی امّاں کے ساتھ ان کی بڑی بیٹی رابی بھی آئی —— رابی جس کے گال پھول تھے۔ آنکھیں چمکتے ستارے تھیں۔ ہونٹ گلاب کی پتّیاں۔ بال گھٹائیں۔ قد سرو۔ مجسّم بہار۔ جسے دیکھتے ہی دماغ اور دل میں، زندگی میں بہاریں سی بھر جاتی تھیں۔ گئے سال وہ آئی تھی تو ادھ کھلی کلی تھی۔ اب کھلا ہوا شوخ پھول تھی۔ جو ہوا کے ہلکوروں سے جھونکے کھاتا تو آکر عین میرے دل کے سامنے جھُومنے لگتا تھا۔ پہلے میری آنکھوں میں پسندیدگی کی جھلک تھی۔

اب وہ محبت سے بدل گئی۔ میں نے ہنستے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور اُس پھول کو توڑ کر سدا کے لئے اپنے دل میں چھپالیا۔ بہاروں کو اپنی زندگی میں بھرلیا۔

کاش! وہ بہاریں بہاریں ہی ہوتیں!

اور اُس رات، جب آسمان پر پورا چاند تھا ـــــ مسہری پر رابی جھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ پھولوں سے کمرہ مہک رہا تھا۔ میرے سر اور گلے میں پھول ہی پھول تھے زندگی میں، دل میں، آنکھوں میں، یہاں، وہاں، اِدھر اُدھر ہر طرف خوشبو ہی خوشبو! بہار ہی بہار، اُجالے ہی اُجالے! ـــــ جنوبی دریچہ کھول دینے سے میرے بستر پر چاند کی کرنیں ترچھی ہو کر پڑا کرتی تھیں۔ اُس رات میں نے خوشی سے سرشار ہو کر رابی سے کہا۔

"یہ جنوبی دریچہ کھول دوں؟ جس طرح ہماری زندگی میں اُجالے ہیں اسی طرح آج کمرے میں بھی چاند کو مہمان کیوں نہ کرلیں؟"

میں نے آگے بڑھ کر دریچہ کھول دیا۔

ہوا کی ٹھنڈی ٹھنڈی، ہلکی ہلکی سی لہر آئی اور میری نگاہیں چاند سے جا ٹکرائیں آسمان پر بھی ایک چاند تھا اور زمین پر بھی! ـــــ وہاں روشی کھڑی تھی جو بالکل چاند کی طرح زرد تھی۔ شادی میں سب نے خوب زرق برق کپڑے پہنے تھے لیکن اُس نے ہلکی پھلکی سفید ساٹن کی شلوار، سفید نائلون کی لمبی سی قمیص اور نائلون کا سفید ہی دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ وہ چاند کی زرد روشنی میں زرد رُو پتھر کا بے جان مجسمہ سی دکھائی دے رہی تھی ـــــ پتلے نائلون کی ڈھیلی ڈھیلی لمبی آستینوں میں سے اس کے بازوؤں کی زردی چھن چھن کر اُجالا بکھیر رہی تھی۔ کھڑکی کھلنے کی آواز پر اُس نے سر اُٹھایا۔ اور چونک پڑی۔ مجھے اس سے اس طرح کی حرکت کی توقع نہ تھی لیکن مجھے

دیکھتے ہی وہ لپکی آئی اور نیچے کھڑے کھڑے سر اُٹھاکر مجھے دیکھا۔ جیسے چکور چاند کو دیکھتا ہوگا۔ اور بوکھلائے لہجے میں جلدی جلدی بولنے لگی۔

" فرحت بھائی! آج اکیلے میں میں نے بھول بھلیاں کھیلیں۔ چکر پھیریاں کھاکر میں نے قدم روک کر جو آنکھیں کھولیں تو سامنے، سامنے ــــــ"

اُس کی آواز حسبِ عادت پھر گھٹ گئی۔ وہ کچھ نہ بول سکی۔ اس کا جھکا ہوا سر ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔ بہت دیر بعد بڑی مشکل سے وہ سر اُٹھا کر بولی۔

اگر میں واقعی چاند تھی تو میرا آسمان تو آپ ہی تھے۔ میں نے اپنی ساری روشنی آپ کو دے دی ہے ــــ ہاں ــــ"

میں پیار سے ہنس دیا۔

" ہاں روشی مجھے معلوم ہے تم مجھ سے بہت پیار کرتی ہو۔ تم سبھی سے بہت پیار کرتی ہو۔ بہت پیاری سی گڑیا ہو نا۔"

اِکدم وہ چیخی ــــ " میں پیاری نہیں ہوں، بے حد بُری ہوں ــــ اگر پیاری ہوتی تو ــــ"

اُس نے جملہ اُدھورا چھوڑ کر تیزی سے اپنے ہونٹ دانتوں سے دبا لئے اور آنکھوں میں چمک لاکر بولی۔

" جائیے فرحت بھائی! آج آپ کی شادی کی رات ہے!"

میں نے حیرت سے اُسے دیکھ کر کہا ــــ " شدید غم اور ماں کی محبت سے محرومی نے بے چاری کو کس قدر مظلوم بنا دیا ہے۔!"

زندگی وہی تھی۔ وہی زندہ دلی۔ وہی سرگرمیاں۔ خوشیوں سے بھرپور ہنگامے۔

ایسے ہنگاموں میں کسے فرصت رہتی ہے کہ ایک دوسرے کا حال پوچھے بس اپنے آپ میں مگن !

پکنک، آؤٹنگ، سینما، شاپنگ کے پروگرام اب زیادہ بنتے اور زیادہ چہل پہل رہتی۔ روشی کبھی کبھار ہی ہماری محفلوں میں نظر آتی ـــــ (لیکن یہ بات تو اب یاد آتی ہے۔ اتنی مدت گذر جانے پر) ـــــ خالہ جان کے ساتھ مل کر چُپ چاپ گھر کا کام کرتی، پھر امی کی تیمار داری۔ ان سب کاموں سے فرصت مِل گئی تو وہی اُدن کے لچھے اور وہی الجھاوے۔

رابی اکثر پوچھتی۔

سب تو اس قدر ہنگامے کرتے ہیں۔ یہ روشی یوں ہی چپ چاپ کیوں رہتی ہے!"

پھر تین ماہ بعد میرا لندن جانا طے ہو گیا۔ وہاں سے مجھے ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کی ڈگری لے کر لوٹنا تھا۔ رابی بھلا میرے بغیر کیسے رہ سکتی تھی۔ جب ہم جانے کے لئے تیاری کر رہے تھے۔ سوٹ کیسوں میں کپڑے اور دوسرا الم غلم سامان بھر رہے تھے کہ الماری کے ایک خانے سے وہی زرد سوئٹر نکل آیا۔ رابی نے سوئٹر کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور بولی۔

"کس نے بنایا ہے۔ بہت خوبصورت نٹنگ ہے۔ لیکن جانے کیوں مجھے زرد رنگ اچھا نہیں لگتا۔ اسے دیکھ کر بس خزاں یاد آجاتی ہے جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔"

میں کوٹ تہہ کرتے کرتے بولا۔" روشی نے بنایا تھا۔ زرد رنگ تو مجھے بھی پسند نہیں۔ مگر رکھے لیتا ہوں۔ لندن کی سردی تو مشہور ہے۔ شاید وہاں کام آجائے۔"

میں نے سوئٹر تہہ کر کے سب سے نیچے رکھ دیا۔

جب ہم کار میں بیٹھنے جا رہے تھے تو سارا گھر پورچ میں آ کھڑا ہوا۔ سب کی نم آنکھیں میرا دل توڑ رہی تھیں۔ پائدان پر پاؤں رکھتے رکھتے میں نے امّی کی کمزور سی آواز سُنی۔

" سیدھے بازو پلٹ کر دیکھو بیٹے۔ اللہ تمھیں خیریت سے واپس لائے۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو میری نگاہیں روشی پر جا کر ٹک گئیں۔ وہ اتنی زرد ہو رہی تھی جیسے گیندے کا پھول! جو خزاں کی طرح زرد ہوتا ہے۔ میں نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر غم کو چھپانے کے لئے ذرا سا مُسکرا کر کہا۔

" روشی اور تو سب نے فرمائشیں کی ہیں۔ لیکن تم نے بتایا نہیں کہ تمھارے لئے لندن سے کیا بھیجوں ؟"

اُس کے چہرے پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ اور وہ گنگناتے لہجے میں کچھ بولنے لگی۔

" مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ میں نے تو خود اپنا ہر احساس آپ کو بخش دیا ہے۔"

مجھے یقین ہے اُس دن اُس کے ہونٹوں کی مبہم سی لرزش الفاظ کا جامہ پہنتی تو وہ یہی کہہ سکتی تھی۔

" مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ مجھے تو بس آپ کی تمنّا تھی، نیلے آسمان کی۔ خوشیوں کی، جو مجھے کبھی نہ مل سکیں۔ اب میں آپ سے کون سی فرمائش کروں ؟"

لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔ اور کار زن سے پھاٹک سے باہر نکل گئی۔

لندن میں رابی کے ایک بیٹا ہوا۔ پھر ایک پیاری سی بیٹی۔ سب نے مبارک بادی کے تار، خط بھیجے۔ ٹرنک کال کئے۔ لیکن دونوں بار روشی کی طرف سے کوئی پیام نہ ملا۔ ویسے مجھے امید تھی کہ جب ہم لوگ واپس انڈیا جائیں گے تو سب سے پہلے بڑھ کر

میرے بچّوں کو روشنی ہی گود میں لے گی ۔ بچّوں کی تو وہ دیوانی تھی ۔

بہت دنوں بعد جب میں نے وطن کی، اپنے گھر کی سرزمین پر قدم رکھّا تو گھر میں جس چیز کا مجھے شدّت سے احساس ہوا وہ یہ تھی کہ سارے ماحول پہ زردی سی چھائی ہے ۔ باری باری سب سے مل کر میں نے جب پوچھا ۔

" روشنی کہاں ہے ۔"

پھر کچھ دیر بعد ننّو بولی ۔

" روشنی تو مر گئی !"

" روشنی مر گئی !" ــــ میرا دل دہل سا گیا ــــ لیکن کسی نے بھی تو ہمیں اطلاع نہیں دی ۔"

امّی نے کہا ــــ

اتنی دور رہنے والوں کو ایسے غم کی خبریں سُنا کر پریشان نہیں کیا کرتے ۔"

سوٹ کیس کی تہہ میں پیلا زرد سوئٹر اُچھل کر دھڑکتا ہوا دل بن گیا۔ اور جیسے سرگوشی میں بولا ۔

" ہو سکتا ہے کبھی اِسے دیکھ کر آپ کو میری یاد آجائے !"

" مرتے وقت وہ آپ کو بہت یاد کرتی تھی !"

" مجھے ــــ ؟"

ننّو نے میرے حیرت زدہ چہرے کو گہری اور رحم بھری آنکھوں سے دیکھا اور چُپ رہ گئی ۔

پھر اس رات باغ کے کونے میں بیٹھے بیٹھے ننّو نے اتنی ساری باتیں مجھے بتائیں کہ میں سُن رہ گیا ۔

"روشی آپ سے محبت کرتی تھی!"

"محبّت ــــ ؟ ــــ میں حیرت سے چیخا ــــ محبّت؟ ــــ مجھ سے؟"

"ہاں! جنون کی حد تک۔ لیکن آپ نے کبھی اُسے سمجھنے کی کوشش بھی کی۔ مرنے سے پہلے وہ بالکل زرد ہو گئی تھی۔ ایک دن یونہی مجھ سے کہنے لگی۔

"نمّو! فرحت بھائی نے مجھ سے کہا تھا، چاند کا مقصد دوسروں کو روشنی دینا ہوتا ہے۔ اور وہ مجھے چاند کہتے تھے۔ میں نے اپنی ساری روشنی اُن ہی کو دے دی۔ وہ تو مجھے نہیں چاہتے تھے نا۔ جانتے بھی نہیں تھے کہ کوئی دل ہی دل میں اُنھیں اتنا پیار کرتا ہے۔ اگر میں اُن کی زندگی میں زبردستی داخل بھی ہو جاتی تو کیا ملتا؟ میں نے سوچا، اس سے اچھا تو یہی ہے کہ اپنی زندگی کا اُجالا بھی انھیں کو دیدوں۔ فرحت بھائی وہ سچ مچ زرد چاند ہو گئی تھی۔"

میں پتّھر بن گیا۔

"اس نے مجھے بہت دُکھ سے بتایا فرحت بھائی! ــــ وہ اتنے امیر تھے میں اُن کے دل میں جگہ پا بھی کیسے سکتی تھی۔ میں تو اُن کی مری ہوئی پھوپھی کی غریب سی لاوارث سی لڑکی تھی۔ امّی کا یہی احسان کیا کم ہے کہ انھوں نے اتنی محبّت سے پال لیا۔ وہ مجھے کیسے اپنا سکتے تھے۔ کوئی جوڑ تو ملتا۔ میں نے کئی بار اشاروں ہی اشاروں میں اپنے دل کی بات کہہ سُنانی چاہی۔ وہ سمجھتے ہی نہ تھے۔ ان کے لئے میں ایک دکھ بھری روح تھی۔ جسے اپنی ماں کا غم کھائے جاتا تھا۔ انھیں کیا پتہ تھا میری روح کِن تیروں سے چھدی ہوئی تھی ــــ ؟"

میں نے گھبرا کر نمّو کو دیکھا۔ یہ میرے دل میں اتنے سارے کانٹے کیسے چُبھ رہے تھے۔

" آپ کو یاد ہو گا فرحت بھائی! ایک دن سب بھول بھلیاں کھیل رہے تھے۔ روشی نے پہلے تو اپنی آنکھوں کے سامنے آپ کے کمرے کو پایا۔ دوسری بار گھومی تو پچھواڑے کی طرف اس کا مُنہ تھا۔ جہاں قبرستان پڑتا تھا۔ وہ ہنس کر بولی تھی۔ ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی میری منزل ہو۔"

اُس کی قبر پر ہمیشہ اُداس پیلے رنگ کے پھول بکھرے رہتے ہیں۔

اُس نے مرتے مرتے کہا تھا۔

" مجھے زرد رنگ بہت پسند ہے!"

تو وہ میں ہی تھا جس نے روشی کو سکون کی نیند سُلا دیا۔

ایک بار ایسے ہی اس نے پُوچھا بھی تو تھا۔

" آپ مجھے سُلا دیں گے نا؟"

اتنے دن گذر گئے ہیں۔ زندگی کیسی ویران سی ہو کر رہ گئی ہے۔ گناہ کے احساس کا یہ تیر سدا دل کو چھیدے جاتا ہے کہ محبّت کا قاتل میں ہوں۔ دل میں یہ کیسی خلش ہوتی رہتی ہے۔ ہنسی ہنسی میں مبہم اشارے کرنے والی وہ خاموش خاموش، ڈری سہمی سی لڑکی —— کیا سچ وہ مجھ سے محبّت کرتی تھی؟ —— میں محبّت کی زبان کیوں نہ سمجھ سکا۔ میں تو اُسے سدا ایک بچّی سمجھتا رہا۔ جسے ماں کو پیار نہ ملا اور زندگی نے کوئی خوشی نہ دی —— اب مجھے اس کے مبہم مبہم اشارے یاد آتے ہیں۔ تو محسوس ہوتا ہے کہ ہر اشارہ ایک دردِ داستان تھا۔ پھر یہ داستان میں نے دل کے کانوں سے سُنی کیوں نہیں؟ —— میں سمجھ بھی کیسے سکتا تھا کہ وہ مجھے چاہ سکتی ہے؟ اس صورت میں کہ رانی سے میری شادی ہونے والی تھی۔ میں کیسے جان لیتا کہ وہ میری

آنکھوں میں اُتر آنا چاہتی تھی ـــــ میں کیسے سوچ سکتا تھا ـــ کیسے ـــــ کیسے ـــــ کیسے ـــ؟؟

بہت دنوں بعد جب گُڈّو کی سالگرہ منائی جا رہی تھی ۔ باغ میں بہت سارے لوگ مل کر اودھم مچا رہے تھے ۔ میں یونہی اپنے کمرے میں پڑا زرد گلابوں کو اپنے دل سے لگائے اُن کی اُداس خوشبو سونگھ رہا تھا کہ بچّوں نے آگھیرا۔

پھولوں کے بیچ سب مل کر "بنڈل گیم" کھیل رہے تھے ۔

میری باری پر ایک پرچی میرے نام آئی ۔

" سچ سچ بتایئے ـــــ آپ کس سے محبت کرتے ہیں ـــ سچ سچ ـــــ سچ سچ ـــ!"

باغ میں جتنے کانٹے تھے اُسی دم سب آکر میرے دل میں چبھ گئے اور قطرہ قطرہ لہو دل سے ٹپکنے لگا ۔

" میں کس سے محبت کرتا ہوں ؟ "

میں نے ہر چہرے پر نظر ڈالی ۔

پھسلتی ہوئی نظریں یوں ہی ناکام لوٹ آئیں ـــــ اُن سب کے بیچ وہ زرد چاند کہاں تھا ـــــ وہ سہمی سہمی بڑی بڑی آنکھیں کہاں تھیں ۔ وہ لمبی لمبی پلکیں کہاں تھیں جو گالوں پر جھک جاتی تھیں تو اندھیرے اُجالے گلے مل جاتے تھے ـــــ وہ خاموش خاموش سے ہونٹ کہاں تھے جو سرگوشیوں میں کہا کرتے تھے ۔

میں تمھیں چاہتی ہوں ۔

میں تمھیں چاہتی ہوں ۔

میں تمھیں ـــــ "

" یو لٹل ناٹی ڈیڈی "ـــــ گُڈّو کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی ۔ اور میں نے اپنے دل کو دبوچ لیا ـــــ زرد سوئٹر میرے جسم سے لپٹے لپٹے میرا دل بن کر دھڑکنے

لگا ـــــ دھک دھک ـــــ دھک دھک ـــــ!

میں نے اپنی ویران آنکھیں آسمان پر گاڑ دیں۔

اور کہیں دُور سے بولا ـــــ

"میں چاند سے محبّت کرتا ہوں!!"

یہ ایک اور زرد زرد سا پتّہ میرے سر پر گرا ہے۔

جسے گُڈّو بہار کا نام دیتا ہے۔

اب تو میرا جی چاہتا ہے ساری دُنیا زرد ہو جائے ـــــ یہ آسمان ـــــ یہ چاند ـــــ یہ سورج ـــــ یہ ستارے ـــــ یہ دھرتی ـــــ یہ پھول ـــــ سب کچھ زرد ہو جائے۔ سارے میں زردی چھا جائے ـــــ ایسے ہی کسی پیار بھرے لمحے میں میں چاند کو جا پکڑوں۔ اور دھیرے سے اُس کے کان میں سرگوشی کر دوں۔

"تم میری ہو ـــــ!"

"میں تمھارا ہوں ـــــ!!"

"ڈیڈی! بہار آگئی ـــــ بہار آگئی!"

گُڈّو کی تیز آواز گونج رہی ہے۔

وہ میرے کان میں چیخ رہا ہے ـــــ "بہار آگئی! ـــــ بہار آگئی ـــــ!!"

اور میں سوچ رہا ہوں ـــــ

"کیا اب کبھی بہار آئے گی ـــــ؟؟"

ـــــ * ـــــ

زخمِ دل اور مہکؔ

تم نے کبھی میری آنکھیں غور سے دیکھی ہیں ؟

ان آنکھوں میں تمہیں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی ـــــ ؟ کیا تم نے یہ محسوس نہیں کیا کہ یہ آنکھیں نہیں، ساون کے گھنگھور گھنگھور بادل ہیں ـــــ امڈتی گھمڈتی بدلیاں ہیں جو اب برسیں کہ تب برسیں ـــــ ! کیا تمہارا جی نہیں چاہا کہ ان آنکھوں کو ہنسنا سکھادو ـــــ ؟؟ میں تم سے پوچھ رہی ہوں شہاب ۔ ہاں تم سے ۔ تم جو میری تاریک زندگی کے آسمان پر ایک روشن چاند کی طرح جگمگائے ۔ جس کے وجود سے میری زندگی قوسِ قزح کی طرح رنگین ہوگئی ـــــ لیکن اس حقیقت کو کیسے بھولوں کہ روشن چاند بھی کبھی نہ کبھی اپنی جگمگاہٹ کھو کر تاریکیوں میں روپوش ہوجاتا ہے ـــــ بہاروں سے بھری قوسِ قزح بھی تو اپنی چھب دکھا کر آسمان کی وسعتوں میں گم ہو جاتی ہے ـــــ پھر میری آس کتنی فضول تھی ۔ اور میں خود کتنی بے بس اور نادان تھی جو روشنیوں کو اپنا مقدر سمجھ بیٹھی ـــــ میں اپنی حقیقت بھول گئی تھی کہ میری آنکھیں ساون کا ایک روپ ہیں، اور جو آنکھیں رونے کے لئے بنی ہیں وہ بھلا ہنسنا کیا جانیں ـــــ یہ نین تو وہ نین ہیں شہاب کہ برسنے پر آئیں تو سوکھے جنگل کو ہرا کر دیں ۔ لیکن کیسی بے بسی ہے کہ میں اپنی زندگی کے سوکھے باغ کو اس پانی سے نہیں سینچ سکتی ـــــ کہیں کھارے پانی سے

بھی باغ سینچے گئے ہیں ؟؟ یہ نمک تو ہری بھری ڈالیوں تک کو جھلسا دیتا ہے۔ پھر میں کن بہاروں کی بات کرتی ہوں ——؟؟

آج یہ کیسی دل کو کاٹ دینے والی ہوائیں چل رہی ہیں۔ آسمان اُودی نیلی بدلیوں سے ڈھک گیا ہے۔ ساون کی آمد آمد ہے۔ آج تو خوب رم جھم رم جھم ہوگی مجھے اچھی طرح یاد ہے میری ساری سہیلیاں، میری آنکھوں کو ساون کی بدلیاں کہتی تھیں۔ اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میرا دُکھی دل سدا ذرا ذرا سی بات پر رونے کو تیار ہو جاتا تھا۔ ذرا سی چھیڑ پر میری آنکھیں جھرنے بہانے لگتی تھیں اور چھیڑ چھیڑ میں سہیلیاں میری آنکھوں کی طرف اشارے کر کے کہتیں۔

"ساون آیا رم جھم رم جھم ——"

کسے معلوم تھا سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ ایک دن حقیقت کا روپ دھارے گی اور میری آنکھیں سدا کے لئے ساون بھادوں بن کر رہ جائیں گی —— !

لیکن تم چاہتے تو کیا ان آنکھوں کو ہنسنا نہیں سکھا سکتے تھے ——؟؟ شاید میرے یہ سارے گلے بیکار ہیں۔ قسمت کے آگے ہم کتنے بے بس ہیں —— کس درجہ مجبور —— !

شہاب —— !

بادلوں کا رنگ گہرا قرمزی ہو گیا ہے۔ کوئی دم میں بوندا باندی شروع ہو جائے گی —— جانے آج کتنا جل تھل ہونے والا ہے —— لیکن ذرا میرے دل میں جھانک کر دیکھو۔ تمھیں کیا معلوم آج کس قیامت کی رم جھم مچی ہے —— آج میرے دل کی دُکھن کا وہ عالم ہے کہ یہ آنکھیں ساون تو کیا سمندر کی طرح بہیں تو بھی دل چین نہ پا سکے گا۔

———✣———

میری داستانِ غم اُس دن سے شروع ہوتی ہے، جس دن تم نے میری طرف پیار سے بھری ایک نگاہ ڈالی تھی۔ پیار تو وہ انمول بیج ہوتا ہے جو سوکھے صحرا تک میں گلزار کھلا دیتا ہے۔ لیکن تمھاری نگاہ وہ نگاہ تھی جو ہری بھری کھیتی کو پالا مار گئی —— شاید مجھ ہی میں اس نگاہ کو سہہ جانے کی تاب نہ تھی یا پھر کون جانے کہ نصیب نے ہر ظلم میرے ہی ساتھ روا رکھا تھا۔

تمھیں یاد ہوگا، ہمارا خاندان مشترکہ فیملی سسٹم کے تحت ایک ہی بڑی سی کوٹھی میں رہا کرتا تھا —— اتنے سارے لوگ —— اتنے سارے جانے پہچانے چہرے۔ لیکن پتہ نہیں میری دُکھوں کی ماری روح ایسے ہرے بھرے اور دل پرچا لینے والے ماحول میں بھی خود کو کیوں تنہا تنہا سی محسوس کرتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں بچپن ہی سے اپنے اَبّو کی بے پناہ شفقت سے محروم ہو چکی تھی۔ اور اس پر ستم یہ کہ خرابیٔ صحت کی وجہ سے میری تعلیم بھی ادھوری رہ گئی تھی۔ جس کا میرے دل پر بہت گہرا داغ تھا —— صبح ہی صبح جب کوٹھی کی ساری لڑکیاں نیلی نیلی یونیفارم پہنے بسوں اور کاروں میں کانونٹ اور کالجوں کو جاتیں تو میرا دِل کٹ کٹ جاتا —— میں نے کتنی بار ممّی سے کہا کہ میں کم سے کم سینئر کیمرج یا میٹرک ہی کر لوں لیکن میں خود آزما چکی تھی کہ جہاں میں نے کتاب اٹھائی، چند ہی صفحے پڑھنے کے بعد میری آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگتا۔ نیچے دیکھتے دیکھتے سر بھنّانے لگتا اور سر میں درد ہونے لگتا —— تنگ آ کر میں نے اپنی توجہ خانہ داری کی طرف پھیر لی —— جاڑے آتے تو میں گھر بھر کے بچّوں کے لئے سوئٹر، موزے، ٹوپیاں بنتی۔ برسات سے پہلے ڈھیروں فلالین، اونی کپڑے خریدے جاتے اور میں سب کے لئے گرم کپڑے تیار کرتی —— گرمیوں کے دنوں میں میں موتیا کے پودوں

کی سینچائی کرتی ــــــ ساری کوٹھی میں گھوم گھوم کر ہر ایک کے کمرے کی خبر لیتی کہ خس کی ٹٹیاں لگی ہیں یا نہیں۔ کوری صُراحیاں اور مٹکیاں، موتیا کے گجروں سے سنواری گئی ہیں یا نہیں ــــــ ؟ یہ کام بظاہر چھوٹے چھوٹے تھے لیکن میرا دل بہلا رہتا۔ ــــــ گرمیاں شروع ہوتیں تو سب لڑکے علی گڑھ سے چھٹیاں گزارنے گھر آجاتے اور کوٹھی میں ایک ہلچل سی مچ جاتی۔ ہماری مشترکہ فیملی کے سرپرست خالو ابا تھے جنھیں تعلیم کی خاطر لڑکوں کو علی گڑھ اور لکھنؤ بھجوانے کا خبط تھا۔ لڑکوں کے آتے ہی میری مصروفیت کا دور شروع ہو جاتا۔ کوئی ہوسٹل کے کھانوں سے اُکتا چکا ہوتا تو نئے نئے پکوانوں کی فرمائش ہونے لگتی ــــــ کسی کی قمیصوں کے ٹوٹے ہوئے بٹن ٹانکنے پڑتے ــــــ پھر گرمیاں ختم ہونے کی تیاری مجھے ابھی سے کرنی پڑتی کہ برسات کے لئے کون کون سے گرم کپڑے ساتھ جائیں گے۔ کس کے ساتھ کون سا رنگ میچ کرے گا ــــــ پھر ان مرحلوں سے گزر کر جو پڑھائی سے اُکتائے ہوئے دل ہوتے تو نت نئی تفریحوں میں لگ جاتے ــــــ تاریخی مقامات کی سیر، پکنک، وہ وہ ادودھم مچتا کہ توبہ ــــــ ایسے موقعوں پر جو کھانے ساتھ لے جائے جاتے وہ میرے ہی ہاتھوں تیار ہوتے۔ ویسے بھی مشترکہ زندگی کی مصروفیات اور کام کچھ کم ہوتے ہیں ــــــ !؟ جب سب لوگ کوٹھی سونی کر کے آؤٹنگ کو چلے جاتے تو میں کالجوں سے آئے ہوئے علی گڑھ اور لکھنؤ والوں کی کتابیں ٹٹولنے لگتی ــــــ میری خوشیوں کے وہ لمحات کتنے عظیم ہوتے۔ لیٹے لیٹے میں کتنا سارا فکشن پڑھ ڈالتی ــــــ مطالعہ کتنا پیارا شغل ہے۔ جیسے نئی جنّت کے دروازے ایک ایک کر کے مجھ پر کھلتے جاتے اور تعلیم نہ ہونے کا وہ غم جو میری روح کا ساتھی بن چکا تھا دھیرے دھیرے جیسے مٹتا جاتا۔

ایسے ہی دنوں میں سے ایک چمکیلے دن کی بات ہے۔ تم سب صبح سے کاروں میں بھر کر باہر گئے ہوئے تھے۔ میں صبح سے اپنے کمرے میں لیٹی لیٹی ہارڈی کا ایک غم انگیز ناول پڑھنے میں لگی ہوئی تھی۔ دل پر غم کی ایک تہہ سی جمی تھی کہ ایسے میں ماحول بھی بڑا ظالم ہو گیا ——— کبھی کبھی گرمیوں میں بھی بارش کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں اور اس لمحے چمکیلا اور نیلا آسمان کس طرح مٹیالی بدلیوں سے ڈھک جاتا ہے ——؟ اور زمین پر بارش کا پہلا چھینٹا پڑتے ہی پیاسی زمین سے کیسی سوندھی سوندھی خوشبو کی ایک مہکار سی اُمڈنے لگتی ہے! —— اُس دن یہ سب کچھ بالکل ایک افسانوی ماحول میں ہوا اور اچانک ہی موٹی موٹی بوندیں برسنے لگیں۔ اور اُسی لمحہ ایک ایک کر کے تینوں کاریں کوٹھی میں داخل ہو گئیں۔ پورا ہجوم سیدھا ہی میرے کمرے میں گھس آیا اور سعیدہ باجی نے میرے ہاتھ سے کتاب پرے پھینکتے ہوئے کہا۔

"حد ہے تم بھی بڑی ان رومانٹک لڑکی ہو۔ ایسے موسم میں بھلا پڑھنے کی کوئی تک ہے۔ ایسا موسم تو گرم گرم کافی اور چائے کے ساتھ تفریح کا مطالبہ کرتا ہے!"

میں ایک دکھی مسکراہٹ کے ساتھ بولی ——— "اصل میں ناول اتنا دلچسپ تھا' میں یوں کھو گئی کہ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ ویسے بھی شام کی چائے کا وقت تو آ ہی گیا ہے' بس ایک صفحہ رہ گیا ہے اسے پڑھ ڈالوں ——"

شمیم نے ایک تیر چلایا۔ جو سنسناتا ہوا آیا اور سیدھا میرے دل میں ترازو ہو گیا۔

"ہاں! اب ایک صفحہ پڑھ لو گی تو جیسے گریجویٹ ہی تو ہو جاؤ گی ——"

میں نے تڑپ کر شمیم کی طرف دیکھا۔ لیکن ایسے موقعے پر زبان کب ساتھ دیتی ہے ——؟ آنسو بھی تو اپنی ایک زبان رکھتے ہیں —— ! بس زندگی کا

وہی ایک لمحہ ایسا تھا جس نے مجھے زمین کی پستیوں سے اُٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر بٹھا دیا۔ تم نے شمیم کو بُری طرح گھورا ـــــ اور اُنہی نگاہوں سے، جن میں شمیم کے لئے زہر بھرا تھا، میری طرف دیکھا جو امرت اور محبت کے شہد سے لبریز تھیں!

سعیدہ باجی نے ہنس کر ماحول کی کثافت کو دھونا چاہا اور بولیں۔ "شہاب! تم نے کبھی گرمیوں میں ساون کے بادل جھومتے دیکھے ہیں ـــــ؟"

شہاب اُس وقت تم نے مجھے جس نگاہ سے دیکھا تھا وہ میری داستانِ حیات کا سب سے سنہرا باب ہے ـــــ جی چاہا اُسی ایک لمحے میں مرجاؤں کہ ممکن ہے کہ اس کے بعد اتنی بھرپور خوشی جیون میں کبھی نہ ملے ـــــ لیکن میں مر نہ سکی۔ اس لئے کہ مجھے تو تمھارے دامن میں بھرے ہوئے خوشیوں کے اور بھی پھول سمیٹنے تھے ـــــ اور غم ہے کہ اُس واردات کے بعد میں جی بھی نہ سکی ـــــ یوں بظاہر جینے کو جیتی رہی اور دیکھنے والوں نے تو یہی دیکھا کہ زندہ ہوں لیکن محبت میں سب کچھ ہار دینے کے بعد زندگی کوئی زندگی رہ جاتی ہے ـــــ؟؟

اُس رات جب سب سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں جاچکے تھے، تم بے دھڑک میرے کمرے میں چلے آئے ـــــ "شہاب! ـــــ تم ـــــ؟" میں سہم کر بولی ـــــ "اتنی رات گئے؟"

تم نے بے حد بے باکی سے کہا ـــــ "کیوں کیا میں کسی سے ڈرتا ہوں ـــــ؟ اور کیا میں کسی بُری نیت سے آیا ہوں جو ڈرتا پھروں ـــــ" پھر تم نے بڑی اپنائیت سے میرا ہاتھ تھام کر کہا تھا ـــــ "سُنو شہلا! یہ پَل پَل کی برسات مجھے پسند نہیں۔"

"اُوں ـــــ" میں نے سر اٹھا کر بہت حیرت سے تمہیں دیکھا۔

"یہ تم بار بار روتی کیوں ہو ـــــ؟ کیا اس لئے کہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہو؟

کیا اس لئے کہ تمہارے ابّو نہیں ہیں ——؟ لیکن ان سب باتوں کے نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے شلّو! —— میں جو ہوں تمھارے لئے ——!" یہ کیسی بہار چھا گئی۔ —— ؟ یہ بن بادل رم جھم کہاں سے ہونے لگی ——؟ یہ جہنم میرے لئے جنّت کیسے بن گیا —— ؟ یہ الفاظ کیسے ہیں؟

میں جو ہوں تمھارے لئے ——

میں جو ہوں تمھارے لئے ——

میں جو ہوں ——

شہاب کہہ رہا تھا —— "شہلا! تم وہ سچّا ہیرا ہو، جسے کوئی ماہر جوہری ہی پرکھ سکتا تھا اور یقین کرو شہلا تمھیں مجھ سے زیادہ، مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں پرکھ سکتا۔ میں جانتا ہوں تم میٹرک بھی پاس نہیں ہو۔ لیکن تمھارے مینرز، تمھارا سلیقہ، تمھارا رکھ رکھاؤ اتنا اونچا ہے کہ ایم۔ اے پاس لڑکیاں بھی تمھارے سامنے ہیچ ہیں —— میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سب سے کم دولت تمھاری امّی کے پاس ہے۔ لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ تم سی لڑکی کی ماں ہو کر وہ کوٹھی کی سب سے دولت مند خاتون ہیں۔ مجھے پتہ ہے کوٹھی میں حسین لڑکیوں کی کمی نہیں۔ لیکن تمھارا یہ ملاحت بھرا چہرہ، یہ سانولے رخسار، یہ سانولے ریشمیں گھٹاؤں ایسے لانبے لانبے بال، اور تمھاری یہ ہر دم جھکی جھکی رہنے والی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں یقیناً ایسی ہیں کہ تمھیں سب سے نمایاں کر سکیں۔" وہ ذرا رکا اور جھک کر بولا —— "مجھے یقین ہے تمھیں پانے والا شخص دنیا کا سب سے خوش نصیب شخص ہوگا ——"

میں نے گھبرا کر آنکھیں اُٹھائیں —— وہ بڑی بے نیازی سے کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ ایکدم وہ پلٹا اور بولا —— "پلیز —— یُوں رویا نہ کرو شلّو ——

میرا دل ٹوٹنے لگتا ہے۔"

کہیں سے بکھری بکھری ہنسی میرے ہونٹوں پر آ کر سمٹ گئی ــــ "شہاب! تم سمجھتے ہو آنسو بھی کسی کو بھلے لگتے ہیں؟"

"لیکن ہر درد کا مداوا بھی تو ہے۔"

"ہر درد کا مداوا ــــ ؟ اب تک تو یہی ہوا ہے شہاب کہ پھولوں کی لگن میں جب بھی میں نے ہاتھ بڑھایا ہے سدا کانٹے ہی ہاتھ آئے ہیں۔"

"اب سے یوں کرنا کہ کانٹے سدا میرے دامن میں ڈال دیا کرنا اور پھولوں سے اپنا آنچل بھر لیا کرنا ــــ"

میں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ شہاب کے ہونٹوں پر رکھ دیا ــــ

"خدا نہ کرے شہاب ــــ خدا نہ کرے ــــ ایسی بدفال منہ سے نہ نکالو ــــ میں تو یہ دعا کروں گی کہ تمھارے پیروں میں چبھنے والا ہر کانٹا میرے دل میں چبھ جائے اور تمھاری راہیں سدا پھولوں سے ڈھکی رہیں ــــ"

"نہیں میری جان ــــ میں قسّام ازل سے سارے اندھیرے اپنے لئے مانگ لوں گا اور تمھارے لئے صرف روشنیاں ہوں گی۔ بھرپور اُجالے۔"

میری جان ــــ

میری جان ــــ

میری جان ــــ

میں کٹی ہوئی ڈالی کی طرح کانپ کر بستر پر گر پڑی ــــ میں یہ خوشی سنبھال پاؤں گی ــــ میں ــــ میں ــــ ؟ مر تو نہیں جاؤں گی ــــ میں نے کانپ کر سوچا ــــ جانے شہاب کب میرے کمرے سے نکل کر جا چکا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ

میری نیند بھی ـــــ اُس رات میں نے خوشیوں میں ڈوب کر رت جگا منایا۔
میں مرنا نہیں چاہتی۔ میں آنے والی خوشیوں کے لئے جینا چاہتی ہوں۔ میں شہاب کے لئے جینا چاہتی ہوں ـــــ میں ـــــ میں ـــــ!

آنسوؤں سے میرا تکیہ بھیگ گیا۔ سنہرے رنگوں سے کڑھے ہوئے پھول نئے نُودے اُٹھے ـــــ میری زندگی صبح کے اُجالوں سے جگمگا اُٹھی۔

اتنی بے پایاں خوشی کیسے سنبھالوں ـــــ؟ جی چاہتا تھا چیخ چیخ کر ایک ایک کو سُناؤں ـــــ چاند کے کان میں سرگوشی کروں۔ تاروں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ دوں۔ بہاروں کو، پھولوں کو، پتّوں کو، ساری دنیا کو رازدار کر لوں کہ دیکھو مجھے کیسی مار ڈالنے والی خوشی مل گئی ہے ـــــ جی چاہتا تھا ایک جشنِ بہار مناؤں۔ مگر۔ مگر ـــــ میں نے رُک رُک کر، سہم سہم کر سوچا ـــــ "اگر میری خوشیوں کو نظر لگ گئی تو ـــــ؟؟"

یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ اس حسین واردات کے دو دن بعد میری سالگرہ تھی ـــــ ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ میں نے سوچا ـــــ مجھے سالگرہ منانی ہی چاہئے ورنہ یہ خوشی اگر دل ہی دل میں رہ گئی تو میں شاید سہہ نہ سکوں گی۔ مر ہی جاؤں گی ـــــ ہماری کوٹھی کے آس پاس اور بھی کئی بنگلے تھے جہاں میری کتنی ہی بچپن کی پیاری پیاری سہیلیاں بھی تھیں ـــــ پھر گھر کے اتنے سارے لوگ ـــــ ہاں یہ موقع اچھا ہے۔ لیکن آج تک تو میں نے آپ اپنی سالگرہ کبھی نہیں منائی۔ اب یہ کتنی شرم کی بات ہو گی کہ میں اپنے آپ اعلان کرتی پھروں کہ میں اپنی سالگرہ منا رہی ہوں ـــــ!؟

اِس مشکل کو شہاب نے حل کر دیا ــــ جانے اسے کیسے پتہ تھا کہ میری سالگرہ کی تاریخ ۸ مئی پڑتی ہے۔ اس دن کھانے کی میز پر رات کے وقت اس نے سب کے سامنے اعلان کر دیا۔

"بھئی پرسوں شہلا کی سالگرہ منائیں گے۔"

شمیم نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن کس خوشی میں؟"

"کس خوشی میں ــــ!؟" شہاب حیرت سے نوالہ ہاتھ میں تھامے بولا ــــ "کیا یہ خوشی کی بات نہیں کہ پرسوں شہلا کی زندگی کے گلستاں میں اٹھارواں پھول کھلے گا ــــ!؟"

ذاکر بھائی بولے ــــ "اور یُوں بھی ہم پردیسیوں کی زندگی میں ایسے ہی بہانوں سے تو ذرا چہل پہل ہو جاتی ہے۔ ورنہ ہم اور ہوسٹل کی بے کیف زندگی ــــ شمیم زچ ہو کر بولی ــــ " تو میں کب منع کرتی ہوں ــــ شوق سے منایئے ــــ"

اور وہ دن میری زندگی کا یادگار دن تھا۔ جب میری آنکھوں نے جواب تک صرف ساون کے بادلوں کی طرح برسی تھیں، جی کھول کر ہنسنا سیکھا۔ میرے لئے ــــ یہ سب کچھ اتنا نیا نیا اور عجیب عجیب سا تھا ــــ! لیکن میں خوش تھی۔ بے انتہا خوش! ــــ احساس کمتری اور غم کا وہ ناگ جو رہ رہ کر آج تک میرے انگ انگ کو ڈستا آیا تھا، اپنا پھن جُھکا کر کہیں روپوش ہو گیا تھا ــــ تحفوں سے میری سامنے والی میز بھر گئی۔ سبھی نے کچھ نہ کچھ دیا۔ لیکن شہاب یونہی خالی ہاتھ بیٹھا رہا۔ کسی نے ٹوکا بھی تو وہ ٹال گیا۔ لیکن مجھے قطعاً غم نہ تھا ــــ جو اپنا دل ہی دے دے، اُس سے اور کون سے تحفے کی آس کی جا سکتی ہے ــــ دل، جو زندگی اور زندگی کی ہر خوشی سے عبارت ہوتا ہے۔ وہ تو میرا تھا نا ؟

رات گئے ایک مانوس خوشبو میرے کمرے میں مہکی اور میرا رُواں رُواں کہہ اٹھا، یہ تم ہو ــــ یہ تم ہو شہاب ــــ میری زندگی کی سب سے زیادہ عزیز ہستی۔ وہ نام جسے سُن کر دل عقیدت سے بھر جاتا ہے۔ وہ مہک جسے سُونگھ کر زندگی بہاروں کا روپ بن جاتی ہے ــــ میں کیسے اِس آہٹ، اِس مہک، اس خوشبو کو نہ پہچانوں گی ــــ ؟؟

کمرے کا دروازہ کھُلا اور شہاب اندر داخل ہوا جیسے عبادت خانے میں دیوتا کی موجودگی سے دل ایک انجانے خوف اور عقیدت سے دھڑک اٹھتا ہے۔ ایسے ہی یکبارگی میرا دل دھڑک اُٹھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھنا چاہا لیکن اتنی قوت مجھ میں کہاں تھی؟ رات کی خاموشی میں دو سانسیں تھیں جو ایک ہی تال اور ایک ہی لَے پر چل رہی تھیں۔

میں جو ہوں تمہارے لئے ــــ

میں جو ہوں تمہارے لئے ــــ

بڑی دیر بعد شہاب نے دھیرے سے پکارا ــــ "شِلّو!"

میں نے ساری دنیا کا بوجھ لئے بڑی مشکل سے پیچھے گھوم کر دیکھا اور دوڑ کر شہاب کے قدموں میں گر گئی۔

"ارے ارے شِلّو ــــ یہ کیا کرتی ہو ــــ؟" اس نے ایک ہاتھ سے سنبھال کر مجھے اُٹھایا، دوسرے ہاتھ میں ایک خوبصورت سی ٹوکری تھی جسے وہ میرے سامنے کر کے بولا۔

"یہ تمہاری سالگرہ پر ایک حقیر تحفہ۔"

میں نے سنبھل سنبھل کر ٹوکری کھولی ــــ تازہ تازہ خوش رنگ گلاب۔ کمرہ خوشبوؤں سے بھر گیا۔ میں نے سر اُٹھا کر شہاب کو دیکھا اور رُکتے رُکتے بولی۔

"یہ پھول ـــــ!"

شہاب نے بات کاٹ دی ـــــ "مرجھا جائیں گے۔ لیکن تمھاری محبت کا سجایا ہوا پھول میرے دل میں سدا ترو تازہ رہے گا۔"

میں نے پھولوں کو دھیرے سے اٹھایا ـــــ ایک لڑی میں پروئے ہوئے اٹھارہ بڑے بڑے شگفتہ گلاب ـــــ میں نے ایکدم انھیں اپنے دل سے لگالیا ـــــ

"یہ تمھاری امٹ محبت کے امین ہیں شہاب ـــــ میں زندگی بھر ان پھولوں کی حفاظت کروں گی ـــــ یہ تمھاری ہی نہیں میری بھی وفا کے امین ہیں ـــــ" ٹپ سے دو آنسو میری پلکوں سے ٹپکے اور گلاب کی صبیح پتیوں پر سچے موتیوں کی طرح جگمگانے لگے ـــ

شہاب دھیرے سے آگے بڑھا۔ اس نے میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر تھام لیا ـــــ جانے کتنے لمحے یونہی گزر گئے۔ کون جانے وہ صدیاں ہی ہوں ـــــ مجھ میں یہ تاب کہاں تھی کہ شہاب کو اتنے قریب دیکھ سکتی۔ بس اُس کے سانسوں کی تپش تھی جو میرے چہرے پر صبح کے سورج کے نرم نرم اُجالے کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بھاری مگر سنبھلی ہوئی آواز میں بولا ۔

"آج تم مجھ سے اتنی قریب ہو کہ کوئی فاصلہ حائل نہیں۔ کوئی رکاوٹ کوئی چٹان ہمارے درمیان نہیں ۔ میں چاہوں تو تمھاری ان خوابناک آنکھوں کو چوم لوں۔ لیکن تم جانتی ہو شہلا ، محبت میں پاکیزگی میرے لئے سب سے پہلی شرط ہے۔ جب میں جانتا ہوں کہ تم میری ہو اور میں تمھارا ـــــ تو پھر ایسی امٹ محبت کے لئے میں کسی جھوٹی مہر کا سہارا کیوں لوں ـــــ ؟؟"

اُس نے ہاتھوں کے پیالے کو دھیرے دھیرے میرے چہرے سے الگ کیا تم اور الٹے قدموں چلتا ، یوں کہ جیسے میں کوئی دیوی تھی اور میری طرف پیٹھ کرنا گناہ ۔ دھیرے

دھیرے کمرے سے باہر ہوگیا۔

اب کی بار شہاب لکھنؤ گیا تو میں اس طرح ٹوٹ کر روئی جیسے سب کچھ آنسوؤں میں بہہ کر رہ جائیگا ــــ سب کے سامنے رونا بھی تو ناممکن تھا۔ بس میں تھی اور میرا کمرہ ــــ ممّی کو میری صحت کی فکر کھانے لگی کیونکہ کچھ ہی دنوں میں میرا وزن اتنا کم ہوگیا کہ چلتے چلتے کئی بار مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ہوا کے دوش پر اڑنے لگوں گی۔ ممّی مجھے طاقت بخش غذائیں اور ٹانک لینے کو کہتیں۔ اور میں دل ہی دل میں ہنس کر سوچتی ــــ "ممّی آپ نے کسی بیمارِ محبّت کو دواؤں سے صحت یاب ہوتے دیکھا ہے ــــ؟"

ایک طرف تو مجھے شہاب کی جُدائی کا غم مارے ڈالتا تھا۔ دوسری طرف ایک اور ہی فکر میرا خون پی رہی تھی۔ کیونکہ اپنی اپنی جگہ سبھی جانتے تھے کہ شہاب کی منگنی شمیم سے ہونے والی ہے۔ دیکھا جائے تو بڑا مناسب جوڑ تھا۔ شمیم بہت خوبصورت تھی۔ بی۔اے میں پڑھ رہی تھی۔ اور سونے پر سہاگہ ماموں جان کی بے اندازہ دولت کی تنہا مالک۔ اس کا تو ہر غرور جائز اور ہر جذبہ بجا تھا ــــ لیکن میں اس دل کا کیا کرتی جو برسوں سے چپکے چپکے شہاب کو چاہے جا رہا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ کبھی شہاب کی طرف سے پیش قدمی نہ ہونے پر میرے دل کا راز مجھ ہی تک رہا۔ لیکن اب جبکہ وہ اور میں دونوں ہی جانتے تھے کہ ہم صرف ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں، یہ بیل کیونکر منڈھے چڑھ سکتی تھی ــــ؟ پھر بڑی بات یہ کہ شہاب خالو ابا کا بیٹا تھا جن کے حکم سے کوٹھی کا ہر کام چلتا تھا ــــ شہاب کی محبّت کی خوشی کا بوجھ اور مستقبل کی فکروں کا کرب ــــ! میں چکّی کے دو پاٹوں کے بیچ بُری طرح پس رہی تھی۔ انسان جب جی ہار بیٹھتا ہے تو سب کچھ خدا پر چھوڑ دیتا ہے۔ میں نے بھی یہ سوچ کر کہ خدا میری بہتری کا سامان کرے گا، سب کچھ اپنے مالک پر چھوڑ دیا۔

دن تو خیر جیسے تیسے گزر ہی جاتا، رات اپنے دامن میں ہزار وسوسے لے کر آتی ان دنوں میری آنکھیں کتنی بے خواب رہتیں ـــــ؟ میں نے کتنے چاندوں کی میتیں دفنائیں، میری آنکھوں نے کتنے ستاروں کے جنازے اٹھائے ـــــ؟ ایک ایسے ہی رلا دینے والے دن میں نے بے بسی سے شہاب کو مخاطب کر ہی لیا ـــــ

"میرے شہاب! ـــــ تم مجھ سے اتنے دور ہو کہ کبھی کبھی مجھے ڈر لگتا ہے کہ اس جنم میں تمھیں پا ہی نہ سکوں گی ـــــ پھر ایک موہوم سی آس مجھے جینے پر آمادہ کر دیتی ہے کہ تمہارے وعدے اتنے بھرپور تھے کہ مجھے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ خدا کرے تم جلد لوٹو تاکہ میں پھر کبھی تم سے جدا ہونے کی بات سوچ بھی نہ سکوں ـــــ یہ خط لکھتے ہوئے میں کتنی ڈر رہی ہوں ـــــ کہیں بات کھوٹ گئی تو؟ ـــــ لیکن شہاب مجھ سے اب کچھ بھی برداشت نہیں ہو سکتا۔ کئی بار تو خودکشی کر لینے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن اُن دنوں کی تصویر ذہن میں اُتر آتی ہے کہ تم تھکے تھکائے ڈسپنسری سے لوٹے ہو تو میں تمھارے جوتوں کے بند کھول رہی ہوں، تمھارا کوٹ اتار کر ہینگر سے ٹانگ رہی ہوں، تمھارے بچے رو رہے ہیں تو انھیں بہلا رہی ہوں، لوریاں دے کر سُلا رہی ہوں۔ سب کاموں سے نمٹ کر تم اور میں کار میں آؤٹنگ کو جا رہے ہیں ـــــ یہ خواب ہر عورت دیکھتی ہے شہاب! ـــــ میں نے بھی دیکھے ہیں۔ اور ان خوابوں کو حقیقت میں بدلتا دیکھنے کی امید ہی میں مَیں جی رہی ہوں۔

خدا کرے میں تمھاری یادوں میں ہمیشہ محفوظ رہوں ـــــ زندگی میں اس سے بڑی کوئی خوشی نہیں کہ تم مجھے یاد رکھو ـــــ پیار کے ساتھ تمھاری صرف تمھاری"۔

مجھے پتہ نہیں اس خط کے الفاظ نے شہاب پر کیا اثر کیا ـــــ لیکن اس کے

جواب میں شہاب نے جو خط مجھے لکھا تھا اُس کا محض ایک جملہ ہی میری زندگی بھر کی خوشیوں کا سامان بن گیا۔

" میری جان! — اگر مجھے گناہ کا احساس نہ ہوتا تو یقین کرو میں حیدرآباد کے ان درودیوار کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے میں اپنی عاقبت بخیر سمجھتا جن میں تم رہتی بستی ہو —!! "

مجھے زندگی میں اور کیا چاہیئے تھا؟ میں کتنی خوش نصیب تھی اس کا اندازہ تو کچھ شہاب کا خط پڑھنے پر ہوا۔

اور وہ دن — جب شہاب نے پورے میڈیکل کالج میں ٹاپ کیا۔ سب کتنے خوش تھے۔ اور میں؟ — میں تو گویا آسمان کی سب سے بلند نشست پر جا بیٹھی تھی۔ جب لکھنؤ سے تار آیا ہے کہ " اب میں ڈاکٹر بن چکا ہوں " — وہ دن میری خوشیوں کی معراج تھا — سوچتے سوچتے میں پاگل سی ہو گئی — اب شہاب کے اور میرے ایک ہو جانے میں کون کسر باقی تھی — ؟؟ شہاب لکھنؤ سے ڈاکٹر بن کر لوٹا تو مجھے یاد ہے، کامیابی اور نئی زندگی کی مسرتوں سے اُس کا چہرہ آبدار موتی کی طرح جھل مل کر رہا تھا — ظاہر ہے اس کے آتے ہی شادی کی بات چھیڑی۔ لیکن مجھ سے نہیں شمیم سے — شہاب نے بڑی خوبصورتی سے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ جو تین لڑکے اعلیٰ نمبر لے کر کامیاب ہوئے ہیں ان میں سر فہرست شہاب کا نام ہے اور حکومت اُن لڑکوں کو فارن بھیج رہی ہے اس لئے شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا — ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری خوشیوں کے چمن میں ہر سو آگ ہی آگ پھیل گئی ہے اور ہر پھول پتہ اس آگ میں جُھلسا جا رہا ہے — لیکن

بہتے آنسوؤں کو قرار بس یہ سوچ کر آیا کہ اگر وہ میرا نہیں ہوسکتا تو کسی اور کا بھی تو نہیں ہو رہا ہے ـــــ میں کیسے اُسے کسی کا ہوتے دیکھ سکتی ـــــ ؟ مجھے تو اس دُھوپ سے بھی جلن محسوس ہوتی تھی جو شہاب پر سے ہو کر گزرتی تھی۔ میں ہوا کے اُس جھونکے سے بھی رقابت محسوس کرتی تھی جو شہاب سے اٹکھیلی کرتا گزر جاتا تھا۔ جب میرے عشق کا یہ عالم تھا تو میں کیسے اس نگاہ کو برداشت کر سکتی تھی جو شہاب کو پیار سے ایک لمحے کو بھی دیکھ لیتی!!

نہیں نہیں۔ شہاب میرا ہے ـــــ صرف میرا ـــــ !

دردِ غم مجھ پر ایک ساتھ ٹوٹے ـــــ جس سال شہاب لندن گیا، اُسی سال ممی بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئیں ـــــ شہاب سے ملنے کی، اُس کی واپسی کی تو ایک آس تھی۔ ممی وہاں گئیں جہاں سے آج تک کوئی لوٹ کر نہیں آیا ہے ـــــ اِس غم نے مجھے زندگی سے بیزار کر دیا۔ اب اِس بھری پُری دُنیا میں مَیں تنہا ہوں ـــــ ایک شہاب ہے جس کی آس پر زندگی کٹ رہی تھی لیکن اب تو وہ بھی اتنی دور تھا جہاں پہنچنے کے لئے تصوّر کے پر بھی جل جل جائیں ـــــ شہاب نے جاتے وقت جو الفاظ کہے تھے وہی میری زندگی کا سرمایہ تھے ـــــ "شلّو، میری گڑیا میں تمھیں اکیلا چھوڑ کر جا رہا ہوں لیکن اس وعدے کے ساتھ کہ زندگی میں تم سے جب کبھی ملوں گا، اکیلا ہی ملوں گا۔ ہم مِل کر ہی ایک ہوں گے ـــــ ہم نے زندگی بھر کے لئے یہ عہد کیا ہے تاکہ ہم کبھی ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں گے!"

میں نے اپنی کانپتی انگلیاں اس کے ہونٹوں پر رکھ دی تھیں اور لرز کر بولی تھی۔

ـــــ "بس شہاب بس! میں صرف اسی ایک وعدے پر ہزار زندگیاں انتظار میں گزار سکتی ہوں" ـــــ اور اچانک ساون کے گہرے گہرے بھرپور بادل میری

آنکھوں میں جھک آئے اور میں شہاب کی قسموں کا خیال کئے بنا ہچکیاں لے لے کر رو پڑی ـــــ !

"شلو! یاد ہے تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ساون سے کوئی واسطہ نہ رکھوگی ـــــ"

اور میں سسکیوں کے درمیان بولی تھی ـــــ "کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو شہاب! کہ یہ موتی میں تمہارے پیار ہی میں رول رہی ہوں؟"

شاید شہاب کی آنکھوں میں، میری آنکھوں میں جھانکنے کی سکت نہ تھی ـــــ اس نے منہ پھیر لیا تھا ـــــ لیکن میں دیکھ چکی تھی کہ ساون کے ہلکے ہلکے بادل وہاں بھی جھوم رہے تھے ـــــ !!

زندگی کتنی تیز رفتاری سے گزرتی ہے ـــــ ؟! ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ آنے والا کل ہمارے لئے آنسوؤں کی سوغات لانے والا ہے یا خوشیوں سے بھرے تحفے؟ ـــــ

اُنہی دنوں ملک تقسیم ہوا ـــــ مدتوں روح اور جسم کی طرح ساتھ ساتھ رہنے والے رشتے ناطے ختم ہوگئے ـــــ ایک دور بیت گیا ـــــ ایک دور شروع ہوا ـــــ ہماری کوٹھی بھی محفوظ نہ رہی۔ کتنے ہی لوگ پاکستان چلے گئے۔ اور جنھیں اپنی مٹی سے پیار تھا وہ اسی سرزمین کو اپنی زندگی کی متاعِ بے بہا سمجھ کر بیٹھے رہے۔ ہمارے خاندان میں بھی کتنے انقلاب آئے ـــــ حمیدہ باجی۔ رقیہ آپا۔ ذکو۔ نوری بعید باجی سبھی کی شادیاں ہوگئیں ـــــ بہت سالوں کے انتظار کے بعد شمیم کو بھی بیاہ دیا گیا۔ لیکن میں نے زندگی میں شہاب سے جو وعدہ کیا تھا، اُسے لئے بیٹھی رہی۔ شہاب نے چند سال پہلے خالو ابا کو ایک خط میں صاف صاف لکھ دیا تھا۔

"میں شادی کروں گا تو صرف شہلا سے، ورنہ میرے لئے اکیلے رہ کر زندگی گزار دینا

کوئی مشکل بات نہیں ــــــ"، خاندانی روایتوں اور جاگیردارانہ دبدبے سے مجبور خالو ابا نے صاف صاف لکھ دیا ـــــ" ہمیں تمھاری آخری بات زیادہ پسند ہے ــ شوق سے اکیلے رہو۔ لیکن ہم ایک بار جہاں زبان دے چکے، اس سے ٹل نہیں سکتے ـ"
شہاب نے بددل ہوکر ہندوستان واپس آنے کی بات سوچنی ہی چھوڑ دی۔
"میں وہاں آکر کیا کروں گا سوائے اس کے کہ ہرلمحہ اپنے دل کو دکھی محسوس کرتا رہوں !"

یہ کیسا ستم ہے ؟ ـــــ کیسی کسک ؟ ـــــ یادوں سے بوجھل یہ دل پھٹ کیوں نہیں جاتا ـــــ آج رہ رہ کر دل کی دھکن بڑھ کیوں رہی ہے ؟ اتنے سال بیتنے پر پتہ چلا کہ زندگی نے، خاندان کے جھوٹے وقار نباہنے والے خالو ابا نے، بزرگوں نے میرے ساتھ کیسا سنگین مذاق کیا تھا ـــــ آج دوپہر کی بات ہے میں تنہا، اداس اور ویران کوٹھی کے اجڑے باغ میں سیڑھیوں پر بیٹھی تھی کہ ایک دبلا پتلا بوڑھا شخص جس کے چہرے پر وقت نے جھریوں کی شکل میں اپنے نشان چھوڑ دیئے تھے میرے سامنے آکر کھڑا ہوا ـــــ اس نے غور سے میرے برف کی طرح سفید بالوں اور اداس بے نور آنکھوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"کیا میں بیگم شہلا سے مل سکتا ہوں ؟"
میں کمزوری کے باوجود تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
"بیگم شہلا ـــــ کیسی بیگم شہلا ـــــ !؟ یہاں کوئی بیگم شہلا نہیں رہتی ـــــ !"
"تو کیا شہلا نے شادی نہیں کی تھی ـــــ ؟" بوڑھا حیرت سے اپنی کمزور آواز میں پوچھ رہا تھا۔

اب کے میں نے غور سے دیکھا ـــــ "ارے شہاب !؟"

میں لڑکھڑا کر اٹھی اور نو وارد کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی ــــــ "شہاب تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہو تو اکیلے ہی رہو گے ــــــ بھلا پھر میں کیسے اس وعدے سے پھرتی ــــــ ؟ دیکھو شہاب میں آج بھی اکیلی ہوں"

ایکدم میری نظر اپنے ہی ہاتھوں پر پڑی ــــــ جھرّیوں سے بھرے ہاتھ میری نگاہوں کی زد میں تھے ــــــ میرا دل دکھ سے بھر آیا ــــــ آہ کس قدر جان لیوا انتظار ــــــ اب تو ان ہاتھوں پر مہندی بھی نہیں رچ سکتی۔ یہ ہاتھ اب ننھا سا بنگوڑا بھی نہیں ہلا سکتے ــــــ ولولوں اور ارمانوں کی عمر تو بیت گئی۔ اب مجھ میں کیا دھرا ہے ــــــ ؟

شہاب کے ہاتھوں میں پھٹا پرانا وہ خط تھا جس میں خالو ابا نے انھیں اطلاع دی تھی کہ "تم اپنی ضد کر سکتے ہو تو ہم بھی کم نہیں ــــــ ہم نے ایک ایک کر کے شہلا سمیت کوٹھی کی ساری لڑکیوں کو بیاہ دیا ہے ــــــ اب تم شوق سے عمر بھر تنہا رہو ــــــ"

قدرت کا یہ کتنا سنگین مذاق تھا؟ کیسی دلخراش حقیقت۔ شہاب اُدھر یہ سمجھ رہا تھا کہ میں کسی دوسرے کی ہو گئی ہوں اور یہاں مجھ سے یہ بتایا گیا کہ شہاب نے لندن میں کسی انگریز لڑکی سے شادی کر لی ــــــ اُف! یہ دُوریاں، یہ فاصلے ــــــ!

دل میں رہ رہ کے یہ کیسی دھڑکن ہو رہی ہے خدایا۔ جیسے اس سانس کے بعد دوسری سانس نہ آئے گی ــــــ یہ کیسی کلیجے کو کاٹ دینے والی ہوائیں چل رہی ہیں۔ شاید ساون کی آمد آمد ہے ــــــ ہاں ساون آ گیا ہے مگر میری زندگی میں نہیں ــــــ میری آنکھوں میں۔ اور اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ رم جھم رم جھم یونہی ہوتی رہے گی۔ اور میں دُکھے دل کو تھامے، ایک پیاسی رُوح کو لئے کراہتی رہوں گی۔

میں تنہا ہوں ــــــ!

میں تنہا ہوں ــــــ!!

چاند ستارہ

شاہینہ مسلسل ایک ہی ریکارڈ کو بار بار بجائے جا رہی تھی۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

ہواؤں میں نمی سی رچی ہوئی تھی۔ ادھ کھلے دریچوں سے موتیا کی کچھ بند کچھ کھلی کلیوں سے پھوٹتی خوشبو جیسے جھجکتے سہمتے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ ہوا کا ایک شوخ جھونکا فوزیہ کے چہرے سے ٹکرایا تو اچانک اُسے اپنی آنکھوں میں لرزتے آنسوؤں کے گر پڑنے کا خدشہ محسوس ہوا۔ اسی دم شاہینہ نے مڑ کر پوچھا۔

"اے ری بجو! یہ دیدۂ تر کیا ہوتا ہے؟"

فوزیہ نے گھبرا کر شاہینہ کی طرف دیکھا۔ پھر اُسی لمحہ اس نے ساڑی کے آنچل سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔ اور قدرے مُسکرا کر بولی۔

"تُو تو پگلی ہے شنّو! دیدۂ تر تو کچھ بھی معنی نہیں رکھتا۔ یہ شاعر بھی خوب ہوتے ہیں جو جی میں آئے کہہ دیتے ہیں۔"

تو فوزی! یہ تم کہہ رہی ہو کہ دیدۂ تر کچھ معنی نہیں رکھتا۔ پر ابھی ابھی یہ تم نے اپنی ریشمیں ساڑی کے آنچل میں شبنم کے سے قطروں کو جو سمیٹ لیا ہے تو یہ کیا

کچھ تھا؟ ـــــ پھر کیوں دیدۂ تر کچھ معنی نہیں رکھتا؟

پھر کہو ـــــ کہونا ـــــ!

فوزی نے گھبرا کر شاہینہ کو دیکھا

"تو نے کچھ کہا شاہینہ؟"

وہ حیران اور پریشان سی ہو کر بولی۔

"نہیں تو باجی! میں تو خود آپ کی باتیں سنتی تھی۔ تو سچ دیدۂ تر کچھ معنی نہیں رکھتا؟ آں باجی ـــــ؟؟"

فوزیہ کے کانوں میں شاہینہ کی آواز کہاں پہنچ رہی تھی۔ ریکارڈ کی آواز سارے میں گونج رہی تھی۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
پھر مجھے ـــــ.....

فوزی نے بے بسی سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

فوزی نے عاجز آ کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

"شفیق بھائی! آپ تو سچ مچ ناک میں دم کیے رہتے ہیں۔"

"میں نے کیا کیا ہے حضور؟ بچے مجھ سے پوچھ رہے تھے ہم نے کبھی پری نہیں دیکھی۔ پری دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے دکھا دی۔ اب اس بات سے آپ کی ناک میں دم آنے کا کیا تعلق ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔" پھر وہ شرارت سے جھک کر مسکرایا۔ "اور یہ تو آپ نے سنا ہی نہیں۔ میں نے انھیں یہ بھی تو بتایا ہے کہ کھلی

چھت پر جو شہزادہ سویا تھا، جس نے شہزادی کا دل لوٹ لیا تھا وہ یہی خاکسار تھا۔"

"قسم اللہ کی آپ بالکل ویسے ہیں۔ میں آپ سے کبھی نہ بولوں گی۔" اور فوزی اپنی ساڑی کا آنچل سنبھالتی بھاگ گئی۔

شفیق اسے جاتے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ یوں کہ اس کا وجود ایک نقطہ میں تبدیل ہوگیا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کی طرف دیکھا۔

"چاند میں اور فوزی میں کچھ رشتہ ضرور ہے۔" اس نے مسکرا کر سوچا۔

کھانے کی میز پر فوزی بالکل بھری بیٹھی تھی۔ شفیق پلیٹ سے چمچہ بجاتا رہا۔ جب ابّو نے پہل کی تو شفیق بھی جُت گیا۔ ابّو نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر کھنکھارتے ہوئے بولے۔

"فوزیہ بیٹی! تم کچھ سست سی دکھائی دیتی ہو؟"

"جی ہاں! ہوم ورک پورا نہیں کیا تھا اس لئے ٹیچر نے بنچ پر کھڑا کر دیا تھا۔" شفیق بے حد سعادت مندی سے بولا۔

ابّو کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

"ہائیں! تم اتنی بے پروا کب سے ہوگئیں بیٹی؟"

فوزیہ نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ شفیق پھر بول پڑا۔ "اور ماموں جان! مجھ سے خواہ مخواہ الجھتی تھیں کہ انسان چاند پر پہنچنے والا ہے جبکہ میرا کہنا یہ تھا کہ چاند خود زمین پر موجود ہے۔"

ابّو نے ہاتھ روک لیا۔ "ہائیں چاند زمین پر کیسے موجود ہے۔ میں نے تو کسی اخبار میں ایسی خبر نہیں پڑھی۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی نے بھرم رکھ لیا۔ شفیق اٹھ کر فون ریسیو کرنے دوڑا اور فوزی کو

ہنسی روکنی دشوار ہو گئی۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

شمالی دریچوں سے ہوائیں آ آ کر فوزی کو چھیڑ رہی تھیں۔ سونے کی طرح جھل بل کرتا اس کا رنگ سنہری ساڑی میں اور بھی لَو دے اٹھا تھا۔ آنکھوں میں شفاف شبنم کی طرح ٹھہرے ہوئے آنسوؤں کے قطرے!! ہوا جیسے پاسِ حُسن سے جھجک کر سہم گئی۔ فاختئی رنگ کے پردے ہلتے ہلتے ٹھہر گئے۔ بس ہوا اور فضا میں موتیا کی مہک رچی رہ گئی۔ موتیا، جس پر فوزی کی جان جاتی تھی۔

"میں مروں گی تو اپنی قبر پر موتیا کا پودا لگوانے کی وصیّت کر کے مروں گی۔"

ایک دن وہ بڑے موڈ میں آکر اپنی پسند کا اعلان کر رہی تھی۔

"اس حساب سے تو فوزیہ بی بی کی شادی موسمِ گرما میں کرنی چاہئے!"

"کیوں بھلا؟"

رضیہ کو شادی اور موت کا تعلق کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا۔

"ارے بھئی گرمیوں میں موتیا کے پھول اپنی بہار پر ہوتے ہیں نا؟ ان کے دولھا میاں جبھی تو موتیا کا سہرا باندھ کر آسکیں گے۔ ورنہ دوسرے موسم میں تو سڑے بُسے پھولوں پر بات جائے گی۔"

فوزی کا منھ تپ گیا۔ "آپ عجیب آدمی ہیں۔ میں کیا کہہ رہی تھی اور آپ کیا کیا لے بیٹھے!"

شفیق ہنسا۔

"ہاں یہ لڑکیاں اسی طرح بات کو گھما پھرا کر کہا کرتی ہیں۔ قبر سے آپ کا مطلب سچ مچ کی موت تھوڑا ہی تھا۔ وہ تو ہم جانتے ہیں۔"

فوزیہ بھنا گئی۔ "آپ کا جواب نہیں حضور ــــ جو جی میں آئے ہانکے جاتے ہیں۔"

اُس کے سیم گوں چہرے کا رنگ دم بدم بدل رہا تھا اور آنکھیں مارے غصّے کے کبھی تو خاکستری نظر آنے لگتیں اور کبھی بھوری۔

پھر وہ اپنے شرارت بھرے چہرے کو اُس کے چہرے کے بہت قریب لاکر بولا۔

" مگر آپ یقین رکھیے، کسی موسم میں شادی ہو میں آپ کے گھر دولھا بن کر آؤں گا تو موتیا ہی کا سہرا باندھ کر آؤں گا۔"

فوزیہ نے چہرہ اُٹھا کر اُسے غصّے سے گھورا۔

" ہونہہ! دُولھا بن کر آئیں گے یہ!!"

اُس کی آنکھوں میں حقارت ہی حقارت بھری ہوئی تھی۔ شفیق اِسے بھی محبّت کا ایک انداز سمجھا۔

پھر اچانک یوں محسوس ہوا جیسے گھر میں برات اُتر گئی ہو۔ ہر طرف چہل پہل اور دھوم دھڑکا! پھوپھی امّاں اپنے شفّو کا پیام فوزیہ کے لئے لے کر آئی تھیں فوزیہ جو سچ مچ چاند کی رشتہ دار تھی۔ بلّیوں کی طرح سبز آنکھیں جو لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی تھیں۔ سنہرا رنگ جو ہنسی اور غصّے میں دمکنے لگتا تھا۔ بھورے سنہری مائل گال جن پر کبھی بھولے بسرے آنسو ٹھہر جاتے تو سچّے موتیوں کا شک ہوتا۔ فوزی جو پیلے اور گہرے فیروزی رنگ کی خوب لمبی سی امریکن کار میں کالج جاتی تھی اور پڑھتی تھی کہ انسان چاند پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

لیکن پتہ نہیں شفّو نے کون سے کالج میں پڑھ لیا تھا کہ زمین پر بھی ایک چاند ہے۔ ورنہ اگر سچ مچ کوئی چاند ہوتا تو سب سے پہلے شفّو ہی اُسے حاصل کرنے کے لئے لپک نہ پڑتا؟

ابّو نے جب گول مول باتوں میں پیام رد کردیا تو ہر چند کہ انھوں نے اپنی امارت اور بہن کی عزت کا کوئی سوال نہ اٹھایا تھا، لیکن اس دن شفیق پر ساری دنیا تاریک ہوگئی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر سر جھکائے اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔ دو ایک بار فوزیہ ادھر سے آنکھوں میں خوشی دبائے گزری پھر بھی اس نے سر اٹھا کر نہ دیکھا۔ چاند دھیرے دھیرے ادھر سے ادھر ہوگیا۔ تارے ایک ایک کر کے غائب ہوگئے لیکن شفیق اسی طرح سرنگوں بیٹھا رہا۔ موتیے کے حسین اور خوشبودار پھول جن کا نہ جانے کتنے دنوں سے اس نے سہرا گوندھ رکھا تھا، سارے کے سارے مرجھا مرجھا کر ٹوٹ گئے اور وہ یوں ہی بیٹھا رہا۔ جب صبح کی پہلی کرن اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ رات ڈھل چکی ہے۔ وہ اپنے اس خیال پر خود ہی مسکرایا لیکن یہ کیسی رات ڈھلی ہے کہ روشنی کا کوئی گزر ہی نہیں؟

"تم خدا نہیں تھیں، لیکن خدا کی طرح مجھ سے قریب تھیں۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ تم اگر پاس ہو تو دنیا میں کوئی غم نہیں ہے۔ لیکن تم زندگی میں اس طرح آئیں جیسے رات کی خاموش، اداس تنہائی میں پھول کی خوشبو جسے سمیٹنے اور دل میں چھپا کر رکھ لینے کا یارانہ ہو —— بھلا خوشبو بھی کبھی قید ہوسکی ہے؟؟ لیکن تمھارا چلا جانا تمھارے آنے سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ تم اس طرح چلی گئیں جیسے دھوپ دیکھتے دیکھتے غائب ہوجائے۔ جیسے روشنی ماند پڑ جائے۔ اجالا کھو جائے۔ میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ تم جو ایک ہنسی کی طرح میرے ہونٹوں پر چھائی تھیں، آنسو بن کر میری آنکھوں، میرے دل سے نکل جاؤ گی۔ اب سوچتا ہوں واقعی تم خدا ہی کا ایک روپ تھیں۔ جو بظاہر بہت مہربان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ لیکن دراصل کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ میں نے تمھیں دیا ہی کیا ہے جو تم سے کچھ مانگنے کا حوصلہ کروں۔

لیکن یہ میری خلوص بھری بددعا ہے کہ تمھارے کندن کی طرح دمکتے گالوں پر سدا سچے موتی جگمگاتے رہیں۔ اور یہ خلوص بھری بددعا بھی محض اس لیئے ہے کہ ہو سکتا ہے اِس طرح تم اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کر سکو۔ میں یہ کیسے مان لوں کہ تمھارے دل میں میرے لئے کوئی آگ نہیں بھڑکے گی؟ میں تمھارا دوست ہوں نا؟ میں بھلا کب چاہوں گا کہ تم آگ میں جلتی رہو۔"

فوزیہ تیسری بار اُدھر سے گذری تو شفیق کو پھاٹک سے نکلتے پایا۔ ایک لمحہ کو اُس نے رُک کر فوزی کی طرف دیکھا تھا، صرف ایک لمحے کو۔ اور شاید وہی ایک لمحہ تھا جس میں ساری دُنیا آنسوؤں سے بھیگ گئی تھی۔ بچے بازار سے شاپنگ کر کے ابھی ابھی لوٹے تھے اور مسلسل ایک ہی ریکارڈ بجائے جا رہے تھے۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا۔

اور جب فوزیہ تیزی سے پلٹ کر اپنے کمرے کو جا رہی تھی تو ہوا نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ "تم خدا نہیں تھیں لیکن خدا کی طرح مجھ سے قریب تھیں۔"

فوزیہ نے آنسو بھری آنکھیں اٹھائیں۔ "وقت گزر جاتا ہے لیکن یادیں جہاں کی تہاں رہتی ہیں۔ کیسے کیسے گھاؤ دل کو سہنے پڑتے ہیں۔"

وہ اُٹھ کر دریچے کے قریب آئی۔ موتیا کے پھول ہواؤں کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ اس نے سر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ روشن چاند کے قریب ہی ایک ستارہ چمک رہا تھا۔ فوزی کو بھولی بسری یاد نے آدبوچا۔

"یہ ستارہ ہے نا! اُسنتی کیوں نہیں؟ کام کی بات بتا رہا ہوں، یہ جو ستارہ ہے نا؟ جب چاند سے بالکل مِل جائے گا، اس دن قیامت آجائے گی!"

"لیکن شفّو بھیّا! قیامت ہوتی کیسی ہے؟"

" قیامت ؟ ارے تم نے قیامت نہیں دیکھی ، پھر یہ اور کیا ہے ؟ "
شاہینہ نے پلٹ کر دیکھا ۔ گہرے نیلے رنگ کی کریپ کی شلوار اور اُسی رنگ کے کُرتے اور دوپٹے میں ملبوس فوزی گلاب کی کلیاں چُن رہی تھی ۔ اُس نے حیران حیران نگاہوں سے دونوں کو دیکھا ۔ شاہینہ ہنس کر بولی ۔

" اری بجّو! آپ نے سُنا ، شفّو بھیّا آپ کو قیامت کہتے ہیں ۔"
فوزی کا چہرہ گہرا سُنہری ہو گیا ۔ " تمھارے شفّو بھیّا تو جو جی میں آئے کہتے رہتے ہیں ۔ وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ چاند زمین پر موجود ہے ۔"

" تو کیا جھوٹ کہتا ہوں ؟ "
وہ جان بوجھ کر فوزیہ کے قریب آگیا ۔
" آپ سے سچ کہنے کی امید ذرا کم ہی رہتی ہے ۔"
" لیکن اللہ قسم ایک بات کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا ۔" وہ خالص فوزی کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے بولا ۔

" وہ کیا ؟ " وہ ہنس کر بولی ۔
" یہی کہ خاکسار آپ کا سچّا عاشق ہے ۔"
" بالکل تھرڈ کلاس عاشقی ہے ۔" فوزیہ مُنہ بنا کر بولی ۔
" پچھتائیں گی ۔ یاد رکھیے گا ۔"
" آپ بھی کوئی بھلانے کی چیز ہیں ؟ وہ ذرا طنز سے بولی تھی ۔

اور اب وہ ، وہی تو تھا جو رہ رہ کر یاد آ رہا تھا ۔ فوزیہ نے کب سوچا تھا کہ وہ ہنسی ہنسی میں جی ہار جائے گی ۔ وہ کھلنڈرا سا لڑکا جو اپنے کمرے میں پڑھتے پڑھتے اچانک بچّوں میں جا کر کودنے پھاندنے لگتا تھا ۔ جو پڑھائی سے جی چُرا کر ، آم کے

کے درختوں پر چڑھ کر ناول پڑھا کرتا تھا۔ جو اکیلے میں بالکل فلموں کی طرح ڈائلاگ بولنے لگتا تھا۔ اچانک اِس طرح اُس کے ہوش و حواس پر چھا جائے گا کہ اُس کی یاد کے ساتھ ہی آنسو نکل آیا کریں گے۔

"میں تمہاری طرح اتنا خوب صورت ہوتا کہ آنکھوں کے پانی پر موتیوں کا یقین ہوتا تو خدا کی قسم موتیوں کی دکان کھول لیتا۔"

لیکن اب اُس کی بلوریں آنکھوں میں کتنے ہی موتی چھپے تھے کہ وہ چاہتا تو ان کا سہرا گوندھ سکتا تھا۔ لیکن وہ موتی سمیٹنے والا کہاں تھا؟ پتہ نہیں اُسے کیسے علم ہو گیا کہ ماموں جان نے پیام صرف غربت کی وجہ سے ٹھکرا دیا۔ بس وہ دن اور آج کا دن ـــــ اس کی کسی کو خبر نہ ملی کہ کہاں چلا گیا۔ دُور دیس کو چلے جانے والے کبھی یہ نہیں سوچتے کہ درد کی سوغات سنبھالنا کتنا کٹھن ہوتا ہے۔ اُس نے کھڑکی میں کھڑے کھڑے نیلے آسمان کو تکتے ہوئے انتہائی دُکھ کے ساتھ سوچا۔

پھر ایک ایک کر کے سب موسم آئے اور چلے گئے۔ وہ جان لیوا موسم بھی گزر گیا۔ جب شام کو بادل جھومتے تو ملگجی ملگجی اندھیرا چھا جاتا۔ اور کسی نہ کسی کونے سے نکل کر وہ سرگوشی میں پوچھتا۔

"میں نے کہا فوزیہ بی بی! آپ نے کہیں اپنی زلفیں تو نہیں کھول دی ہیں جو فضاؤں میں ایسا اندھیرا رچ گیا ہے۔"

چھم چھم مینہ برساتی سہ پہریوں کو وہ کسی آم کی شاخ سے کُود کر کپڑے نچوڑتا ہوا اس کے قریب آتا۔

شکر ہے آپ بھلی چنگی ہیں۔ ورنہ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ موتیوں کی برسات

کہیں آپ کی حسین آنکھوں کا فیضِ عام تو نہیں!"

اور پھر جاتی سردیاں اور آتی گرمیاں۔ ہائے وہ یادوں سے بوجھل موسم، موتیا کی ادھ کھلی کلیوں سے جب ساری فضائیں مہک جاتیں۔ اندھیروں میں تاروں کی طرح چمکتے ہوئے گول گول پھول جھومتے۔ تب کیسے کیسے اُسے اس غیر اہم سے لڑکے کی یاد آنے لگتی جو کبھی اُس کے لئے کوئی حقیقت نہ رکھتا تھا۔ اور پھر بھی سب کچھ تھا۔ وہ کیسے اُسے بھولے گی؟ کیسے اپنے دل کو تھامے گی۔ شادی کے ہنگامے اپنے عروج پر آجائیں گے اور سارے گھر میں دُھوم دھڑکا ہو جائے گا۔ اُس وقت اس کا اپنا دل کتنا ویران ہوگا وہ کیسے زندہ رہے گی؟ ابّو کتنے خوش ہیں بارہ سو روپے ہوتے بھی تو بہت ہیں، جبکہ ان کے ساتھ ایک بنگلہ اور گہرے ہرے رنگ کی پلے متھ کار بھی ہو۔ لیکن کبھی کبھی ایسا سوچنا بھی تو خوشگوار معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹا سا ایک گھر ہو۔ جس میں گیرج ہو نہ صوفے، نہ بھاری بھرکم پردے ہوں نہ پیانو لیکن ایک شفیق سا چہرہ ہو۔ محبت کرنے والا! جو بچوں کی آنکھ بچاکر اندھیرے اُجالے، کونے کھدرے، کندھوں سے پکڑ لے۔ اور اپنی گرم گرم سانسوں کا شہد کانوں میں گھولتے ہوئے بولے۔

"اللہ قسم تم تو پوری قیامت ہو!"

اس نے اپنے تپتے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ چمکتے آنسو، پانی کا روپ دھار کر اس کے ہاتھ کو بھگو گئے۔ کھُلا کھُلا آسمان جو شفّو کے دل کی طرح وسیع تھا۔ چاند جو اُس کی آرزو کی طرح روشن تھا۔ ستارے جو اُس کے آنسوؤں کی طرح چمکدار تھے۔ یہ سارے کے سارے مل کر کسی نہ کسی طرح اُسے شفّو کی یاد دلاتے تھے۔ پیلے اور سُوکھے پتّے اِدھر سے اُدھر اُڑتے پھر رہے تھے۔ اُس کا دل بھی اپنی جگہ پر نہ تھا۔

اندر شاہینہ بے سُری تانوں سے الاپ رہی تھی ۔

پتّہ ٹوٹا ڈال سے لے گئی پون اُڑائے
اب کے بچھڑے کب ملیں دُور پڑے ہیں جائے

وہ کھڑکی میں بیٹھے بیٹھے بہت دیر تک اِن درد بھرے بولوں کو دہراتے ہوئے گنگناتی رہی۔

پتّہ ٹوٹا ڈال سے ......

پتّہ ٹوٹا ڈال سے ....

اور پھر یہ سب کچھ ایسے ہوا جیسے خواب میں ہوتا ہے ۔

وہ اُس رات آم کے مضبوط تنے سے لگی ہوئی کھوئی بیٹھی تھی کہ کسی کی گیلی گیلی آواز نے اُسے چونکا دیا ۔

" میں یہاں ہر چیز چھوڑ گیا ۔ سوچا صرف ایک ہی چیز کیوں ساتھ لیتا جاؤں ؟ آج واپس کرنے آیا ہوں ۔ اپنی امانت سنبھال لو " اس نے اپنا مضبوط ہاتھ سامنے کر دیا ۔

اس نے پھٹی پھٹی حیران آنکھوں سے اُسے دیکھا ۔ یہ کون تھا جو اُسے اُلاہنے دینے آیا تھا ۔ یہ کون تھا جو اس کی زندگی کا درد سمیٹنے آیا تھا ۔ اُس کے ہونٹ کومل کومل پتّیوں کی طرح کلپنے ۔

" لیکن تم ایک امانت لوٹا بھی دوگے تو وہ سب کچھ کیسے لوٹاؤ گے جو میں اب تک تمھارے ......"

آواز اُس کے گلے میں گھُٹ کر رہ گئی ۔

شفّو حیران سا اُس کے قریب آ کر بولا ۔

" نوزی ! میں جان کر تمھیں دکھ دینے نہیں آیا ۔ راستے میں تمھارا شہر پڑتا تھا ۔ سوچا کہ وہ درد کی سوغات دیتا چلوں جس نے چار برسوں میں کبھی ایک لمحے کو بھی مسکرانے

کا موقع نہیں دیا۔ یہ تمھاری وہ تصویر ہے جو میں نے باغیچے میں کھینچی تھی۔ تم نہاکر
اپنی سیاہ زلفوں کو جھٹکار ہی تھیں۔" وہ جھک کر بولا۔

"اب وہی سیاہی میرا مقدر بن گئی ہے شفیق!"

وہ روہانسی آواز میں بولی۔

وہ ذرا اُلجھ کر بولا۔

"تم نے خود اندھیروں کو گود لیا ہے۔ شکایت کیوں کرتی ہو اب؟"

وہ قدرے رُکا۔ پھر سر اُٹھا کر آسمان کو دیکھتے ہوئے بولا۔" ان بادلوں کا بھی
کوئی بھروسہ نہیں، نہ جانے کب اور کہاں برس پڑیں۔ تو میں چلوں۔"

اُس کے ساتھ ہی فوزیہ نے بھی سر اٹھا کے آسمان کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر نُور
سا چھا گیا۔ قدرے مُسکرا کر بولی۔

"شفّو! ایکبار تم نے کہا تھا نا کہ جب یہ ستارہ چاند سے بالکل مل جائیگا تو قیامت آجائیگی!"

شفّو نے حیران حیران نگاہوں سے اُسے دیکھا اور کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ فوزیہ
تیزی سے آگے بڑھی اور اپنی ساڑی کے آنچل سے اُس کی راہ روکتی ہوئی بولی۔

"میں خدا نہیں ہوں اور نہ خدا ہو کر تمھاری آنکھوں سے اوجھل رہنا چاہتی ہوں!
کیا تم بھی اس بات سے خوش نہیں ہو شفّو کہ ہم محض انسان ہیں جو ایک دوسرے کو
نہ صرف دیکھ سکتے ہیں بلکہ چھو بھی سکتے ہیں؟"

شفّو نے حیران ہو کر پہلے فوزیہ کو اور پھر آسمان کو دیکھا۔ جہاں چاند اور
ستارے کو ایک بدلی نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔

*

کوئلہ بھئی نہ راکھ

رات تاریک ہے ــــ میرے نصیب کی طرح ــــ آسمان پر اکا دکا ستارے ٹم ٹما رہے ہیں۔ ان کا میرے آنسوؤں سے کیا مقابلہ؟ میری آنکھوں میں تو ان گنت ستارے جھلملا رہے ہیں، جھلملاتے ہی رہتے ہیں۔ کتنے دن ہوگئے میری آنکھوں نے مُسکرانا چھوڑ دیا ہے ــــ؟ ایسا معلوم ہوتا ہے ہنسی سے میری شناسائی ہی نہیں۔

آج صبح سے میرا دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے۔ یوں رہ رہ کر تو میرا دل کبھی نہ دھڑکا تھا ــــ مٹی کے اس ننھے مُنّے چراغ میں ایسی کیا بات تھی کہ اُس کے ٹوٹتے ہی میرا اپنا دل بھی جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ میں نے کتنے جتن سے، کتنے برسوں سے اس چراغ کو سنبھال کر رکھا تھا ــــ ایسا معلوم ہوتا تھا اُس چراغ سے میری اپنی زندگی کا گہرا ناطہ ہے، وہ ٹوٹے گا تو میں بھی ٹوٹ کر رہ جاؤں گی اور آج ــــ؟ آج تو جیسے میرا سبھی کچھ ٹوٹ گیا۔ سبھی کچھ لُٹ گیا ــــ لیکن میں بھی کیسی پاگل ہوں ــــ آفتاب ــــ جو یہ کہہ رہی ہوں کہ آج میرا سب کچھ لُٹ گیا۔ میرا تو اُسی دن سب کچھ لُٹ گیا تھا جس دن تم مجھے چھوڑ گئے تھے ــــ اُمیدوں، آرزوؤں، اور بھروسوں کے سارے چراغ تو اُسی دن بُجھ گئے تھے، یہ تو میں ہی تھی جو خزاں ہو کر بھی بہار بہار کرتی رہی ــــ کتنی پاگل، کیسی نادان (محبّت کرنے والے سچ مچ پاگل ہی تو ہوتے ہیں!)

ہیں تم سے شکایت نہیں کر رہی ہوں آفتاب ــــ شکایت اور گلے تو اپنوں سے کیئے جاتے ہیں اور تم نے یہ موقع ہی کب دیا کہ تمھیں اپنا کہوں یا سمجھوں ــــ سوائے چند لمحوں کے وہ لمحے جو میری زندگی کا حاصل بن کر رہ گئے ہیں! کاش میں نے یوں ٹوٹ کر کسی کو چاہا نہ ہوتا۔ لیکن کیا محبت سوچ سمجھ کر کی جاتی ہے آفتاب ــــ؟ اب سوچتی ہوں تو یہ سراسر پاگل پن ہی نظر آتا ہے۔ میں نے دل بھی کس سے لگانے کی کوشش کی ــــ؟ تم سے! تم جو سچ مچ آفتاب ہی کی طرح بلند اور دُور تھے ــــ لیکن آفتاب میں سچ کہتی ہوں تم نے مجھے یوں حوصلہ نہ دلایا ہوتا تو شاید میں کبھی تمھاری طرف دیکھ بھی نہ پاتی۔ میں نے تو تمھیں سے روشنی حاصل کی تھی (اور تمھیں نے مجھے اندھیروں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا ــــ کیسا دُکھ ہے یہ!)

کتنے سارے سال گذر گئے ہیں کہ میں نے کبھی تمھارے بارے میں سوچا تک نہیں ــــ اور جو دیکھو تو زندگی میں تمھارے سوا اور دوسری کوئی بات ہی نہیں ــــ جیسے اپنے آپ سے، خود کو بچاتی چھپاتی پھرتی ہوں۔ آئینے میں خود کو دیکھتی تک نہیں کہ اپنی صورت دیکھوں گی تو تم یاد آجاؤ گے۔ اس صورت کو تم نے کتنا پیار کیا تھا۔ کتنا پیار دیا تھا۔ کتنا غرور بخشا تھا۔ ان دِنوں آئینے کے سامنے جاتی تو گالوں پہ گُلال سا بکھر جاتا تھا۔ اپنا آپا سنبھلتا نہیں تھا۔ آنکھوں کی جوت دیوالی کے چراغوں کی طرح جگمگاتی تھی۔ مجھے میرا ماتھا چاند معلوم ہوتا تھا اور ہونٹوں پر ایسی کلیوں کا گمان ہوتا تھا جو اب کھلیں کہ اب کھلیں۔ اُن دنوں کوئی مجھ سے میرا نام پوچھتا تو مجھے جھجک سی آتی تھی۔ میں کیسے کہوں میرا نام شمع ہے۔ شمع تو جلتی رہتی ہے، اور میں تو مُسکراہٹوں سے عبارت ہوں۔ بھرپُور بہاروں اور دلکش ہنسیوں سے میرا وجود لہکا مہکا ہوا ہے۔ لیکن میں یہ بھولتی تھی کہ شمع کا کام بہر حال

جلنا ہے۔ میں اکثر سوچتی ہوں آفتاب کہ اگر میرا نام شمع نہ ہوتا تو کیا واقعی میری زندگی یوں نہ ہوتی؟ لیکن تمھارا نام بھی تو آفتاب ہے۔ سورج بھی تو سدا جلتا ہی رہتا ہے۔ پھر تمھارے حصّے میں دُنیا زمانے کی خوشیاں کیسے ہوئیں اور میں کیوں غموں سے سجائی گئی ــــ؟ شاید یہ میرے اپنے سوچنے کا غلط انداز ہی ہو۔ ہم عورتیں وہمی ہوا کرتی ہیں نا؟ ہاں یہ میرا وہم ہی تو تھا کہ میں ایک معمولی سے مٹّی کے چراغ کو یوں دل سمجھ کر سنبھال سنبھال کر رکھتی رہی، اور آج اس کے ٹوٹ جانے سے یُوں اُداس ہوں جیسے ساری خوشیوں ہی سے میرا ناطہ ٹوٹ گیا ہے۔ شاید یہ بات ہو آفتاب کہ اُس دن تم نے ہنسی ہی ہنسی میں بہت گہری بات کہہ دی تھی۔

"شمع اسے سنبھال کر رکھنا، جس دن یہ بُجھا سمجھو اپنی محبت بھی بُجھ گئی۔"

وہ دیوالی کی رات تھی ــــ تمھیں تو یاد بھی نہ ہوگا ــــ (اور میری تو زندگی ہی محض یاد ہے) گھر کے بچّے پڑوسیوں کی دیکھا دیکھی مٹّی کے چھوٹے چھوٹے دیئے کہیں سے لے آئے تھے اور چاندنی کی منڈیروں پر قطار در قطار بہت سارے دیئے جلا کر رکھ دیئے تھے۔ ہم دونوں چاندنی پر آئے تو سب سے کونے والا دیا بُجھا پڑا تھا۔

"ہائے غریب کا کوئی پُرسانِ حال نہیں!" میں نے لرز کر کہا اور اُسے ساتھ والے دیئے سے جلانے کو جھکی ہی تھی کہ تم نے ہنس کر کہا۔

"آج اس دیئے سے زیادہ کوئی خوش نصیب نہیں۔" میں نے بوکھلا کر تمھیں دیکھا تو تم اُسی جگمگاتی ہنسی کے ساتھ بولے تھے ــــ "ہاں جسے تم چھُو لو!"

میں نے تمھاری بات کاٹ کر پوچھا ــــ "اور جسے تم چھُو لو ــــ؟"

دیا میرے ہاتھ میں کانپ رہا تھا ــــ جھِل مِل ــــ جھِل مِل ــــ جھِل مِل ــــ

مجھے نہیں معلوم لیکن یقیناً میرے چہرے پر اِس دیئے کی لو جاگی ہوگی)، یقیناً اُس کے عکس نے میرے چہرے کو وہ جِلا بخشی ہوگی کہ تم میری تمنّا کر سکو، اِسی لئے تم نے کہا تھا۔

"شمع ——— میں ساری زندگی تمھاری تمنّا کرتا رہوں گا!"

میرا ہاتھ کانپا۔ یقیناً دیا گر جاتا اگر تم میرا ہاتھ نہ تھام لیتے۔ (وہ ہاتھ جو پھر تم نے کبھی نہ تھاما) اور تم نے جذبات سے بھری اور بھرّائی آواز سے کہا۔

"شمع! اس مٹی کے چراغ کو میں اپنی محبّت کا امین بنا لوں ——— ؟؟"

میں وہموں کی ماری ——— عورت پن کی ساری کمزوریوں سمیت تمہاری طرف تکنے لگی۔ ——— نہ جانے اب تم کیا کہو ——— اور تم نے دھیرے سے کہا تھا۔

"شمع اِسے سنبھال کر رکھنا، جس دن یہ بُجھا سمجھو اپنی محبت بھی بُجھ گئی ———"

میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ محبّت کا یہ کون سا انداز تھا کہ ایک چراغ کو تمام تر ذمہ داریاں سونپ دیں! لیکن میں نے کہا نا میں وہموں کی ماری تھی۔ تمھارے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے لئے جیسے آسمانی صحیفہ ہوگئے مجھے سہما ہوا دیکھ کر تم ذرا مُسکرائے تھے اور کہا تھا۔

"اتنی ڈری ہوئی کیوں ہو شمع ——— ؟"

میں اَیکدم بچّوں کی طرح پھُوٹ پھُوٹ کر رو پڑی تھی ——— "تم نے مجھے کیسی زنجیر میں جکڑ دیا ہے آفتاب ——— چراغ تو چراغ ہی ہوتا ہے۔ کبھی ہوا کے ایک جھونکے سے بھی بجھ سکتا ہے، اب تو ہر لمحہ میرا دل رہ رہ کر دھڑ کا کرے گا کہ اللہ نہ کرے۔ اللہ نہ کرے ...... جو یہ بجھے ——— اور جو کبھی ہوا کا کوئی سرکش اور حاسد جھونکا، میرے آنچل سے نظر بچا کر اُسے بُجھا ہی دے تو میں کہاں جی سکوں گی؟؟"

تم کتنی اعتماد سے بھری ہنسی ہنسے تھے ــــــ "تو تم اتنی سیریس ہو گئیں شمع ــــ!
کیا مٹی کا یہ حقیر سا دِیا میری محبت پہ بھاری ہو سکتا ہے؟"

"بات مٹی اور کانچ کی نہیں آفتاب ــــــ بات تو اعتقاد اور رواجوں کی ہوتی ہے۔ کانچ کی چوڑیوں میں کیا دھرا ہوتا ہے؟ لیکن کسی کے نام کے ساتھ جب ایک نئی بیاہتا کو پہنائی جاتی ہیں تو اُس کی زندگی کا مول ہو جاتی ہیں ــــــ اور پھر وہ ساری زندگی اُس کے اپنے انگ کا ایک حصّہ ہو کر رہتی ہیں۔ تم نے تو یونہی ایک بات کہہ دی۔ لیکن میں تو مٹ کر رہ گئی آفتاب!"

پھر وہ رات کبھی نہ آئی جب ہم ساتھ ساتھ چاندنی پر جاتے۔ میں چراغ جلاتی۔ تم میری تمنّا کرتے اور میں تمھاری وفاؤں پر بھروسہ کرتی ــــــ بس زندگی جیسے سمٹ کر آنچل کی اوٹ میں آ گئی۔ میں نے اپنے کمرے کے ایک محفوظ طاقچے میں وہ چراغ اٹھا کر رکھ دیا۔ اور زندگی اس جتن میں گذرنے لگی کہ محبت کا وہ شعلہ کبھی بجھنے نہ پائے۔ میرا بھولاپن دیکھو، مارے وہم کے میں ایک ساتھ دو دو بتیاں روئی کی بنا کر اُس میں ڈال دیتی کہ ایسا نہ ہو کہ ہوا کمزور پا کر اُسے بجھا ہی دے ــــــ ہر روز میں اُس میں تیل ڈالتی۔ میں تو اپنا خون بھی اس میں ڈال دیتی اگر مجھے یقین ہو جاتا کہ اِس طرح محبت کے چراغ دل کے خون سے امر ہو جاتے ہیں۔

سب میں اس چراغ کا چرچا ہو گیا ــــــ میری سہیلیاں مجھ پر ہنستیں ــــــ "ارے دیکھو یہ زرتشتوں کی طرح دن رات چراغ جلائے رہتی ہے!" دو ایک نے تو ٹوہ لینے کی کوشش کی، لیکن جس طرح مُنہ بند کلی کی خوشبو اُسی کے تن میں چھپی ہوتی ہے ویسے ہی اپنی محبت کا راز میں نے بھی اپنے ہی تن من ہی میں رکھا ــــــ زمانہ بہت حاسد ہے، کون جانے کس کا دل کب پلٹ جائے، اور بعض ہوائیں اتنی سرکش اور مُنہ زور

ہوتی ہیں ـــــ اور میری محبت کا چراغ تو اتنا ننھا سا ہے ۔۔۔۔۔۔

منزل سامنے ہو تو راستے کی کٹھنائیاں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ میری منزل تو میرے سامنے تھی، مجھے کس بات کا ڈر تھا ـــــ کانٹوں سے میں کبھی نہ ڈری ـــــ پاؤں کے چھالوں نے مجھے ہراساں نہیں کیا، قدم قدم ـــــ لمحہ لمحہ ـــــ بڑھتے ہوئے حوصلوں کو زمانے کے ظلم بھی نہ پیس سکے ـــــ حالانکہ میری زندگی ہی کیا تھی) ـــــ غریب سی لڑکی جس نے ماں کا سکھ دیکھا نہ باپ کی محبت ـــــ خالہ کے رحم و کرم کے سہارے جس نے جینا سیکھا۔ دو وقت کی روٹی اور تن بھر کپڑا جہاں زندگی کی معراج تھی۔ اور وقت گزارنے کے لئے جہاں ڈھیروں کام تھے ـــــ گھر بھر کے میلے کپڑوں کے انبار۔ باورچی خانے میں جھوٹے برتنوں کے ڈھیر۔ جھاڑنے کے لئے بڑے بڑے آنگن۔ صفائی کے لئے چھوٹے بڑے کئی کمرے۔ اور خدمت بجالانے کے لئے چھوٹے بڑے گھر بھر کر کئی کئی آقا ـــــ لیکن پیار کی اک نگاہ ـــــ محبت کا ایک آن کہا بول ـــــ مٹی کا ایک چھوٹا سا دیا ـــــ یہ سب تیز جھلستی ہوئی دھوپ کو کیسے خنک چھاؤں سے بدل دیتے ہیں ـــــ ؟؟

اُس دن دوپہر میں سب کو کھلا پلا کر، ہر کام سے نبٹ کر جب میں اپنے بستر پر لیٹی تو پتہ نہیں کیا ہوا کہ گھر بھر کے بچے آ کر میرے سر ہو گئے۔

" بجیا ـــــ پلیز کہانی سُنائیے ! "

" ہائے اللہ ! کہانی ـــــ ؟ اور وہ بھی دن میں ـــــ نہیں نہیں، ایسے تو مسافر راہ بھٹک جاتے ہیں ـــــ " میں نے گھبرا کر کہا۔

" نہیں باجی ـــــ آج بڑے چچا آ گئے ہیں، وہ ہمیں سرِ شام ہی بستروں میں

گھسا دیتے ہیں کہ بچّوں کو جلدی سو جانا چاہیئے، تو آج ہمیں آپ دن ہی میں کہانی سُنا دیجئے۔"

سب کاموں سے نبٹ کر، یہ بھی تو میرا آخری کام ہوتا تھا کہ رات میں سب بچّوں کو کہانیاں کہہ کر سُلاؤں ـــــ دن میں کہانیاں مجھ سے کبھی نہ کہی گئیں۔ میں نے سُنا تھا دن میں کہانیاں کہو تو مسافر راستے بھُول جاتے ہیں۔ راہ بھٹک جاتے ہیں ـــــ میں وہموں کی ماری۔ میرا دل یہ سوچ کر ٹوٹا کرتا اللہ جانے کون کس ارادے سے کس راہ جانا چاہے اور راستہ بھُول بیٹھے ـــــ میں کیوں کسی کی منزل کھوٹی کروں؟ لیکن اُس دوپہر میں بچّوں نے مجھے دم نہ لینے دیا۔ میری ایک نہ چلنے دی۔

"دیکھئے امّی اگر آپ نے کہانی نہ سُنائی تو ہم آفتاب بھیّا کو کہہ دیں گے۔"

تم گھر کے سب سے بڑے تھے، سب تمھارا نام لے کر ایک دوسرے کو ڈرایا کرتے۔

"آفتاب بھیّا!" میں تمھارا نام دل ہی دل میں گُنگُنا کر بولی۔ میرے خدا یہ کس کا نام میری زبان پر ہے! اور میں جیسے سب کچھ بھول کر کہانی سُنانے لگی۔ کسی شہزادے شہزادی کی نہیں۔ اسی رہتی بستی دنیا کی ـــــ میری تمھاری ـــــ لیکن آفتاب! میں نے دیکھ لیا کہنے والے غلط نہیں کہا کرتے۔ دن میں کہانیاں سُنانے سے مسافر سچ مچ راستہ بھُول جاتے ہیں۔ اپنی منزل پاتے پاتے بھٹک جاتے ہیں۔ میں نے دن میں کہانی سُنانے کی جو غلطی کی۔ اس کا بھگتان آج تک بھگت رہی ہوں۔ سوچتی ہوں یہ کہانی میں نے شروع ہی کیوں کی تھی ـــــ؟

اور پھر یہ ہوا کہ دم بدم اس چراغ کی لَو نیچی ہوتی گئی۔ میں پھر بھی اُسے جلانے اور جلانے کی اپنی سی کوشش کئے گئی لیکن دل کا لہو بھی کام نہ آیا ـــــ!

آج دل کو تھوڑی بہت تسکین بس بیتے دنوں کو یاد کرنے سے مل رہی ہے۔
شاید آج کے بعد میں کبھی اُن دنوں کو یاد بھی نہ کر سکوں! یہ کیسی عجیب بات تھی آفتاب کہ زندگی میں تم نے کبھی کھلے عام اپنی محبت کا اعتراف کیا نہ کونے کھدروں میں سرگوشیاں ہی کیں ـــــ نگاہیں! صرف تمھاری وہ بولتی ہوئی، مسکراتی ہوئی، عہد و پیماں کرتی ہوئی، ساری دشواریوں کو پیس ڈالنے کے بلند بانگ دعوے کرتی ہوئی نگاہیں ہی تو تھیں جنھوں نے مجھے تمھاری محبت کا یقین دلایا ـــــ مجھے آج بھی تمھارے اُن جذبات پر ناز ہے کہ تم نے کبھی سطحی پن کا مظاہرہ نہیں کیا ـــــ سمندر کی وسیع ذات کی طرح تہہ ہی تہہ میں محبت کی کارفرمائیاں لہریں لیتی تھیں۔ اوپری سطح خاموش پُرسکون! کوئی کیسے سمجھ سکتا تھا کہ تم ایک غریب سی بد نصیب سی لڑکی سے اتنا بھرپور پیار کرتے ہو۔ یہ تو صرف میں تھی جو تمھاری محبت کی راز دار تھی۔ چند لمحے میری زندگی کا حاصل ہیں، کیسے گہرا پیار چھلک پڑتا تھا کبھی کبھی تمھاری چھوٹی چھوٹی باتوں سے!

اندھیری رات میں ایک بار میں سیڑھیاں چڑھ رہی تھی، تم اُتر رہے تھے۔ میں چاپ سُن کر ہی سمجھ گئی یہ تم ہو۔ میں نے سوچا اللہ نہ کرے تم کہیں گر نہ جاؤ۔ اسی لئے میں نے ذرا جھجک کر کہا تھا۔

"سنبھل کر اُتریئے۔ اندھیرا بہت گہرا ہے۔"

تم نے جگمگاتی آواز میں جواب دیا تھا ـــــ "تمھارے چہرے کا چاند جو ساتھ ہے!"

ایک تیز دھوپ والی دوپہری میں تم باہر سے آئے تو میرا دل رو اُٹھا۔

"ٹھنڈے پانی سے مُنہ ہاتھ دھو لیجئے۔ کیسی سخت دھوپ سے آپ ہو کر آئے ہیں!"

"دھوپ؟" تم نے مسکرا کر کہا تھا ـــــ "میں جدھر جاتا ہوں تمھاری اِن لانبی لانبی زلفوں کا سایہ مجھ پر چلتا جاتا ہے!"

ایک چاندنی رات ـــــ چاند کے بھرپور حُسن کے مقابل تم نے میرا حقیر وجود کھڑا کیا تھا اور اپنی جواں سانسوں اور مضبوط ہاتھوں کے ساتھ میرے قریب تر ہو کر مجھے چھو کر کہا تھا۔

"چاند میں اتنا نور کہاں ہے ـــــ ؟؟"

میرے وہموں کے ساتھ ساتھ زندگی میں قدم قدم پر کیسے بھرم بھرو بھرے تھے ـــــ آج بھی تو چہرے کا وہی چاند ہے۔ زلفوں کی وہی عطر بیز اور ٹھنڈی گھٹائیں ہیں۔ آنکھوں کے، انتظار میں بسے ہوئے ڈوبے ہوئے دیئے ہیں، لیکن ایک تم نہیں ہو اور تم کیا جانو صرف تمھارے نہ ہونے سے اس زندگی کا کیا رنگ ہے ـــــ ؟؟

میں سوچتی ہوں آفتاب! لکڑیاں کتنی خوش نصیب ہوتی ہیں کہ دُھواں دُھواں ہو کر، جل جل کر راکھ ہو سکتی ہیں، ہو جاتی ہیں۔ میں پاپن تو دُھواں بنی نہ راکھ جلی ـــــ لمحے لمحے کی سنگ دل واردات میرے دل سے پوچھو اور یہ دیکھو میں بھی کیسی سخت جان تھی جو زندہ رہی، زندہ ہوں!

وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکتی ـــــ تم بے حد شادماں، بشاش اور بہت گہرے عزم سے میرے پاس آئے اور بولے

"شمع ـــــ زندگی کتنی خوب صورت ہے ـــــ لیکن اس سے بھی زیادہ ایک اور خوب صورت چیز ہے ـــــ پیسہ!"

میں سر سے پاؤں تک لرز گئی اور بُری طرح چونک کر تمھیں دیکھنے لگی۔ تم اکدم شفاف سی، بے داغ ہنسی ہنس پڑے۔ "گھبرا گئیں ـــــ؟" میں صرف یہ کہہ رہا تھا شمع، اب زندگی اس مقام پر آگئی ہے کہ میں چاہوں تو خوشی سے تمھیں اپنا لوں۔ مجھے بھلا کون روکے گا ـــــ؟ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم نے جو زندگی میں اب تک

صرف دُکھ اُٹھائے ہیں، غریبی ہی دیکھی ہے، تو اب اس راستے کو چھوڑ کر ایک نیا راستہ اپنالیں۔ جہاں خوشی ہو، محبّت ہو اور زندگی کا ہر عیش بھی ہو۔

میں بے حد سہمے ہوئے دل کے ساتھ سُنتی رہی —— "شمع پہلے میں ذرا اپنی لائف بنالوں —— میرا مطلب ہے کچھ پیسہ جمع کرلوں، کاروار خریدلوں، پھر ٹھاٹ سے تمھیں بیاہ لے جاؤں۔ تمھیں بھی تو زندگی کا کچھ حُسن ملے۔"

تمھاری محبّت کے بدلے میں میں نے اپنی زبان شاید رہن رکھ دی تھی، کبھی تمہارے سامنے ہونٹ نہ ہلا پائی۔ لیکن جیسے میرا رُواں رُواں چیخ اُٹھا —— "مجھے پیسہ نہیں چاہیئے آفتاب، مجھے دولت کی ہوس نہیں ہے۔ مجھے صرف تمہاری محبّت چاہیئے۔ مجھے اپنے پیارے ہاتھوں کے ہار پہنا دو، اپنے گرم گرم ہونٹوں کا ٹیکہ میرے ماتھے پر سجا دو۔ میرے سُہاگ اور محبّت کی بس اتنی ہی مانگ ہے ——" لیکن میں نے کہا ناکہ میں نے تمھارے آگے صرف اپنی آنکھیں جُھکانا ہی سیکھا تھا۔

اور تم چلے گئے۔

یوں کہنے اور سُننے میں کتنی معمولی سی بات لگتی ہے کہ ایک شخص کو جانا تھا اور وہ چلا گیا —— لیکن یہ میں نے اُنہی دِنوں جانا کہ جگمگاتا چاند تاریک کیونکر ہوجاتا ہے۔ پھول اپنا حُسن کیسے کھو دیتے ہیں۔ بہاریں خزاؤں سے کیسے بدل جاتی ہیں —— اور دھیرے دھیرے، ہنسنے مُسکرانے والے ہونٹ، اپنی مُسکراہٹیں آنسوؤں کو کیسے تج دیتے ہیں —— اور تم سے یہ بتا دوں آفتاب کہ تم نے میری آنکھوں کے لئے جو ایک بہت پیاری اور انوکھی سی تشبیہہ دی تھی کہ میری آنکھیں دیکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سچے ہیرے، جگر مگر کرتے ہیرے کوٹ کر

اللہ میاں نے یہ آنکھیں بنائی ہیں، تو وہی آنکھیں اپنی جگمگاہٹ کھو کر جیسے دو بجھے ہوئے چراغ بن کر رہ گئیں۔

جہاں حوصلہ ہو وہاں ارادے بھی ساتھ دیتے ہیں۔ تمھارے بے پناہ حوصلوں نے تمھیں کامیابیوں سے ہمکنار کر دیا۔ آج یہاں، کل وہاں۔ تمہارا بزنس پھیلتا گیا ـــــ تم امیر سے امیر تر ہوتے گئے ـــــ خوبصورت کوٹھی۔ فون، فرج، نوکر، چاکر اور گاڑیاں تو یوں بدلی جانے لگیں جیسے کوئی کپڑے بدلتا ہے ـــــ میں بھی سب کے ساتھ نئی کوٹھی میں اٹھ آئی تھی۔ ایسی زندگی جس کا تصوّر انسان خوابوں میں ہی کر سکتا ہے۔ اب سبھی کا اور میرا مقدّر تھی ـــــ (لیکن تم کہاں تھے ـــــ ؟) دولت آئی تو زندگیوں میں مغربیت دخیل ہونے لگی ـــــ لیکن میں جس مقام پر تھی وہیں رہی ـــــ سورج مکھی کے معصوم اور نادان پھول کی طرح جو سدا سورج کی طرف تکتا رہتا ہے۔

ایک رات سب لوگ کسی پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔ فون کی گھنٹی اچانک بجنے لگی۔ میں نے ہی فون اٹھایا ـــــ تم تھے۔ دہلی سے بات کر رہے تھے ـــــ اتنی دُور سے!! میرا دل لرز اُٹھا۔

"ہیلو ـــــ میں آفتاب بول رہا ہوں۔ اُدھر کون ہے ـــــ ؟"

میں ڈوبتے دل سے بولی ـــــ "میں ـــــ میں شمع ہوں ـــــ"

"کیا کر رہی ہو ـــــ ؟؟"

"جل رہی ہوں ـــــ"

اُدھر سے ایک بھرپور ہنسی۔ "اُفّوہ! تم تو ڈائیلاگ بول رہی ہو!"

نہ جانے ایک ساتھ کتنے سارے آنسو میری آنکھوں میں اُمڈ پڑے۔

میں نے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی ــــ بنتے بگڑتے جملوں کو میرے آنسوؤں نے بھگو بھگو دیا ــــ "آفتاب! میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ تم آتے ہو، پھر چلے جاتے ہو۔ پھر آتے ہو پھر چلے جاتے ہو ــــ مجھ سے بات تک کرنے کا وقت تمھارے پاس نہیں ہوتا۔ یہ چہرہ آج بھی چاند ہے۔ آنکھیں آج بھی ہیروں کی طرح دمکتی ہیں۔ زلفوں میں آج بھی ساون کی گھٹائیں جھومتی ہیں۔ لیکن تم کہاں ہو آفتاب ......"

اُدھر سے فون کٹ ہوگیا۔

تیسرے دن پلین سے تم آئے۔ شوفر گاڑی لے کر ایروڈرم گیا تھا۔ تم نوابوں کی سی شان اور تمکنت کے ساتھ اترے۔ کچن کی ایک کھڑکی کا رخ ڈرائنگ روم میں کھلتی تھی۔ تم اِدھر اُدھر دیکھتے چلے آرہے تھے۔ جیسے کسی کو ڈھونڈھ رہے ہو۔ شاید تمھاری آنکھوں کو میری تلاش ہو۔ میں نے دکھے دل سے سوچا۔ لیکن تم دپ دپ کرتے اوپر چلے گئے۔ شام کو میں پودوں میں پانی دے رہی تھی کہ تم باغ میں نکل آئے۔

"ارے شمع تم ــــ مالی کہاں ہے، یہ تم کیا کرتی رہتی ہو ہمیشہ۔ کام ــــ کام ــــ کام ــــ اتنے سارے نوکر جو ہیں ــــ؟

میں نے پہلی بار تمھاری آنکھوں میں بے خوفی سے جھانکا ــــ "آفتاب بھی پھول تو ایسے نہیں ہوتے جو مالی کے ہاتھوں کھل سکیں ــــ"

اِک دم تم چونکے ــــ "تم آجکل بہت ڈائیلاگ بولتی ہو ــــ اوں، اور بھئی اُس دن ٹرنک کال پر تم یہ کیا نادانی کرنے لگیں؟ کوئی ایسا رویا کرتا ہے؟ میں نے تو گھبرا کر ریسیور ہی رکھ دیا۔"

میں کچھ نہ بوئی۔ پودوں میں پانی ڈالتی رہی۔ لڑکیاں بہت احمق ہوتی ہیں۔ زندگی بھر محبّت کے پودوں میں اُمیدوں کا پانی ڈالتی رہتی ہیں ـــــ اور میں بھی ایک لڑکی ہی تھی ـــــ سب لڑکیوں جیسی ـــــ بلکہ اُن سے کچھ زیادہ ہی نادان۔

اور مجھے اس دن پر حیرت ہے جب میں اتنی بے باک ہو گئی تھی کہ تمھارے مقابلے پر آ کھڑی ہوئی تھی ـــــ یہ تمھارا احسان تھا یا ظلم۔ پتہ نہیں، بہرحال تم نے مجھے نت نئے کپڑوں اور زیوروں سے لاد دیا تھا۔ سبھی سے تمھارا یہ مطالبہ تھا کہ گوندنی کے پیڑ کی طرح زیوروں سے لدی رہیں۔ گھر کے لڑکے کاریں اڑائے پھرتے، لڑکیاں نئے نئے فیشن کے کپڑوں اور زیوروں سے سجی بنی کوٹھی پر اپنی سہیلیوں اور دوستوں کے ساتھ ہنگامہ مچائے رکھتیں ـــــ اور تم جو اُن دِنوں نعوذ باللہ سب کے پالن ہار بنے ہوئے تھے۔ یہ سب دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے کہ سب لائف کو کس قدر انجوائے کر رہے ہیں۔ اور یہ دیکھ دیکھ کر کڑھتے رہتے کہ میں اتنی خوشیوں کے باوجود کس طرح ـــــ بے طرح اُداس رہتی ہوں۔ پہننے اوڑھنے سے مجھے رغبت نہیں۔ گھومنے پھرنے کا شوق نہیں۔ آنے جانے میں دل نہیں لگتا، محفلوں سے بھاگتی ہوں ـــــ میں کیا کرتی آفتاب ـــــ میرا تو دل ہی جیسے مُردہ ہو گیا تھا ـــــ تم سچ مچ ہی آفتاب بن کر رہ گئے تھے جسے ہر لمحہ دیکھ تو سکتے ہیں، ہاتھ بڑھا کر چھُو نہیں سکتے۔ اپنا نہیں سکتے۔

اُس دن تم کلکتہ سے آئے ہوئے تھے۔ تم نے اپنے دوستوں کو ایک پارٹی دے ڈالی۔ انتظام تو مجھے ہی کرنا تھا سو میں نے کر دیا لیکن اُن ہنگاموں سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی ـــــ؟ تم نے مجھے جتا دیا تھا دیکھو "شمع! خدا کے لئے آج ذرا اچھے کپڑے پہننا اور خوبصورت ـــــ خیر وہ تو تم نظر آؤ گی ہی!"

میں نے بے حد بے دلی سے وہ جوڑا پہن لیا، جس سے میری دیرینہ یادیں وابستہ تھیں۔ جن دنوں تم غریب تھے لیکن میرے تھے۔ اندھیری راتوں میں جن دنوں تم میرے چہرے کی روشنی میں اپنے راستوں کے لیے چراغ فراہم کر لیا کرتے تھے ـــــ سیاہ شلوار، سیاہ قمیص اور سیاہ دوپٹہ، جن پر ستارے ٹنکے ہوئے تھے۔ تم کسی کام سے اندر آئے تو، تھے تو بڑی لپک جھپک میں ـــ لیکن مجھے دیکھ کر ٹھٹک سے گئے۔

"شمع ـــ یہ دوپٹہ ....."

میں نے تمھاری بات کاٹ دی ـــ "اسے میرا مقدّر سمجھ لو ـــــ سیاہ تاریک ـــ اور ان ستاروں کو آنسو ـــ شاید یہ نشانی تمھیں کچھ سوچنے پر اُکسائے۔

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو شمع؟"

میں پھٹ پڑی ـــ "آفتاب مجھے مت آزماؤ ـــ خدا کے لئے مجھے مت آزماؤ ـــ میں گھٹ رہی ہوں، مر رہی ہوں، تمھیں کچھ احساس نہیں ہوتا ـــ آنسوؤں نے میرا گلا رُندھا دیا ـــ آج میں تم سے تمھیں کو مانگتی ہوں۔ بولو آفتاب! جب اللہ نے تمھیں دنیا جہان کی نعمتوں سے نواز دیا ہے تو تم مجھے کیوں ٹال رہے ہو....."

"پاگل نہ بنو شمع ـــ میں تمھیں ٹال نہیں رہا ہوں بھائی، قصّہ دراصل یہ ہے کہ ابھی میرے سامنے اتنے پروگرام ہیں کہ میں خود گڑبڑا گیا ہوں۔ دیکھو پندرہ دن بعد مجھے لندن جانا ہے، وہاں سے لوٹوں تو شاید کئی دنوں کے لئے دہلی جانا پڑ جائے۔ اگلے چھ مہینوں میں مجھے پیرس ـــ ہانگ کانگ ....."

میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ میں چیخ اٹھی۔

" آفتاب! سونے کے مت بن جاؤ۔ خدا کے لئے گوشت پوست کے انسان بنے رہو کہ میں تمھیں پا بھی سکوں، چھو بھی سکوں اور چھوؤں تو یہ احساس بھی کر سکوں کہ میں نے محبّت اور پیار سے بھرپور ایک گداز دل کو، جسم کو چھوا ہے۔ یہ احساس نہ ہو کہ میں نے ایک سونے کے مجسّمے کو محبّت دی ہے "

تم ہکّا بکّا رہ گئے۔ شاید تمھیں توقع نہ تھی کہ میں، جو سدا ایک گونگی کے کردار میں تمہارے ڈرامے میں پارٹ کرتی رہی، یوں بول بھی سکوں گی۔ میں اچانک دیوانوں کی طرح اُٹھی اور اونچے کارنس پر سے وہ ننھا مُنّا چراغ اٹھالائی جو میری اُمّیدوں کی طرح رہ رہ کر ٹمٹما رہا تھا۔

" اسے پھونک مار کر بجھا دو آفتاب ـــــ اب میں زندگی سے ہار گئی ہوں۔ مجھ میں وہ حوصلہ نہیں کہ میں اسے دل کا خون دے کر بھی زندہ رکھ سکوں ـــــ "

تم نے چراغ کو بے معنی نگاہوں سے دیکھا ـــــ اُسے بجھایا نہیں (لیکن جلایا بھی نہیں۔)

اُس رات کی پارٹی کی ایک بات مجھے یاد رہ گئی ہے۔ تم نے اپنے دوستوں کا ہم سب بہنوں سے تعارف کروایا تھا اور تمھاری ہی ٹکر کے ایک بزنس مین دوست اسلم نے، مجھ سے ہاتھ ملاتے وقت بے حد شدید حیرت اور سچّائی کے ساتھ کہا تھا۔

" یار آفتاب ـــــ کیا بے وقوفی تھی ـــــ آج کے دن تک یہی سمجھتا رہا تھا کہ حوریں مرنے کے بعد ہی ملیں گی!"

پھر چند دنوں بعد خالہ امّی نے میرے سامنے ایک عجیب وغریب "بات" پیش کی۔

"بیٹی ـــ تم جانتی ہو آفتاب کتنا روشن خیال لڑکا ہے، اس نے اپنی بہنوں کو بھی بے جا پابندیوں سے دُور رکھا ہے اور تمھیں بھی وہ اپنی بہنوں کی طرح ہر علیش آرام مہیا کرنا چاہتا ہے۔ اسلم آفتاب کا بہت گہرا بہت پیارا دوست ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اُس نے تمھیں بے حد پسند کیا ہے۔ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ کچھ ٹھہر کر بولیں ـــ ہم سب اور خاص طور سے آفتاب اس رشتے سے بے حد خوش ہے۔"

اِس کے بعد تو سُننے کے لئے کچھ بھی نہ رہ گیا۔ میں اس اصول کی قائل ہوں کہ محبّت ایسا جذبہ ہے جو زبردستی کسی سے نہیں جوڑا جا سکتا۔ جب تم ہی نے ہی مجھے ٹھکرا دیا تو میں تمھارے سامنے اُس گھر میں رہ کر ہی کیا کر لیتی ـــ میں تو بہر حال ایک بوجھ تھی جو کسی نہ کسی کے سر لاد دیا جاتا۔ میں نے ہاں، نا کچھ بھی نہ کہا۔ بس اپنا سر جُھکا لیا۔ اب میں سر اُٹھا کر جی بھی کیسے سکتی تھی ـــ ؟ لیکن یہ کیسا دکھ ہے آفتاب جو جی سے جاتا ہی نہیں میں کہانیاں پڑھتی تھی جن میں ہمیشہ دو محبّت کرنے والوں کے بیچ، زمانہ، سماج یا کوئی رقیب آڑے آجاتا تھا۔ محبّت اسی لئے سدا مثلث سے تعبیر کی جاتی رہی ہے لیکن میرے نصیب میں یہ کیسا غم لکھا تھا کہ نہ تو کوئی سماج میرے لئے دیوار بنا، نہ زمانے نے اڑچن ڈالی۔ نہ کوئی رقیب ہی پیدا ہوا۔ تمھیں میرے سب کچھ تھے اور تمھی نے مجھے بھری بہار میں لُوٹ لیا ـــ تمھی نے سُہاگ کی بندیا میرے ماتھے پر سجائی اور تمھی نے مٹا دی ـــ جیون مرن کا سارا کھیل تمہارے ہی ہاتھوں انجام کو پہونچا۔

جب میں بیاہ کر نئے گھر آئی تو وہ دیا اپنے ساتھ ہی اٹھا لائی۔ اسلم نے دیکھا، میں دیئے کی ایسی دیوانی ہوں تو اُس نے میرے گھر کو سدا دیوالی کا رُوپ دے دیا ـــ ننھے مُنّے رنگین قمقمے یہاں سے وہاں تک سارے لان میں، درختوں

میں، حد یہ کہ ننھے منّے پودوں تک میں لگوا دیئے۔

"تمھیں اُجالوں سے پیار ہے اور مجھے تم سے ——" اور اس نے محبت سے سرشار ہو کر بے حد عام شوہروں والی، ہزار بار کی کہی بات دہرائی۔

"جان یہ تو حقیر قمقمے ہیں، تم کہو تو میں آسمان کے سارے جگمگاتے ستارے توڑ کر تمھارے آنچل میں ڈال دوں —— !"

اسلم بے چارے کو یہ بات نہیں معلوم آفتاب کہ جن ستاروں کے توڑ لانے کا جتن وہ کرتا رہتا ہے، وہ آج سے سالوں پہلے تم نے چُن چُن کر میری آنکھوں میں بسا دیئے ہیں۔

مجھے اسلم پر کیسا کیسا ترس آتا ہے —— اس بے چارے نے کیا قصور کیا ہے کہ اُسے محبت سے محروم زندگی ملے —— اور پھر اتنا ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر —— اسی لئے آج میں نے اپنے ہاتھوں اس مٹّی کے دیئے کو زمین پر پٹخ دیا۔ میں اُن یادوں کے لئے کیوں اپنا جیون برباد کروں جو مجھے خوشی کا ایک لمحہ بھی نہیں دے سکتیں۔ لیکن صبح سے اب تک —— میں ایک لمحے کو بھی سکون نہیں پا سکی ہوں۔ رہ رہ کے دل میں کانٹے سے ٹوٹ رہے ہیں اور آنسو تو یوں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں جیسے ساری دُنیا بہالے جائیں گے۔ دل کی دُکھن کا یہ عالم ہے جیسے چھالے تپک رہے ہوں۔ بے پناہ خوشیوں، محبت کرنے والے ساتھی اور رنگین بہاروں میں گھری ہونے کے باوجود جیسے میری روح ترس ترس کر کراہتی ہے —— میں تنہا ہوں —— میں اکیلی ہوں —— میں اکیلی ہوں۔

تصویریں

ابھی ابھی چوتھی بار ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ہے اور میں نے اپنے تھرتھراتے ہاتھوں میں ریسیور تھام لیا ہے۔ ریسیور منہ کے قریب لے جاکر میں نے کانپتی آواز سے "یس پلیز" کہا ہے۔ اور پھر میری آنکھیں بھیگ گئی ہیں۔ میں نے گھبرا کے ریسیور رکھ دیا ہے۔ اور پھر میرے ذہن میں کئی تصویریں ابھرنے لگی ہیں۔

سامنے ہی ٹیبل پر میری تصویر رکھی ہے جو ریاض نے کھینچی تھی۔ میرے جسم پر سُرخ پھولوں والی ساری ہے جو تصویر میں کالی دکھائی دے رہی ہے۔ میں ٹیبل پر دونوں کہُنیوں کے بل جھکی ہوئی ہوں۔ اور ریسیور میرے منہ سے لگا ہوا ہے۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ ہے۔ لیکن نہ جانے میں کیا کہہ رہی ہوں۔ کہیں تصویریں بھی بولتی ہیں؟؟؟

لیکن یہ تصویریں کیسی ہیں جو میرے ذہن کے پردوں پر اُبھر رہی ہیں۔ یہ بھی تو تصویریں ہی ہیں۔ پھر ان میں قوتِ گویائی کہاں سے آگئی؟ کیسے آگئی؟ یہ تو رنگا رنگ تصویروں سے سجا البم ہے! میں نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے اِس البم کے ورق الٹنے شروع کر دیئے ہیں!

میری نگاہوں کے سامنے مارچ اپریل کی ایک خوشگوار سی شام جھولا سی جھول رہی ہے۔

باہر کورٹ میں رانیؔ، شمعہؔ، وکیؔ اور میں بیڈ منٹن کھیل رہے تھے۔ ڈیڈی پاس کرسی ڈالے ہم لوگوں کا کھیل دیکھ رہے تھے۔ کہ اتنے میں ڈرائنگ روم سے فون کی گھنٹی سنائی دینے لگی۔ ڈیڈی نے پہلے تو اپنے بھاری بھرکم جسم کی طرف دیکھا پھر پیار سے بولے۔

"بلّی ذرا فون تو ریسیو کرے میری بٹیا!"

میں ریکٹ لئے لئے ڈرائنگ روم میں دوڑ گئی۔ سانس برابر کر کے میں نے ریسیور اٹھایا۔ اور بہت ملائم سی آواز سے کہا۔

"یس پلیز!"

"ہائے مار ڈالا!"

اِک دم دوسری طرف سے بے ساختہ آواز آئی۔ میں گھبرا سی گئی شاید رونگ نمبر مل گیا ہو۔

"ہلّو ــــ!" میں جلدی سے بولی۔

اب کی بار مطلع صاف ہو گیا۔ "کیا سوئیٹ آواز ہے خدایا!"

میں تیزی سے بولی۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

اُدھر سے آواز آئی۔ "بدتمیزی نہیں صاحب! آواز ہی ایسی پیاری ہے!"

میں غصّہ دبا کر بولی۔ "سیدھی طرح کہیئے، کس سے بات کرنی ہے آپ کو؟"

ہنسی کی مدّھم آواز کے ساتھ سنائی دیا۔ "پہلے تو چچا جان سے کرنی تھی لیکن اب تو بس آپ ہی سے کر لوں گا۔"

"آپ انتہائی بدتمیز آدمی ہیں!"
میں غصّے سے کانپ گئی۔
"شکریہ!" ہنسی کی کھنک۔
"اچھا دیکھئے!" میں سنجیدہ ہو کر بولی "اپنا نام بتائیے اور جو کچھ کہنا ہے جلد کہئے۔ میرے پاس بیکار وقت نہیں ہے۔ ڈیڈی سے ملنا ہو تو یوں کہہ دیجئے!"
پھر ہنسی کی آواز سُنائی دی۔
"پہلے اپنا نام بتا دیجئے!"
"بلّی ــــ!" میں نے عاجز ہو کر کہہ دیا۔
"اوہ بلّی! تب تو پھر میں یقیناً بلّا ہوں۔ میاؤں میاؤں!!"
اور لائن کٹ ہو گئی۔
ابھی میں باہر نکل ہی رہی تھی کہ پھر گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا لیا۔
"جی میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ اب سے جب کبھی میں فون کیا کروں تو آپ ہی ریسیو کیا کیجئے۔ میرا نام ریاض ہے۔ ہاں! کیا سمجھیں محترمہ!؟"
"کس کا فون تھا بیٹی؟" ڈیڈی نے پوچھا۔
"کوئی ریاض صاحب تھے، خیریت پوچھ رہے تھے۔" باقی ساری باتیں میں پی گئی۔
"اچھا ــــ ریاض! ــــ ہوہو ہو ــــ شریر لڑکا۔ روزانہ خواہی نخواہی فون کرتا رہتا ہے۔" ڈیڈی بے ہنگم قہقہے لگانے لگے۔
یادوں کی یہ شام کتنی سُہانی ہے۔ جیسے آبشاروں کا ترنّم میری زندگی میں رچ بس گیا ہو۔

وکی اُچک کر میز پر بیٹھ گیا اور آنکھیں نچا کر بولا ۔

" اور آپی! یہ تو بتایئے آپ ہمارے لئے کیا لائی ہیں علی گڈھ سے ؟ "

" جی ــــ میں علی گڑھ پڑھنے کے لئے گئی تھی ۔ تحفے بٹورنے کے لئے نہیں ۔"
میں مسکرا کر بولی ۔

" اچھا یہ بات ہے ؟ تو دیکھ لیجئے اب کون اپنے ساتھ لے جاتا ہے آپ کو شاپنگ کے لئے ! "

" تو تم سمجھتے ہو میں اکیلی نہیں جا سکتی ؟ " اور میں نے اُسے مُنہ چڑا دیا ۔

" جا کیوں نہیں سکتیں صاحب ! مگر ..... " وہ رُک گیا ۔" اپنے ریاض بھائی آجائیں ذرا ۔ ایسے ایسے بہتوں کو ہم نے ٹھیک کر دیا ہے ۔"

میں نے چونک کر اُسے دیکھا ۔

" ریاض بھائی ! ریاض بھائی کون ہیں ؟ "

" ہونہہ ! بیچاری چار سال علی گڑھ میں کیا رہ آئی ہیں کہ سارے عزیزوں کو بھول گئیں ۔ تایا ابا کے لڑکے کو نہیں پہچانتیں آپ ؟ " اور وہ زور زور سے ٹانگیں ہلانے لگا ۔

" چار سال پہلے میں آئی تھی تو وہ جناب دلّی گئے ہوئے تھے ۔ یاد ہے ؟ "

" جی ہاں یاد ہے ۔" وہ ناک چڑھا کر بولا ۔" مگر پھر بھی اتنا بننا کچھ اچھا نہیں لگتا ۔"

" ایسا بُرا بھائی کسی بہن کے نہ ہوگا ۔" میں ذرا جھلّا کے بولی ۔" بات کرنے کا ڈھنگ نہیں ۔ اور بہن بےچاری اِتنی دُور سے آئی ہے ۔"

وہ میز سے اُچک کر میرے گلے میں لٹک گیا ۔

" اچھی آپی ، پیاری آپی ! لو بس اب تو خوش ہو ۔"

میں ہنس پڑی ۔" ہاں ہاں خوش ہوں بابا ۔ مگر ذرا دُور تو ہٹو ۔ وکّی اب کام کی بات کرو ذرا ! "

" کیا؟" وہ مستعد ہو گیا۔

" بات یہ ہے کہ میری کامیابی اور واپسی پر بہت سارے ڈگ پارٹی مانگ رہے ہیں۔ کیا ارادے ہیں؟"

" تو بس کر ڈالیں۔ ڈر کاہے کا؟"

" اتنے لوگ کو دعوت دے گا کون؟ جن لوگوں کو میں پہچانتی تک نہیں۔ اور اتنا سارا انتظام کون کرے گا؟" میں ذرا پریشانی سے بولی۔

" اچھا ــــ ؟"

اور وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شرارت سے ہنس پڑا۔

ہم سب مل کر مستعدی سے کام کرتے رہے۔ بڑے ہال میں ہم نے امّی کی جہیز والی بڑی شطرنجی بچھا کر اس پر قالین بچھایا۔ قرینے سے صوفہ سیٹ لگا کر کرسیاں لگائیں۔ دروازوں پر صوفہ سیٹ سے میچ کرتے ہوئے نیلے پردے لگائے۔ اسی کی مناسبت سے نیلے پھول ٹوکریوں میں سجا کر اسٹینڈ میں لگائے۔ گلدان میں نیلے اور سُرخ پھول بھر دیئے۔ باورچی سے اچھی اچھی چیزیں پکانے کے لئے کہہ کر ہم سب لڑکیاں کپڑوں پر ٹوٹ پڑیں۔

شمّہ کا کہنا تھا میں ہرے رنگ کی وہ ساڑی پہنوں جس پر کالے رنگ کے بڑے بڑے پھول تھے۔ رانی کہتی تھی میرے رنگ پر سُرخ رنگ خوب کھلتا ہے۔ اِدھر وکّی صاحب کا اصرار تھا کہ میں بھورے رنگ کی وہ سلکن ساری پہنوں جس کا رنگ بالکل میری آنکھوں اور بالوں جیسا تھا۔ میں نے وکّی کی پسند کی ہوئی ساری نکال لی اور جب ڈریسنگ کر کے میں باہر نکلی تو شمّہ نے آوازہ کسا۔

" آج تو سب کو جگر تھام کر بیٹھنا پڑے گا!"

رانی نے اپنی شرمائی شرمائی ہنسی کے ساتھ کہا۔ " آج چاند بھی نہ نکلے تو بات بن جائے گی۔"

وکّی بہت پیار سے بولا۔ " اچھا اب بلّی کو زیادہ ستاؤ نہیں۔ اِسے اور بھی تو کام کرنے ہیں۔"

مہمانوں کو ریسیو کرنے کی ذمّہ داری میرے اور وکّی کے سپرد کی گئی ہیں۔ میں گھبرا گئی۔

" اُف! یہ کیا مصیبت ہے۔ میں تو کسی کو پہچانتی بھی نہیں۔"

" واہ! دعوت آپ کے سلسلے میں۔ اور ریسیو ہم کریں۔ اُوں ہوں! یہ نہیں ہو سکتا!"

شمّہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ خود کو بچائے جاتی۔

" ارے میں تو آپ کے ساتھ رہوں گا۔ میں کس مرض کی دوا ہوں؟" وکّی سینہ ٹھونک کر بولا۔

پورچ میں ہم نے ہر طرف، پھولوں کے گُچھّے سجا رکھے تھے۔ چار پانچ بجے سے کاروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہال بھرتا چلا گیا۔ مہمانوں کو ریسیو کرنے میں اور وکّی کھڑے تھے۔ اِکدم میری نظر سامنے والی باڑھ پر پڑی۔

" ہائے وکّی! معلوم ہوتا ہے مالی وہ ڈالی کاٹنا بھول گیا۔"

وکّی زور زور سے ہنسنے لگا۔" واللہ آپی! کتنی مسخری معلوم ہو رہی ہے وہ ڈالی!"

" اچھا تم ٹھہرو یہیں۔ میں اُسے برابر کر کے آتی ہوں۔"

سیڑھیاں پھلانگ کر میں باغ میں پہنچ گئی۔ میں نے ڈالی برابر کی۔ ہلنے کی وجہ سے چند پتّیاں ٹوٹ گری تھیں۔ میں انھیں سمیٹنے کے لئے ذرا نیچے جُھکی ہی

تھی کہ اِکدم ایک کار آکے رُکی اور وکّی بڑی گرمجوشی سے چیخا۔
"ہلّو بھیّا!"
میں نے اُس کے اس طرح شاندار استقبال کرنے پر گھبرا کر سر اُٹھایا۔ وکّی وہیں سے چیخا۔
"ارے آپی ہو بھی چکا کام۔ واللہ آیئے تو۔"
اجنبی نے مجھے پلٹ کر دیکھا۔
ایک لمحے کو ٹھٹک سا گیا۔ اور پھر مسکرا کر وکّی سے مخاطب ہو گیا۔ "آپ کی تعریف؟"
"ہونہہ!" وکّی اپنی شرارت سے باز نہ رہ سکا۔ "تعریف ہو ہی کیا سکتی ہے۔"
یوں بھی مجھے بڑی بہن کا ارمان ہے تو دل رکھنے کو اِنھیں آپی کہہ ضرور لیتا ہوں۔ ویسے سب کا کہنا یہ ہے کہ ڈیڈی نے انھیں ایک بھوکی بنجارن سے دو سیر چاول میں خریدا تھا۔
"وکّی ـــــ؟!"
میں بے بسی سے چیخی۔
اِکدم اجنبی نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر وکّی سے پوچھا۔ "آپ کا نام؟"
وکّی زور سے ہنسا ـــــ
"نام؟ وہ تو آنکھوں، بالوں اور کپڑوں ہی سے ظاہر ہے۔ بھلا اس طرح کے مجموعے کا نام بلّی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ ارے ریاض بھائی! آپ بھی کمال کرتے ہیں بس۔ کس کا ذکر لے بیٹھے۔ چلئے بھی اندر!"
"بلّی ـــــ!"
"ریاض ـــــ!"
ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دوسرے لمحے وہ اپنے لمبے لمبے

قدم اُٹھاتا مُسکراتا اندر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے سیٹی بجائی۔ اور مُڑ کر بولا۔

"میاؤں میاؤں !!"

کتنی نادان ہوں میں ! میرا خیال تھا سنا ہیں سبھی حسین ہوتی ہیں خوبصورت توس قزح کی طرح رنگین ۔لیکن یہ بیتے دنوں کی بات ہے۔ اب تو جھل مِل جھل مِل آنسوؤں کی چلمن سے مجھے وہ گئے دن نظر آتے ہیں تو میرا دل کٹ کے رہ جاتا ہے۔ ذہن کے پردے پر یہ کیسی تصویر ہے جو اتنے دن گذرنے پر بھی مدھم نہیں پڑی۔ اُس دن ہال بالکل کھچا کھچ بھر گیا۔ بیٹھنے کے لئے جگہ ہی نہ تھی۔ مجھے بیٹھنا بھی پڑا تو ریاض کے بالکل پاس ہی۔

بازو بیٹھی ہوئی ایک خاتون نے ریاض سے میرا تعارف چاہا۔ وہ مجھے ستانے کے انداز سے بولا۔

"سُنتا ہوں چچا کی بیٹی ہیں۔ ویسے جھوٹ سچ کا حال اللہ کو معلوم ۔کیونکہ جب یہ یہاں تھیں میں یہاں نہ تھا۔ اور جب میں یہاں تھا یہ یہاں نہ تھیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" وہ حیرت سے بولیں۔

وہ ہنس پڑا۔ وہی کھنکھناتی ہنسی جو میں نے فون پر سُنی تھی۔

"میرا مطلب ہے ' یہ علی گڈھ سے نئی نئی آئی ہیں۔"

بہت پیاری شکل پائی ہے۔ ہے نا؟" وہ ریاض ہی سے مخاطب تھیں۔

"جی — جی —" ریاض گھبرا گیا اور میں کٹ کے رہ گئی

پارٹی کے بعد سب اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ ریاض نے وکی کو جا پکڑا۔

"قسم اللہ کی یار تم نرے گدھے ہو!"

" ہوا کیا؟" وہ سٹ پٹا گیا۔

" یعنی یہی کہ اتنے زمانے سے کبھی تو ذکر کیا ہوتا۔" میں نے ریاض کی طرف دیکھا تو اُس نے پھر وہی انداز اختیار کیا۔ " یہی کہ دیکھو نا کتنے چوہے ہو گئے ہیں — بلّی تو ....."

گرما کی خوشگوار سی ہوا بھی میرے کانٹے چبھو گئی۔ میں کانوں کے گرد ساڑی لپیٹے ہوئے جلدی جلدی جانے لگی تو شرارت بھری آواز سُنائی دی۔

" یس پلیز!"

میں نے مُڑ کے دیکھا تو وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میں سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تو پھر آواز آئی۔

" میاؤں میاؤں!!"

زمانہ بیت رہا ہے۔ بیتا جا رہا ہے۔ راہیں کتنی جلد طے ہو رہی ہیں۔ کیا منزل میرے قدم چُومے گی؟ میں یہاں بیٹھی ہوں۔ اس میز کے قریب۔ جہاں فون رکھا ہے۔ اور اپنی بے نور سی آنکھوں سے ماضی کے جھروکوں میں جھانک رہی ہوں۔ میرے ہاتھوں میں کوئی البم نہیں، کوئی تصویر نہیں۔ پھر یہ دُھندلے دُھندلے سائے جیسے کیا تیر رہے ہیں؟ مجھے اپنی ایک عادت یاد آ رہی ہے۔ میں ہمیشہ اپنے البموں کے پہلے صفحے پر کوئی شعر لکھ دیا کرتی تھی۔ ایک بار ایک البم پر میں نے یوں ہی ایک شعر لکھ دیا تھا ؎

کھو کے مت رو مجھے اے شمعِ شبستانِ حیات
زندگی لوٹ کے آئے گی نہ پروانے کی

لیکن اب جو یہ تصویریں میری نگاہوں کے سامنے ناچ رہی ہیں تو میں سوچ رہی ہوں

اِس البم پر میں نے ایسا کون سا شعر، ایسا کون سا غمناک شعر لکھ دیا تھا جو میرا مقدّر بن کر رہ گیا۔ پروانے کی زندگی تو کبھی بھی لوٹ کر نہ آئے گی۔ پھر یہ آنسو! یہ شمع کے جلتے جلتے آنسو، اور یہ لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی تصویریں۔۔۔؟؟

چڑیا دُور جا گری اور اُس کے ساتھ ہی ہم نے اپنا کھیل ختم کر دیا۔

وکّی چلّا اُٹھا۔۔۔

"یہ آپی کی بچّی سدا ہارنے پر آتی ہے تو بے ایمانی کرتی ہے۔"

ڈیڈی ہنس کر بولے۔

"اچھا تو یہ سمجھ لو تم جیت گئے۔"

وہ رونی آواز سے بولا۔ "یوں مزہ نہیں آتا۔"

"ارے یوں لڑکیوں کی طرح بسورو تو نہیں۔ پھر کسی دن نبٹ لیں گے۔" ریاض اُس کی پیٹھ تھپ تھپا کر بولا۔ "ویسے اصل بات تو یہ ہے کہ لڑکیوں کی کچھ ذات ہی بے ایمان ہوا کرتی ہے۔"

میں نے جل کر اُس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ کبھی میری طرف نہ دیکھتا تھا۔ ڈیڈی اُٹھ کر اپنے کسی دوست سے ملنے چل دیئے۔ ہمیں لوگ رہ گئے۔ ڈیڈی کے جاتے ہی سارے بچّے آ گئے۔ ریاض نے ایسی ایسی گپیں ہانکیں کہ میں بہت مشکلوں سے ہنسی ضبط کر پائی۔ سب بچّے حیرت سے مُنھ کھولے سُنتے رہے۔ اکدم میں نے محسوس کیا کہ باتوں ہی باتوں میں بچّوں کی آڑ لے کر وہ ایسی باتیں کہہ رہا ہے جس کا تخاطب بس مجھ ہی سے ہو سکتا ہے۔ میں، بھی گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے کان سن سن کر رہے تھے۔ پیچھے سے مجھے آواز آئی۔

"بچّو! تمھیں معلوم ہے ایک دیش ہے جہاں کے پھول بھی باتیں کرتے ہیں۔"

ہماری تمھاری طرح چلتے پھرتے ہیں۔"

میں نے حسب عادت اسے پلٹ کر دیکھا تو وہ ہمیشہ کی طرح ڈالی پر لگے گلاب سے مخاطب ہو گیا۔

"تمھیں حاصل کر لیا تو سمجھو دُنیا حاصل کر لی دوست!"

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور گلاب دُور ہو گیا۔

گلاب کے پھول کے ساتھ سدا کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ یہ بات مجھے اُس وقت معلوم نہ تھی۔ جب تو میں نے یہ سوچا تھا کہ اگر ریاض کو پھول پسند ہے تو وہ ہاتھ بڑھا کر توڑ کیوں نہیں لیتا۔ لیکن گلاب کے پھول میں یہ حُسن نہ ہوتا اگر اس کے ساتھ کانٹے نہ ہوتے۔ ہنسی اسی لئے تو پیاری ہوتی ہے کہ آنسوؤں کی پالکی میں سوار ہو کے آتی ہے۔ بغیر غم کے خوشی ہی کیا؟ لیکن یہ کیسی ہنسی تھی، کیسی خوشی تھی کہ آنسوؤں کے دریا میں بہتی چلی گئی۔ بہتی ہی چلی گئی۔ اور پھر ہنسی چلی گئی۔ آنسو رہ گئے آنسو ہی آنسو!!

گھبرا کے میں نے پٹی کھول دی۔ "بھئی ہم سے نہیں ڈھونڈا جاتا۔"

"میں کہتا ہوں نا۔" وکّی کا پارہ چڑھ گیا۔ اب سے اس گدھی کو کبھی ساتھ نہیں کھیلنے دیں گے۔ بے ایمان کہیں کی یہ

"اے ـــ میں تم سے بڑی ہوں جی!" میں چلّائی۔

"بہت دیکھے ایسے بڑے!" وہ چڑ کر بولا۔ "عجیب لڑکی ہے۔ پھر آنکھ مچولی کھیلنے آئی ہی کیوں تھی؟"

ریاض بہت آہستگی سے کہہ گیا صرف میں ہی سُن سکی۔

"چور ڈھونڈنا بہت مشکل کام ہے! اور پھر دل کا چور!!"
میں نے اُسے دیکھا تو وہ ہمیشہ کی طرح جھٹ سے آنکھیں اٹھا کر چاند سے باتیں کرنے لگا۔

"تمھارے دم سے میں نے اپنے دل میں چاندنیاں بھرلی ہیں۔ کہیں بدلی میں نہ چھپ جانا!"

کھیل بگڑ گیا تھا۔ وکّی غصّہ ہو کر چلا گیا تھا۔ دوسرے چھوٹے بچے وہیں "چڑی چھپاکا" کھیلنے میں جُٹ گئے۔ میں رانی کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگی تو سُنائی دیا۔
"قسم اللہ کی بلّی! گھر کی ساری رونق بس تجھی سے ہے۔" میں نے گھبرا کر دیکھا تو ریاض بھیّا بلّی کو گود میں لئے اُس کے کان سے مُنھ لگائے ہنس رہا تھا۔
رانی کچھ جھلا کے بولی۔
"اللہ جانے ریاض بھائی کو بلّیوں سے اتنی رغبت کیوں ہے؟"
میں بُری طرح جھینپ کر رہ گئی!

یادوں کا دامن تار تار ہو رہا ہے۔ کیسی کیسی دلخراش یادیں!! دریا تو دریا ہیں سمندر بھی میری آنکھوں میں سما جائیں تو روتے نہ تھکوں۔ ریاض اور میں کتنی تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔
یہ گرما کی، موتیا کے پھولوں سے مہکتی شامیں سدا حسین ہوتی ہیں۔ آج کی شام بھی تو رم جھم برسات لے کے آئی ہے اپنے دامن میں! یہ برسات! یہ آنسوؤں کی جھڑیاں!!
تین بار فون کی گھنٹی بجی اور چوتھی بار میں نے ریسیور مُنھ سے لگالیا۔

"بس پلیز!"

"بس بس۔ میں آگے ہی مر چکا ہوں"۔ ہنسی کی آواز۔

یہ ریاض ہی تھا نا؟

شام کو رجّی کی سالگرہ کا جشن تھا۔ کتنے ہنگامے، کتنے رنگا رنگ پروگرام کتنی دھوم دھام۔ وہ بھی تو آیا تھا۔ کیسی جگمگاتی شام تھی۔ اور اس دن جیسے سارے فاصلے طے ہوگئے تھے۔ جینی نے لان میں بیٹھ کر بلبل ترنگ پر گانا سنایا تھا۔ وکّی نے گدھے، گھوڑے، مرغے، اور کتّے کی نقلیں اتاریں۔ ننھّی روبی نے انگلش ڈانس کا پوز بنایا ـــــ I LOVE YOU ـــــ جو انھیں کانونٹ میں سکھلایا گیا تھا۔

بیٹھے بیٹھے ریاض نے آسمان کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کتنے ستارے ہیں آسمان پر۔ لیکن ان میں ایک تارہ سب سے زیادہ روشن ہے۔ یہ بیچ والا۔

"ایسا کیوں ہے بھیّا! سبھی تارے ایک سے کیوں نہیں ہیں؟" روبی نے پوچھا۔

بہت گہرا جواب دیا ریاض نے۔

"دل میں کتنی ساری تمنّائیں ہوتی ہیں۔ کوئی چھوٹی کوئی بڑی۔ لیکن ایک تمنّا اُن سب تمنّاؤں سے بڑی ہوتی ہے۔ چاہے وہ کوئی سی ہو۔" اس نے باری باری سب چہروں کا جائزہ لیا۔ کوئی کچھ نہ سمجھا۔ "جیسے یہ روشن ستارہ ہے نا؟" کتنی آہستگی سے اُس نے کہا تھا۔ "بھلا کوئی بُوجھے تو، میرے دل کی سب سے روشن تمنّا کون سی ہے؟"

لیکن اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ میری آڑ لے کر۔ پھولوں، کلیوں اور ستاروں سے بات کرنے کی یہ ادا اُس نے کہاں سے سیکھ لی؟

رات بستر پر لیٹ کر میں نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ میری آنکھوں کے بالکل اُوپر ہی وہ ستارہ چمک رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔
" میرے خدایا! یہ ستارہ سدا یُوں ہی جگمگاتا رہے۔

اب مجھے یہ بھی بتانا ہوگا۔ یہ ستارہ کیسے جگ مگاتا تھا — ؟؟
بادل چھاتے ہیں گرجتے ہیں اور برس جاتے ہیں۔ نہ برسیں تو کیا ہوتا ہے۔
آسمان بوجھل ہو جاتا ہے۔ میرے دل کا آسمان بھی اِس لمحے بوجھل ہوا جا رہا ہے۔
بادل چھا چکے ہیں۔ لیکن برسنے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ یہ یکایک برسات رُک کیوں گئی۔ برس جاؤ اے بادلو! ورنہ یہ دل پھٹ کر رہ جائے گا۔ اب میں اپنے البم کی سب سے غمناک تصویر ڈھونڈ رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں اُس تصویر کو دیکھ کر میں رو پڑوں۔ یہ میرے دل پر پتھر کی سِل جیسی کس نے رکھ دی۔ یہ بادل برستے کیوں نہیں؟ برسات کے موسم کا حُسن تو اسی میں ہے کہ رم جھم بارش ہوتی رہے۔
یہ تصویر میرے سامنے ہے اور اب میرا دل پگھلتا سا محسوس ہو رہا ہے۔
میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ میرا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا ہے کہ مجھے اُس کی دھڑکن تک سُنائی دے رہی ہے۔ میں نے اپنے کانپتے ہوئے ہونٹ اس تصویر پر رکھ دیئے ہیں جو کہیں نہیں ہے اور ہر جگہ ہے۔ اب میری آنکھوں سے دُھند چھٹ رہی ہے اور میں یہ سب کچھ دیکھ سکتی ہوں۔
امّی میرے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ریاض آیا اور امّی کے پاس بیٹھ کر سعادتمند بچّے کی طرح کہنے لگا۔

"چچی جان! میری سمجھ میں نہیں آتا......"
امّی نے مسکرا کر اُس کی بات کاٹ دی۔ "تمھیں اتنا سنجیدہ تو آج ہی دیکھ رہی ہوں۔"
وہ کھلے دل سے ہنس پڑا۔ "میرا جملہ پورا ہوتے ہی آپ خود دیکھ لیتیں کہ میں کس حد تک سنجیدہ تھا۔"

"ہاں تو کہنا کیا تھا؟" امّی نے ہنس کر پوچھا۔
وہ پوری سنجیدگی سے بولا۔ "یہی کہ آپ کتنی اچھی ہیں!"
امّی ہنس پڑیں۔ "بہت شریر ہے۔۔نا۔!"
اتنے میں بچوں کی ایک ٹولی آئی اور محفل کا رنگ بدل گیا۔ امّی اٹھ کر چلی گئیں۔ وہ ٹیبل پر جھکا اور ریسیور ہاتھ میں لیکر بولا۔

"پھر تو وہ میٹھی آواز سنانا۔" "یس پلیز!"
میں نے گھبرا کر دیکھا۔ لیکن وہ بچوں میں رِل مِل گیا۔ دروازے میں وکّی اپنے لمبے لمبے ہاتھوں میں میرے کُتّے کے کان پکڑے گھسیٹتا داخل ہوا۔ میں وہیں سے چیخی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے وکّی ۔۔۔؟"
"بسکٹ کھلائے اپنے حصّے کے، وہ احسان گیا چولھے میں، اُلٹی پھٹکار پڑ رہی ہے۔ ہونہہ!" وہ غصّہ ہو گیا۔
"یہ کیا بات بات پر غصّہ ہوتے ہو دوست؟" ریاض نے اُسے منا لیا۔ "مگر کُتّا ہے بہت اچھا!"
وکّی من گیا۔

"ہاں اور کیا۔۔۔ بے چاری آپی کو دو ہی چیزوں سے تو پیار ہے بس دُنیا میں۔ طوطا یا پھر کُتّا، پھر ذرا اونچی آواز سے بولا۔ مگر اللہ جانے بلّی کُتّے کی نبھ ہی کیسے جاتی ہے؟"

میں جل بھن کر رہ گئی۔

"ہائیں!" ریاض حیرت سے چیخا۔"طوطا!!"۔

"ہاں اور کیا؟" وکی بیزاری سے بولا۔"سارے زمانے کی باتیں پوچھ لیجئے۔ ان کے طوطے سے!"

"اچھا تو یہ سلسلے ہیں!" وہ مسکرا کر رہ گیا۔

میں نے اُس کے اِس طرح پوچھنے پر اُس کی طرف دیکھا۔ تو وہ اتنے میں روبی کی ٹھوڑی پکڑ کر ہنستے ہوئے کہنے لگا تھا۔

"روبی گڑیا! اگر تمھاری آنکھیں بھوری ہوتیں نا، تو بس ہم تم ہی سے شادی کر لیتے!"

روبی تن تنا کر بول اُٹھی۔

"تو پھر آپی ہی سے کر لیجئے نا ـــــ ان کے تو بال بھی بھورے ہیں۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اُس وقت میرے ہاتھوں میں کتاب تھی جس کی آڑ میں میں نے خود کو محفوظ کر لیا تھا۔

باغ میں جامن کی ڈالی سے میں نے اپنے طوطے کا پنجرہ لٹکا رکھا تھا۔ آتے جاتے میں اُس سے بہت دُلار سے پوچھتی۔

"ہلو مٹھو پیارے! کیا حال ہیں؟"

"وہ ٹائیں سے جواب دیتا۔" دعا ہے حضور کی!"

پھر میں پوچھتی۔

"کھانا دانا ملا؟"

وہ بہت اُداسی سے کہتا۔" غریبوں کو کون پوچھتا ہے!"

اُس دن جو میں نے پنجرے کو جھکولا دے کر پوچھا۔ "ہلّو مٹھو پیارے کیا حال ہیں؟"
تو وہ بہت ادا سے گردن جھکا کر بولا۔

"میں تم سے محبّت کرتا ہوں!"

چلتے چلتے میں تیزی سے رُک گئی۔ وہ یکساں رٹ لگائے ہوئے تھا۔

"میں تم سے محبّت کرتا ہوں!"

"ہلّو مٹھو پیارے کیا حال ہیں؟" اب کے میں نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

وہ پھر دُہرا گیا۔ "میں تم سے محبّت کرتا ہوں!"

میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"کھانا دانا ملا ــــ ؟"

وہ پھر دُہرا گیا۔ "میں تم سے محبّت کرتا ہوں۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اظہارِ محبّت کا اِس سے عجیب و غریب طریقہ کسی نے اپنایا ہوگا؟ پنجرہ جھکولے لئے جا رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کا چھوٹا سا دروازہ کھول دیا۔ طوطے نے اپنے پر پھڑپھڑائے اور پھُر سے اُڑ گیا۔ میں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ یہ تو میں ہی تھی۔ اگر یہ انوکھا پیغام کسی اور کے پاس پہنچ جاتا تو ــــ!"

"میں تم سے محبّت کرتا ہوں!"

طوطا اڑا چلا جا رہا تھا۔ میں نے بہت بے بسی سے اُس، اُڑتے پنچھی سے کہا تھا۔
"اگر میں ایک ہندوستانی لڑکی نہ ہوتی میرے پنچھی! تو میں بھی اپنے من مندر کے دیوتا کو اپنے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا سلام بھیجتی ــــ"

"میں تم سے محبّت کرتی ہوں۔"

اور پھر ایک دن وہ بچوں کے گھیرے میں بیٹھا انھیں کہانی سنا رہا تھا۔

" بس اُس شہزادی کے پاس اپنا پیغام پہنچانے کے لئے شہزادے نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ شہزادی کے مٹھو کو سکھا دیا کہ ہر بات کے جواب میں بس یہ کہا کرے ــــ

" میں تم سے محبّت کرتا ہوں "

اور اس دن پہلی بار ـــــ بالکل پہلی بار میں ریاض سے مخاطب ہوئی۔

" شہزادے کا پیغام شہزادی تک پہنچ تو گیا لیکن شہزادی نے لوک لاج کے ڈر سے اپنے پالتو پنچھی کو اڑا دیا۔ آخر کو طوطے کی ذات بے وفا مشہور ہے، اگر اُس کی محبّت کا بھانڈا پھوڑ دیتا تو ؟ "

ریاض نے پلکیں جھپکا جھپکا کر دو تین بار تو مجھے حیرت سے دیکھا پھر وہ سنبھل گیا۔ مسکرا کر بولا۔

" مگر پیغام پہنچا تو سہی ! "

میں نے کھوئی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھا۔ اور میری نظریں آپ ہی آپ جھک گئیں۔

اقرارِ محبّت کی کیسی عجیب رسم تھی خدایا۔ لب کھلے نہ آنکھیں ہی ملیں اور ہزاروں میلوں کے فاصلے طے ہو گئے ـــــ یہ فاصلے !

اُن فاصلوں کا خیال آتا ہے۔ اُن دوریوں کا خیال آتا ہے جنھیں آنکھوں کی ایک ہلکی سی جنبش نے طے کر دیا تھا۔ اب مجھے آنسوؤں کے ساتھ اُن لمحوں کی یاد آتی ہے جنھوں نے کبھی میرا آنچل تھام کر مجھ سے پیار کرنے کی التجا کی تھی۔ اُن بیتے لمحوں کا دامن تھام کر آج میں اپنی آنکھوں کے جلتے بجھتے دیوں کی روشنی لٹا بیٹھی

ہوں۔ کیسی روشنی ہے یہ؟ کیسا اندھیرا ہے یہ؟ کتنے جھل مل کرتے لمحے، کتنے اُداس لمحے، کتنے مسکراتے گاتے لمحے، کتنے روتے لمحے۔ میرے سامنے ہیں۔ اِن تصویروں کو کون سے البم میں سجاؤں میرے محبوب! آج یادوں نے میرا دل کھُرچ کر رکھ دیا ہے۔ ایک ایک آنسو ایک ایک داستان کہہ رہا ہے۔ ایک ایک آنسو ایک ایک تصویر کو اجاگر کر رہا ہے۔ یہ تصویر کیسی ہے؟

ریاض کو اچانک سروس کال آگیا۔ اس کے جانے میں کل بائیس دن تھے۔ وہ روزانہ مجھے فون کرتا۔ میں ریسیور ہاتھ میں تھام کر، کہنیاں ٹکا کر، میز پر، بہت ملائم سی آواز میں پوچھتی۔

"یس پلیز!"

"کیا کر رہی تھیں؟"

"سچ سچ بتا دوں؟"

"وہ تو بتانا ہی ہوگا!"

"تمھیں یاد کر رہی تھی!"

"اوہ سوئیٹ بلّی!!"

"ٹرن...... ٹرن...... ٹرن......"

"یس پلیز!"

"کیا کر رہی تھیں؟"

"ٹھنڈے پانی میں تلوے ڈبو کر بیٹھی تھی۔ گرمی جو پڑ رہی ہے۔"

"مار ڈالا بلّی! قسم اللہ کی ــــ سفید چمکتے پانی میں وہ گلابی گلابی مخملی تلوے، اچھا ہوا جو میں نہ ہوا۔ ورنہ مرجانے میں کیا کسر رہ گئی تھی؟"

وہی کھنکھناتی ہوئی ہنسی جو میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔ ریاض کے جانے میں کتنے کم دن رہ گئے ہیں!!

ریاض کو تو جانا ہی تھا!

میں نے اُس دن اپنے دل کی تمام دھڑکنوں کو قابو میں رکھ کے پوچھا تھا۔۔۔

" پریوں کی کہانی والے شہزادے! یہ تو بتاؤ تمھارے دل کے آسمان کا سب سے روشن ستارہ کون سا ہے؟؟"

ریاض نے میرے سر کو اپنے دل کے قریب کر لیا۔

" کلیوں، پھولوں اور ستاروں کو راز دار بنا بنا کر پیغام بھیجنے کا وقت چلا گیا۔ اب تو دھڑکتے پھڑکتے دل ہی ایک دوسرے کے راز دار ہیں"

میں نے تڑپ کر دیکھا۔ وہ بھیگے بھیگے لہجے میں بول رہا تھا۔

" بگلی ۔۔۔ میں تجھ سے محبّت کرتا ہوں!"

میں نے تو اس پنچھی کو لوک لاج کے ڈر سے اُڑا دیا تھا۔ پھر یہ پنچھی کدھر سے آ گیا؟ کیا اِسے دُنیا سے ڈر نہیں لگتا؟ ریاض کا مضبوط دل تیزی سے میرے کانوں کے پاس دھڑک رہا ہے۔ دھک ..... دھک ..... دھک ......

اتنی مضبوط اور ہم آہنگ دھڑکن۔ میں کیوں ڈروں؟ اس دل کی دھڑکن پر مجھے اعتماد ہے۔ یہ میرے ہی لئے تو دھڑکتا ہے۔ بھٹکا پنچھی پھر اپنے آشیانے میں آ بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے ۔۔۔

" میں تجھ سے محبّت کرتا ہوں۔ میں تجھ سے ......"

لوگ تو کہتے ہیں طوطا بے وفا پرندہ ہوتا ہے۔ ایک بار اُڑا دو۔ پھر کبھی لوٹ کے نہیں آتا۔ پھر یہ آواز کیسی ہے؟ یہ پنچھی لوٹ کے آیا کیسے؟ میں نے تو اِسے اُڑا دیا تھا نا؟

یادوں کی اِس دُھندلی سی شام میں بس دو ہی دو سائے ہیں۔ میں اور ریاض....
ریاض اور میں...... میں، میرا ریاض...... !

میں کالی ساری پہنے بیڈمنٹن کورٹ کی طرف چلی جا رہی ہوں۔ ریاض آ کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

"بو بو بلقیس ! چاند کدھر سے نکلتا ہے ؟"

میں دونوں ہاتھ چھڑا کر اپنا مُنھ چھپا لیتی ہوں۔ اُنگلیوں کی کھڑکیوں میں سے شرما شرما کر ریاض کو دیکھ رہی ہوں۔ جو مجھ سے پوچھ رہا ہے ـــــ

"چاند کدھر سے نکلتا ہے ...... کدھر سے ......"

میں مُسکرا رہی ہوں۔

شرما رہی ہوں۔

میری تیرہ و تار زندگی سے غم کے اندھیرے مِٹ گئے ہیں۔ چاند کدھر سے نکلتا ہے ؟ کیا مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ میرا چاند میرے سامنے ہی جگمگا رہا ہے ـــــ ؟

کسی نے کہا ہے ـــــ

"زندگی مسرّت ہی مسرّت ہے !"

میں آنسوؤں کی جلتی مشعل لئے اُس شخص کا پتہ ڈھونڈ رہی ہوں جس کے ہونٹوں پر سدا بہار مسکراہٹ ہو۔ ایسی مسکراہٹ جس کے پہلو میں غم کی چُبھن نہ ہو لیکن کیا میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو سکوں گی۔ وہ چاندنی کدھر چُھپ گئی ہے ؟ اندھیروں کا کتنا بھیانک، کتنا گہرا سایہ ہے میرے خدا ! کیا میں نے

بھی کبھی چاند کا مُنھ دیکھا تھا؟ میرے اشکوں کے چراغ میرے دامن میں روشنی پھیلا رہے ہیں۔ لیکن یہ کیسا اندھیرا ہے؟ کہ چراغوں سے گھٹنے کے بجائے اور بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اب ان اندھیروں میں کون سی تصویر دیکھوں؟ سب سائے دُھندلے اور مبہم ہیں۔ جیسے کسی نے تیز دھوپ میں تصویریں کھینچی ہوں۔ مٹی مٹی اور غیر واضح۔

بس ایک تصویر باقی ہے جس پر میری نظریں پتھر بن کر جم گئی ہیں —— یہ میری ہی تو تصویر ہے۔ میرے دُلہناپے کی۔ لیکن اس تصویر کو دیکھنے سے پہلے مجھے وہ تصویریں بھی تو دیکھنی ہوں گی جو دُھندلا ضرور گئی ہیں لیکن یادوں کے اُفق پر اب بھی جھلملاتی ضرور ہیں!

ریاض کو اسٹیشن پہنچا کر اور اسے "سی آف" کر کے جب ہم لوٹ رہے تھے تو نعیم بھیا نے مجھے بھرپور دلاسا دیا تھا۔

"بُری بات ہے بلقیس! روتے نہیں یوں۔ اور پھر ریاض ایسے کون کالے کوسوں گیا ہے؟"

اُنھوں نے اپنا رومال دیا۔

"لو یہ آنسو پونچھ ڈالو۔ بُری بات ہے۔ لوگ تو سمندر پار چلے جاتے ہیں۔ یہ کیا بزدلی ہے؟"

میں نے آنچل سے آنکھیں صاف کر کے اُنھیں دیکھا۔ گھبرا کر دیکھا، سہم کر دیکھا۔ میں آگے ہی کہتی تھی یہ پنچھی بُرا ہوتا ہے۔ پنچھی کی تان کتنی اونچی تھی؟ کیا چاروں کھونٹ اُس کی آواز پہنچ گئی ہے؟ کیا —— میری محبّت کا راز آشکار ہو گیا ہے —— ؟

کار کو دھیمی رفتار پر چھوڑ کر نعیم بھیا نے میری توجہ کو بٹانا چاہا۔

"دیکھو یہ کنگ کوٹھی ہے —— یہ بشیر باغ ہے —— اور ہاں دیکھو تم روؤ نہیں —— دیکھو تو تمھارا دل بہلانے کے لیے میں کتنا بڑا چکر کاٹ کے کار گھر لے جا رہا ہوں۔"

میں نے کانپ کر اُنھیں دیکھا ـــــ

ہلا دی ـــ مجھے اس لفظ سے چڑ ہے۔ میں نہیں چاہتی کوئی میرے غم پر اپنی آنکھیں نم کرے!

ستارے ڈوبتے ہیں تو اندھیرا ہو جاتا ہے۔ یہ بہت پرانی بات ہے ریاض! لیکن ستاروں کے اُبھرنے سے جو اُجالا ہوتا ہے وہ کہاں ہے؟ دیکھو نا میں نے کتنے سارے ستارے روئے ہیں۔ مگر یہ اندھیرا؟ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ریاض! کہ تم نے مجھے دکھ دیا۔ یہ تو میری لازوال دولت ہے جسے میں خوشی سے سنبھالے ہوئے ہوں۔ جس پر میں نازاں ہوں۔ لیکن میرے رحمدل ساتھی! کبھی یہ بھی سوچا کہ میرا نازک سا دل اتنے سارے غموں کا بوجھ کیسے سنبھالے گا؟

نعیم بھیّا اس دن میرے آنسو پونچھتے آئے تھے۔ میرا دل بہلانے کو سارا شہر میں گھماتے ہوئے لائے۔ اور اب مجھے اس بات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہر کے کامیاب بیرسٹر تھے اور تم ڈھائی تین سو روپے پانے والے ایک معمولی سے ڈاکٹر۔ اور پھر یہ ہوا کہ زندگی بھر کے لئے نعیم بھائی نے میرے آنسو پونچھنے کا ٹھیکہ لے لیا۔ میرے دل بہلانے کا ذریعہ بن گئے۔ چم چماتی کار اور اونچی سی سفید بلڈنگ۔ کیا میرے زخموں کا مرہم ہو سکتی ہے ریاض؟! کیا محبّت کا مارا دل کار میں گھوم کر اور نرم صوفوں پر بیٹھ کر مطمئن ہو سکتا ہے؟ اب مجھے یاد آتا ہے ریاض! کہ اُجالا ہوتے بہت دیر لگتی ہے۔ سورج ہو یا چاند۔ گھنٹوں ہیں اپنی مسافت طے کرتا ہے۔ تب کہیں جاکر اُجالا پھیلتا ہے۔ لیکن اندھیرا؟ وہ تو پل بھر میں گھس آتا ہے۔ ذرا سورج کے چہرے پر بدلی چھائی اور اندھیرے چھائے۔ میرے چاند! تم نے تو اپنا مُنھ بدلی میں چھپا لیا ہے۔

اور اب اندھیروں کا ذکر ہی کیا ہے کہ زندگی ہی آنسو بن کر رہ گئی ہے۔ کبھی کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں کائنات کی آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک درد بھرا آنسو ہوں۔ جسے کسی دامن میں پناہ نہ ملی۔!

یہ تصویر دیکھ رہے ہو تم ؟؟

میں دلہن بنی بیٹھی تھی۔ پھولوں، خوشبوؤں، زیوروں سے لدی ہوئی، میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ کیا میرے جسم کو اُن آرائشوں کی ضرورت تھی ریاض؟ پھر یہ کیسا انصاف تھا۔ ہر طرف کھنکتے ہوئے قہقہے تھے اور بے فکر ہنسی۔ لیکن تم کہاں تھے اور میں کہاں تھی؟ کیسا کھیل ہے یہ میرے معصوم ساتھی۔ دلوں کی دنیا اُجڑتے کیا دیر لگتی ہے۔ ابھی روشنی تھی، ابھی اندھیرا ہے۔ ابھی مسکراہٹ تھی ابھی آنسو ہیں۔ اور بالوں میں برف کے، راکھ کے تودے!

میں نعیم کی دولہن بن کر آ گئی۔ دن گزرتے چلے گئے۔ اور تم ——؟ ہر موڑ پر تمھاری یادوں کے، تمھاری انمٹ محبتوں کے نقش گہرے اور گہرے ہوتے چلے گئے۔ لوگ تو بھول بھال بھی گئے کہ تم نے کبھی خودکشی کی۔ چار دن سوگ رہا۔ اور پھر وہی زندگی اور زندگی کے ہنگامے۔ مرنے والے کے ساتھ کون مر جاتا ہے ریاض! لیکن میں آج بھی ہر روشن ستارے کو دیکھ کر پوچھتی ہوں، جس دل میں تو بستا تھا وہ دل کہاں کھو گیا؟

ریاض! تمھارے دل کی دھڑکن بہت مضبوط تھی۔ بہت تیز، مجھے اس پر کل بھی اعتماد تھا اور آج بھی ہے۔ لیکن یہ جو کچھ ہوا، اس میں میرا تمھارا کوئی قصور ہے؟

آج بھی میرے سینے پر پتھر جیسے رکھے ہیں۔ لیکن یہ بوجھ ٹلے تو کیسے؟ میری حالت دیکھو تو سہی۔ آنکھیں بے نور سی ہو چکی ہیں۔ بالکل کم دکھائی دینے لگا ہے۔ ہاتھ تھرتھرانے لگے ہیں۔ بالوں پر برف پڑ چکی ہے۔ اور یہ کچھ مجھے اب آنسوؤں کے ساتھ یاد آتا ہے کہ اِس دل کی ہر ہر ادا پر تم کیسے فدا تھے؟ — پھر کیا یہی تمھاری محبت تھی؟؟

میں نے البم کا ایک ایک ورق الٹ دیا ہے۔ اب کیا رہ گیا ہے؟ کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔

اب کبھی کسی کا فون آتا ہے اور مجھے ریسیو کرنا پڑتا ہے تو میرے ہاتھ کانپ اٹھتے ہیں۔ ریسیور کا وزن مجھ سے سنبھلتا نہیں۔ اور میرے ذہن میں پچھلی تصویریں اُبھرنے لگتی ہیں۔

یہ سب کچھ تو ہو گیا ریاض! لیکن میں آج بھی سوچتی ہوں اگر کوئی چپکے سے آکر میرے دونوں ہاتھ پکڑے اور پوچھے۔

"بولو چاند کدھر سے نکلتا ہے؟"

تو میں یوں چھپانے کو تو اپنا منہ چھپا لوں۔ لیکن میں کیا جواب دوں گی کہ چاند کدھر سے نکلتا ہے؟"

میرے پورن ماشی کے چاند! تم تو اُفق کی پہنائیوں میں ڈوب چکے ہو۔ اب میں کیا جواب دوں گی؟ میرے بالوں پر برف پڑ چکی ہے۔ ہاتھ کانپنے لگے ہیں۔ بے نُور آنکھوں نے بجھے ہوئے چراغوں کا رُوپ دھار لیا ہے۔ لیکن اب تک بھی کوئی پوچھنے نہیں آیا۔ نہ سہی۔ لیکن اتنا بتا دو میرے اپنے ریاض! اگر کوئی آ ہی گیا تو ——

تو میں کیا جواب دوں گی ——؟

—— کیا جواب دوں گی ——؟؟

———— ✻ ————

پھانس

"کسی بھی حالت میں فوراً پہنچ جاؤ ـــــ!"

تار ملتے ہی شنازی کی حالت غیر ہوگئی ـــــ تار بھیجنے والے کا نام انور تھا، یقیناً یہ تار اس کی پیاری باجی نکہت کے میاں کی طرف سے تھا ـــــ اُنھوں نے کوئی اشارہ تک نہیں دیا تھا کہ کیوں اُسے فوراً پہنچ جانے کے لئے کہا گیا ہے۔ لیکن اس کا دل رہ رہ کر گواہی دے رہا تھا کہ یقیناً باجی کی حالت نازک ہے ـــــ میرے منہ میں خاک ـــــ وہ بستر مرگ پر ہیں۔ ورنہ ـــــ ورنہ کبھی انور بھائی ایسا تار نہ دیتے ـــــ" اس صورت میں کہ شادی کے بعد کئی سال گزار لینے کے باوجود آج تک دونوں بہنوں میں کسی قسم کی خط و کتابت نہ تھی اور نہ کبھی ملی ہی تھیں۔

عورت سارے راستے بھول جاتی ہے، لیکن زندگی بھر ایک راستہ کبھی نہیں بھولتی ـــــ میکے کو جانے والا راستہ! پھلواڑن چاہے کتنی ہی گندی ہو، اُس کے پاس سے سدا پھولوں کی خوشبو آتی ہے۔ یہی حال میکے کا ہے۔ میکے میں عورت نے لڑکی کے روپ میں کیسی ہی تکلیفیں اٹھائی ہوں۔ میکے کی یادیں کتنی ہی سنگین کیوں نہ ہوں، پھر بھی اُن کانٹوں میں سدا ایک پھول مہکتا رہتا ہے ـــــ یادوں کا پھول! ـــــ سدا بہار پھول!!

شازی تار پاکر تڑپ اُٹھی ـــــ اُس کے میکے کی جیتی جاگتی نشانی لے دے کے صرف ایک باجی ہی تو رہ گئی تھیں۔ ماں باپ کبھی کے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ ایک بھائی تھا جو بچپن ہی میں ختم ہو چکا تھا۔ یادوں کا تمام تر مرکز صرف باجی تھیں۔ لیکن کس قدر عجیب بات تھی کہ وہ دل و جان سے آنا چاہنے کے باوجود کبھی نکہت سے مل سکی نہ خط و کتابت کا ذریعہ ہی باقی رہا۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ بہت سالوں پہلے جب نکہت بیاہی جا چکی تھی، امّی ابّا دونوں زندہ تھے ـــــ شازی ابھی تعلیم حاصل کر ہی رہی تھی کہ اُس کے لئے اقبال کا پیام آگیا۔ نکہت اُس پیام پر سخت معترض تھی ـــــ "امّی ابّا بوڑھے ہو چکے ہیں۔ یہ کام میرا اور انور کا ہے کہ ہم تمھارے بُرے بھلے کے بارے میں سوچیں، اور شازی! یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ہم خالہ بی کے پالے ہوئے لڑکے سے تمھاری شادی کر دیں۔"

خود شازی کا اپنا یہ خیال تھا کہ کم سے کم باجی کی طرح بی۔ اے تو کر ہی لے۔ بُری گھڑی پوچھ کر نہیں آتی۔ اللہ نہ کرے کبھی بُرا بھلا وقت آگیا تو اتنی تعلیم تو رہے کہ نوکری کر کے اپنا پیٹ آپ پال سکے ـــــ لیکن اقبال کی دیوانی محبت کچھ بھی نہ ہونے دیتی ـــــ! ایک دو دن ٹلے نہیں کہ وہ اپنی لمبی سی گاڑی لے کر آن موجود! ـــــ وہی تاک جھانک کا سلسلہ ـــــ وہی راستہ روک کر ہلکی سی چھیڑ چھاڑ ـــــ کبھی اِس کمرے سے اُس کمرے میں جانے تک شازی کو روک لینا اور اظہارِ محبت کر ڈالنا ـــــ "یقین کرو شازی میں خودکشی کر لوں گا ـــــ اگر تم نے ہاں نہ کی!"

باجی سے یہ ساری باتیں پوشیدہ نہ تھیں۔ خیر محبت کی سرگوشیاں وہ بھی سُنتیں لیکن دن رات تحائف جو چلے آ رہے تھے۔ کبھی قیمتی ساڑیاں، کبھی جڑاؤ زیور (جو شازی کی کمزوری تھے)، کبھی فارن کی خوشبوئیں ـــــ کبھی اس اعتراف کے

ساتھ میک اپ کا سامان کہ "شازی! تم تو خود ایک حور ہو تمھیں میک اپ کی بھلا کیا ضرورت ہے؟" یہ ساری باتیں تو وہ خود کھُلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ اُنھیں اصل اعتراض اقبال کے چھچھورپن پر تھا۔ پیسہ پاکر کوئی یوں اپنی اوقات نہیں بھول جایا کرتا۔ امّی ابّا کو ذاتی طور پر قطعاً کوئی اعتراض نہ تھا۔ آنکھوں کے سامنے پلا بڑھا اچھے خاندان کا لڑکا تھا۔ صرف یہ تھا کہ اُس نے خالہ بی کے ہاں برتن بھانڈے تک دھوئے تھے۔ بازار سے کوڑی پھیرا کر کر کے سودا سلف لایا تھا۔ دھوبی کی طرح دھنا دھن گھر بھر کی غلاظت سے بھرے کپڑے دھوئے تھے اور گھر پر جو ماسٹر صاحب پڑھانے آتے تھے اُن کے آگے بیٹھ کر ہِل ہِل کر قرآن شریف پڑھا تھا۔ جوتے کھا کھا کر جھُوم جھُوم کر آگے پیچھے ڈول ڈول کر ا۔ ب۔ ت سے شروع کر کے پورا قاعدہ ختم کر ڈالا تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پانچویں میں داخلہ لے لیا تھا۔ اور پھر ایسا پڑھا ایسا پڑھا کہ کسی کے پیسے کی حاجت رہی نہ ہاتھ پھیلانے کی۔ ہر کلاس میں پہلا نمبر آنے پر وظیفہ ملتا رہا اور بی۔ اے کر کے جب اُس نے خالو صاحب کو سلام کیا تو انھوں نے خوش ہو کر پانچ سو روپے انعام دیئے۔ اُسی پانچ سو سے اُس نے چلتر سامان کی چھوٹی سی دو کان ڈال لی ——— جو بڑھتے بڑھتے "اقبال اینڈ سنز" بن گئی۔ پہلے پہلے خاندان بھر میں اُس "اینڈ سنز" پر بڑی ہنسی مچی مگر اقبال نے بڑی خوشدلی سے جواب دیا ——— "ارے باپ موجود ہے تو بیٹے بھی آجائیں گے!" پہلے دُکان میں ایک نوکر بڑھا۔ پھر دوسرا نوکر آیا پھر دُکان وسیع کی گئی۔ پھر فون آیا۔ پھر گھر خریدا گیا۔ پھر گھر میں فون لیا گیا۔ پھر فرج کی باری آئی لیکن گھر چھوٹا محسوس ہوا تو بڑی سی جگہ خرید کر خوبصورت سا بنگلہ بنوایا گیا۔ پھر گاڑی آئی۔ پھر چھوٹی کی بجائے لمبی گاڑی آئی۔ پھر آنکھوں میں حسین خواب آئے۔

خوابوں میں ایک حسین پیکر آیا ـــــ وہ حسین مورت جس پر دل بچپن سے فدا تھا ـــــ جسے دیکھنے سے آنکھوں میں ٹھنڈک بھر جاتی تھی اور دل پھول کی طرح کھل اٹھتا تھا۔ جب وسیلے ساتھ ہوں تو انسان چاند پر بھی ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ پھر شازی تو اسی زمین کا چاند تھی ـــــ اور لڑکیاں تو ہوتی ہی اسی لئے ہیں کہ خوبصورت ہوں، پڑھی لکھی ہوں دُنیاوی آداب سے آشنا ہوں تو اچھے بُرے لڑکے آئیں اور بیاہ لے جائیں۔ پھر اقبال میں کون سی کمی تھی ـــــ ؟ یہ سب باتیں امی ابا سوچتے تھے، لیکن پتہ نہیں نکہت کے دل میں کون سی گرہ تھی جو کُھلنے ہی میں نہ آتی تھی۔ وہ خود بی۔ اے پاس تھی، خوبصورت تھی، دو پیارے بچّوں کی ماں تھی۔ لیکن وہ جو بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ "اولاد مرد کے نصیب سے، دولت عورت کے نصیب سے!" تو یہ تو خدا کا شکر تھا کہ اس نے صاحب اولاد کیا تھا کہ ایک لڑکی، ایک لڑکا، دو دو پھول عنایت کر دیئے تھے، لیکن جہاں تک دولت کا تعلق تھا وہ بس یونہی سی تھی۔ انور کسی دفتر میں تین سو روپے پاتا تھا اور یہ روپے کھاتے پیتے برابر ہو جاتے تھے۔ نکہت کو گھر کا کام کاج خود کرنا پڑتا تھا۔ کبھی چولھے میں گھسی ہوئی ہے، کبھی بچّوں کو سمیٹ رہی ہے۔ میاں کے دوست آجائیں تو خاطر داری کو لپک رہی ہے ایسے میں بچّوں کا شور شرابہ، رونا دھونا سکون برباد کر دیتا ـــــ اقبال کے ہاں کی زندگی تقریباً مغرب زدہ تھی۔ لمبی سی میز تھی۔ کھانے والا ہی ایک تھا، مؤدب بیرا کھانے تک سروس بجاتا رہتا۔ پھر آئے دن کی پارٹیاں تھیں، جن میں وہ خاندان کے سبھی لوگوں کو بلاتا، جن جن کا نمک کھایا تھا، سبھی کو مدعو کرتا ـــــ اور مُنہ در مُنہ ہوتی ہوئی باتیں یہاں سے وہاں تک پھیل جاتیں کہ اقبال تو ایسی زندگی گزار رہا ہے کہ بس ـــــ!

نکہت نے جب کمر ہی باندھ لی کہ اس پیام کو رد کرنا ہی ہے تو شازی کی بھی آنکھیں

کھلیں۔ کون لڑکی ایک محبّت بھرے دل کے ساتھ زندگی کا عیش و عشرت نہیں چاہتی۔
پھر باجی اِس آڑ کو لیکر کیوں بیٹھ گئی ہیں کہ وہ کسی زمانے میں پالا ہوا لڑکا تھا۔ اچّھی لڑکی
پانے کے لئے تعلیم، شخصیت، وجاہت، دولت اور محبّت کے ساتھ جو رکھ رکھاؤ ضروری
ہوتا ہے وہ سب تو اقبال میں موجود ہے ہی۔ بے پناہ چاہت پھر پتہ نہیں نصیب ہو یا
نہ ہو۔ ایک دن اقبال آکر گیا ہی تھا۔ پاس وہ پیکٹ بھی پڑا ہوا تھا جو شازی نے ابھی کھول
کر دیکھا تک نہیں تھا۔ نکہت اُدھر سے گذری تو شازی نے پاس پڑا تکیہ اُٹھا کر اُس
پر رکھ دیا۔

نکہت چڑ کر بولی۔

"امّی ابّا بھلے ہی اتنے روشن خیال ہیں تو ہولیں کہ کسی کنوارے غیر لڑکے کا آنا جانا
لین دین، ہنسی مذاق مائنڈ نہ کریں، لیکن شازی! میں ان باتوں کو اچّھا نہیں سمجھتی۔"

شازی نے بڑی بڑی خوابناک آنکھیں اٹھا کر کہا — "غیر —؟ باجی! جب
کوئی لڑکی کسی لڑکے کو اپنے من مندر کا دیوتا بنا لیتی ہے تو کسی طرح کی غیریت باقی نہیں
رہ جاتی۔ میں اقبال کو اپنا شوہر مان چکی ہوں!"

دونوں بہنوں میں آج تک اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی اور جو ہوئی تو ایسی
کہ کسی قسم کی کوئی جھجک ہی باقی نہ رہی۔ اتنی دیدہ دلیری سے شازی نے کیسے اُس کے
سامنے بے حجابانہ ایسی باتیں کر دیں —؟ اس کی شادی تو ماں باپ نے طے کی تھی۔
اُس نے تو دخل تک نہ دیا تھا۔ پھر یہ شازی کس طرح ایسی آزاد ہو گئی؟" نکہت نے
بے حد غصّے کے ساتھ تقریباً چلّا کر کہا۔

"شازی تم بھول رہی ہو کہ میں تمھاری بڑی بہن ہوں اور یہ کہ ہماری مشرقی تہذیب کے
اپنے چند اصول ہیں۔ کیا تم ایک ایسے لڑکے کو بطور شوہر قبول کر کے خوش رہ سکو گی، جس نے

دعوتوں میں بارہا تمھارے جھوٹے ہاتھ دُھلائے ہیں ـــــ؟"

نکہت نے سوچا تھا شازی کو اس طرح گرا کر یاد دلانے سے اقبال کا بچپنا سوچ کر بھڑک اُٹھے گی۔ لیکن اس نے بے حد پیار سے جواب دیا۔

" باجی! وہ ہاتھ جو آج اتنی محبّت سے میری طرف بڑھے ہیں، بچپن سے ان آنکھوں کے سامنے رہے ہیں ـــــ اور پیار سے جو ہاتھ آگے بڑھتا ہے وہ حقیر نہیں بے حد عظیم ہوتا ہے!"

نکہت حیران رہ گئی۔ سمجھ گئی کہ شازی اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کبھی نہ کرے گی۔ نہ وہ بچّی تھی نہ جاہل، اپنا بُرا بھلا تو خود بھی سمجھ سکتی تھی۔ وہ نکہت کی بے بُنیاد سی بات کو کہ اقبال کا ماضی ذلیل تھا، کسی صورت سے ماننے کو تیار نہ تھی۔ نکہت اُسی دن یہ فیصلہ سُنا کر اپنے سُسرال چلی گئی کہ " میں ایسی شادی میں شرکت کر کے خود کو ذلیل نہیں کرنا چاہتی جہاں نوکروں کو دامادوں کا درجہ دیا جائے ـــــ اور نہ اب میں کبھی شازی سے ملنا ہی پسند کروں گی!"

دن کیسے بیت جاتے ہیں! ہوا کی مانند ـــــ ان کے بھی جو عیش و عشرت میں مگن ہوتے ہیں اور ان کے بھی جن کی زندگی کی کتاب کا ہر ہر ورق مصیبتوں اور کلفتوں سے عبارت ہوتا ہے۔ ان تمام سالوں میں دونوں بہنوں میں کسی طرح کی خط و کتابت رہی نہ وہ ملیں ہی ـــــ دُنیا کا کوئی سُکھ ایسا نہ تھا جو شازی نے اٹھا نہ لیا ہو۔ تین پیارے پیارے بچّوں کی وہ ایک خوش ترین ماں تھی، جس میں ایک گڑیا سی بیٹی اور دو بیٹے تھے۔ اِس طرح اقبال اینڈ سنز واقعی اقبال اینڈ سنز بن چکی تھی ـــــ سُکھوں کے ہنڈولے میں جھولتی ہوئی شازی کبھی کبھی دل میں ایک کسک سی محسوس کرتی ـــــ

میکے کی تڑپ۔ شوہر کا بے پناہ پیار اُسے میسّر تھا۔ بچّے تھے۔ شاندار پُر وقار کوٹھی، ہر جدید فیشن اور فرنیچر سے آراستہ، پہننے کے لئے بے پناہ حسین ملبوسات، کپڑے، جواہرات، سواری کے لئے دو دو خوبصورت کاریں اور میاں کی وہ چاہت کہ نئی نویلی دلہنیں رشک کریں۔ غم اور آلام عورت کو بوڑھا بناتے ہیں۔ دن اور رات کی کسی گردش نے کسی عورت کو آج تک بڑھاپے کا راستہ نہیں بتایا۔ بتایا ہے تو شوہر کی عدم توجہی، بے قدری، غربت و افلاس اور بدلی ہوئی نگاہوں نے ـــــ اسی لئے شازی اتنے سال گزر جانے پر بھی اُسی طرح شاداب، جوان اور اُمنگوں سے بھرپور تھی، جیسے ڈالی پہ کھِلا ہوا تازہ تازہ گُلاب! ان تمام باتوں کے ہوتے بھی کبھی کبھی شدّت سے اُس کا جی چاہتا، اپنے میکے کی ایک ہی نشانی، باجی سے ملے۔ باجی سے خوب باتیں کرے، باجی کے ہاں جائے۔ اُنھیں اپنے ہاں بُلائے۔ اُنھیں تحفوں سے لاد دے۔ اُنھیں ہر ممکن خوشی دے سکے۔ بے حد خلوص اور محبّت کے ساتھ اُنھیں یہ بھی بتائے کہ "دیکھئے باجی آپ کے تمام تر خدشے کتنے بے بنیاد ثابت ہوئے۔ آپ کو یہ فکر تھی کہ اقبال چھچھورا ہے، وہ مجھے خوش نہ رکھ سکے گا۔ زیادہ دولت ہاتھ آئی ہے۔ مجھے چند روز بعد مسلی ہوئی کلی کی طرح پھینک دے گا اور نئے نئے ساتھی عیش و طرب کے لئے ڈھونڈھے گا۔ کتنے سارے خدشات آپ کو تھے۔ دیکھئے اقبال نے مجھے کس طرح خوش رکھا ہے، کس طرح میرے دل کو اپنی محبّت سے اور اپنے دل کو میری محبّت سے بھر رکھا ہے کہ کہیں بھی زندگی میں ہلکا سا دُکھ کا نام و نشان تک نہیں۔ اسی محبّت کی فراوانی نے میری جوانی کو کبھی نہ مرجھانے والا سدا بہار پھول بنا دیا ہے!" وہ یہ سب سوچتی لیکن اتنی ہمّت نہ پاتی کہ خط لکھے یا اُنھیں بُلائے ـــــ سوچتی اگر باجی نے دھتکار دیا یا میرا محبّت بھرا بُلاوا

قبول نہ کیا تو میں برداشت نہ کر سکوں گی۔ اقبال بھی شاید اچھا نہ سمجھے۔

اور آج ـــــ

اور آج اچانک اُسے میکے سے بُلاوا آگیا۔ لیکن اس کے دل نے اسے آگاہ کیا، یہ خوشی کا تو نہیں ہے۔ یہ بُری گھڑی ہے۔ اس کا دل رہ رہ کر کہہ رہا تھا۔ کچھ ہونے والا ہے، کچھ ہونے والا ہے ـــــ تار ہاتھ میں لئے، کتنی ہی دیر تو وہ یونہی کھڑی ماضی کی ہر ہر بات سوچا کی۔ پھر اِکدم تیزی سے اقبال کے کمرے کی طرف دوڑی۔

"اقبال ـــــ پلیز اقبال جلدی کرو۔ ہمیں فوراً جانا ہے!"

اقبال ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا ـــــ "کیا ہوا شازی ڈیر؟ اتنی گھبرا کیوں رہی ہو ـــــ ہوا کیا؟"

اِکدم شازی بچّوں کی طرح رونے لگی ـــــ "اقبال! باجی کی طبیعت بے حد خراب ہے۔ دیکھ لو انور بھائی نے بُلایا ہے۔"

اقبال اس کی تسلّی کے لئے ہنس کر بولا ـــــ "تم تو پاگل ہو میری جان! اس تار سے یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ اللہ نہ کرے باجی علیل ہیں؟"

"اقبال ـــــ بعض باتیں دل خود سمجھا دیتا ہے۔ تم چلو۔ ابھی چلو پلیز!"

لیکن اتنے سالوں میں کیا پتہ انور صاحب کا تبادلہ کہیں اور ہو چکا ہو۔ ہمیں اُن کا پتہ بھی تو نہیں معلوم۔ پہلے تو شاید وہ کلکتے ہوا کرتے تھے۔"

"میں نے تار پر دیکھ لیا ہے وہ کلکتے ہی سے آیا ہے۔ تم پلیز فوراً پلین سے سیٹیں بُک کروا لو"

"میری جان! پریشانی میں تم بالکل بدحواس ہو رہی ہو۔ بغیر ریزرویشن کے ہم اس طرح کیسے ٹکٹ حاصل کر سکتے ہیں۔ ذرا تو سوچو۔ ٹھہرو میں پہلے کال کر لوں ـــــ"

جب تک اقبال ٹیلیفون پر بات کرتا رہا شازی کئی بار مری کئی بار جی۔

بستر پر ہڈیوں کا ایک ہار سا پڑا ہوا تھا، جسے پہچاننے میں شازی کو دیر نہ لگی۔ اُف! اُس کی پھول جیسی باجی! اُس نے آنسوؤں کو آنکھوں ہی میں پی لینے کی ناکام سی کوشش کی۔

"انور بھائی ــــ باجی کی ایسی حالت کب سے ہے؟ آپ نے مجھے پہلے سے اطلاع تو دی ہوتی کبھی ــــ"

انور پھیکی سی ہنس کر بولا ــــ" وہ اطلاع دینے دیتی تب نا ــــ؟ ڈاکٹرز نے آخری اسٹیج بتایا ہے۔ میں نے سوچا اب تو آپ کو اطلاع دے ہی دوں۔" وہ حالات کے ہاتھوں خاصا بے حس ہو گیا تھا۔ بے حد احساسات سے عاری لہجے میں وہ نکہت کی بیماری کی تفصیل بتا رہا تھا ــــ اتنے میں نکہت نے آنکھیں کھول دیں ــــ اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر سے مُوند لیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔" کئی بار ایسا ہو چکا کہ معلوم ہوتا ہے آخری لمحہ آگیا۔ لیکن جانے کون سی پھانس اِن کے دل میں اٹکی ہوئی ہے کہ پھر وہی حالت، وہی تکلیف، وہی حالت ہو جاتی ہے۔ لیکن مشکل آسان نہیں ہو سکتی۔"

شازی نے کمرے پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ انتہائی غربت کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ تین سو روپے پانے والا شوہر اتنی طویل بیماری سے اگر یوں اکتا جائے تو شاید بے جا نہیں۔ اُس نے لرز کر سوچا۔

نکہت نے ایک بار اور آنکھیں کھولیں اور جیسے شازی کو بہت کوشش سے پہچان کر دھیمے دھیمے بولی۔

"ارے ـــ تو ـــ شازی .....؟"

شازی اُس پر جھکی۔ آنسوؤں کے مارے بات نکلتی نہ تھی۔ "ہاں باجی! انور بھائی نے مجھے تار دیا اور میں اُڑی چلی آئی ـــ اب آپ ....." لیکن نکہت نے بات کاٹ کر دھیمے سے پوچھا۔

"اُڑی چلی آئی ـــ؟ پلین سے ـــ؟ لیکن مجھے تو..... کسی نے بتایا تھا کہ..... اقبال کی فرم ڈوب گئی..... وہ دیوالیہ ہو گئے..... پھر....." یکدم شازی کی آنکھوں سے بادل ہٹ گئے۔ وہ سکون کا سانس لے کر بولی۔

"باجی ـــ آپ نے غلط نہیں سُنا تھا۔ واقعی ہم دیوالیہ ہو گئے۔ زندگی میں بہت سُکھ اٹھالیا تھا باجی اُسی کی یہ سزا تھی....."

نکہت کے چہرے پر ایک جوت سی جاگی ـــ "پھر اقبال اب.... کیا کرتے ہیں.... غریبی کے ہاتھوں پریشان ہو کر..... وہ تم سے اچھا سلوک تو نہ کرتے ہوں گے؟"

شازی نے اس کے ماتھے پر بے حد پیار سے اپنا ہاتھ رکھ دیا ـــ "باجی بس یہ سمجھ لیجئے زندگی ہے۔ گزارنی پڑ رہی ہے۔ وہ پیار و محبت تو ایک خواب تھا جو بیت چُکا ـــ"

اب اقبال اور انور باہر جاکر باتیں کرنے لگے تھے۔ اقبال شازی کے اچانک بدلے ہوئے رویئے سے سخت بدحواس ہو کر باہر نکل گیا تھا۔ انور بھی اُسی کے پیچھے لپک پڑا تھا۔ انھیں جاتے دیکھ کر نکہت نے آخری سوال بہت مشکل سے ادا کیا۔ تمھارے بچے ـــ سُنا تھا تین بچے۔ کہاں ہیں ـــ لائیں نہیں؟"

شازی بے چارگی سے بولی ـــ "باجی اتنا کرایہ کہاں سے لاتی کہ سب کو ساتھ لے آتی۔

پڑدسن کے ہاں چھوڑ آئی ہوں ——" (اُس کی آنکھوں میں اپنے تینوں موٹے تازے صحت مند شریر بچے گھوم گئے جو اپنی اپنی آیا پر لدے ہوئے ہوں گے —— !)

نکہت کے چہرے پر ایک نور سا چھا گیا۔ اُس نے آخری بار بہت محبت سے شازی کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا —— "ہم دونوں ہی ایک کشتی کی سوار ہیں شازی! ہم دونوں ہی ....." اور اکدم دیکھتے ہی دیکھتے ایسی آسانی سے اُس کا دم نکل گیا جیسے غبارے میں سے ہوا نکل جائے —— !

شازی کی چیخوں کی آواز سُن کر دونوں مرد کمرے میں لپکے ہوئے آئے۔ انور نے سفید چادر نکہت کے چہرے تک کھینچ دی۔ اقبال شازی کو سنبھالتا ہوا کمرے کے باہر لے آیا۔ وہ اُسے چمکارتا ہوا بولا۔

"شدید غم نے تمھیں بد حواس کر دیا ہے شازی ڈیر! ذرا کھلی ہوا میں سانس لو اور مجھے یہ بتاؤ تم نے نکہت باجی سے ....."

شازی سسک اُٹھی —— تم نہیں سمجھو گے اقبال! تم نہیں سمجھ سکو گے —— میں نے باجی کے سینے سے وہ پھانس نکال دی ہے جس نے انھیں سکون سے مرنے سے روک رکھا تھا ...... میں یہ سب نہ کہتی تو وہ کبھی سکون سے نہ مر پاتیں ...."

اقبال واقعی کچھ نہ سمجھ سکا ——

شیشۂ دل

آج کی رات دل پہ کس قدر بھاری ہے ۔۔۔!!

باہر زور دار بارش ہو رہی ہے ۔۔۔ سرد اور کٹیلی ہوائیں کوٹھی کے در و دیوار سے ٹکرا رہی ہیں ۔۔۔ میں نے شیشے کے دریچے سے اپنی ناک لگا کر ابھی ماحول کی ٹھنڈک محسوس کی ہے ۔۔۔ بارش لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی ہے جیسے آج برس کر پھر کبھی نہ برسے گی ۔۔۔ آج میں یوں محسوس کر رہی ہوں کہ یہ بوندیں، آسمان کے آنسو ہیں۔ شاید اُسے بھی میرے غم پر رونا آ رہا ہے۔ سائیں سائیں کرتی ہوا جب کمرے میں چکر لگاتی ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ہوا میرے حالِ تباہ پر سسکیاں بھر رہی ہے۔ آسمان پر بجلیاں بھی نہیں چمکتیں کہ زندگی کی تاریکی میں ذرا سی روشنی کا احساس ہی دل کو خوش کر دے۔ آج تو ہر طرف تاریکی ہے۔ ہر سو اندھیرا ہے۔ ستاروں کی طرح روشنی بکھیرنے والے لمحات تو کب کے گزر چکے۔ آج تو صرف آنسو ہیں اور کراہیں ۔۔۔ آج کی رات !!

آج سے پہلے میں کس قدر خوش تھی؟ کس درجہ مطمئن؟؟ دل کے نہاں خانوں میں چھپے غم کون دیکھ سکتا ہے بھلا ۔۔۔؟ میں نے اپنے غموں پر خوشیوں اور مسکراہٹوں کا رنگین پردہ ڈال رکھا تھا جو اتنا دبیز تھا کہ غم کی کرنیں کبھی اُس کے آر پار نہ چمک سکیں اور دیکھنے والوں نے یہی سمجھا کہ مجھ سا خوش بخت اس دنیا میں کوئی نہیں ۔۔۔ میں

نے خود اپنے آپ کو اس قدر بھرپور دھوکا دیا تو دوسروں کو دھوکے میں رکھنا کون سی مشکل بات تھی ـــــ ؟ لیکن آج سارے بھرم کھل گئے ہیں۔ آج دل کا ہر داغ نمایاں ہو گیا ہے ـــــ اور میں بے حد حیرت کے ساتھ سوچ رہی ہوں کیا کسی کے منہ سے نکلا ایک ننھا سا جملہ میری خوشیوں کو پامال کر سکتا ہے ـــــ ؟

میں نے ابھی نگاہیں اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا ہے۔ آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ سیاہ بادلوں کے اس پردے کے پیچھے ستارے بھی ہوں گے، بجلیاں بھی، لیکن سیاہی نے روشنی کو نگل لیا ہے۔ اب صرف رات کا بے پناہ اندھیرا ہے بارش اتنی ہی شدت سے ہو رہی ہے۔ میں چاہتی ہوں آج اتنی بارش ہو، اتنی بارش ہو کہ اس پانی میں سب کچھ بہہ جائے ـــــ سب کچھ ڈوب جائے ـــــ میں اپنے غم، اپنی حسرتیں، اپنے دُکھ، اپنا وجود تک بھول جاؤں۔ لیکن میں جانتی ہوں ایسا نہیں ہوگا۔ بارش بھی تھم جائے گی، چاند بھی چمک اٹھے گا، ستارے بھی نکل آئیں گے، لیکن میں اپنے سدا بہار غم کو لئے لئے یادوں کے کھنڈر میں بھٹکتی رہوں گی۔ گلِ لالہ کے داغ کی طرح محبت کے اس داغ کو ہمیشگی حاصل ہو گئی ہے۔

رات میرے ارمانوں کی طرح تاریک ہے۔

آج دوپہری کی بات ہے خالد نے ایک پارٹی ارینج کی تھی۔ بہت سے مہمانوں کے ساتھ ساتھ اس نے آفتاب کو بھی اِنوائٹ کیا تھا۔ خالد نے آج میرے لئے خاص طور سے ایک ساڑی خریدی تھی ـــــ ننھے ننھے گلاب کے بے شمار سُرخ سُرخ پھولوں اور ہری ہری کومل پتیوں والی سلکن ساری اور یہ ساری پہن کر بقول خالد میں "جانِ بہار" نظر آ رہی تھی۔ واقعی خالد نے شادی کی پہلی سالگرہ کے عین مطابق پیار سے بھرا تحفہ دیا تھا۔ میں کس قدر خوش تھی!! اور خوش کیسے نہ رہتی۔ ایک عورت کی

زندگی کی معراج اور کیا ہوتی ہے ــــ؟ محبّت کرنے والا شوہر، گڑیا جیسی ننھی منی کلی۔ اور پھر جس کا ماضی غربت اور افلاس میں کٹا ہو اُس کے لئے ذاتی بڑی سی، سجی سجائی کوٹھی ــــ کار ــــ فون ــــ یہ سب چیزیں بہت معنی رکھتی ہیں ــــ! مہمان ایک ایک کرکے آرہے تھے۔ چھیڑ چھاڑ بھی ساتھ ہی ساتھ چل رہی تھی۔

ذکیہ نے خالد پر وار کیا ــــ "بھئی شادی کی پہلی سالگرہ کی تصویر تو عموماً میاں بیوی پر مشتمل ہوتی ہے، مگر یہاں تو تیسرا ممبر بھی شامل ہو گیا ــــ بھئی بہت جلد باز ہو تم لوگ ــــ"

خالد بے شرمی سے ہنس دیا۔ "بھئی اپنا بس نہیں چلا ورنہ پروگرام میں تو یہ شامل تھا کہ بابا بے بی بھی ساتھ ساتھ ہی آجاتے ــــ" سب قہقہے لگانے لگے اور میں جھینپ کر رہ گئی۔

مہمان آتے گئے ــــ تحفوں سے میز لدتی گئی ــــ سب سے آخر میں آفتاب آیا ــــ روایتی شہزادوں کی طرح خوبصورت، وجیہہ اور بے پناہ گریس کا مالک ــــ اس کے آتے ہی رلیش نے چوٹ کی۔ ؏

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اُس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

خالد ہنس کر بولا ــــ "آفتاب کے سامنے چراغ جل بھی کہاں سکتے ہیں یار۔"

پھر اُس کی پیٹھ ٹھیک کر بولا ــــ "کیوں طبیعت ٹھیک نہیں ہے ــــ؟ بڑے بجھے بجھے نظر آرہے ہو ــــ؟"

آفتاب ہنس دیا ــــ اوپری دل والی ہنسی ــــ "نہیں یار ایسی کوئی بات

نہیں — کام — کام — کام — انسان مشین تو ہے نہیں کہ تھک نہ جائے —"

" پھر ضرورت اس بات کی ہے کہ فوراً شادی کر لی جائے —" اسلم چہکا کیونکہ " ہر مرض کی دوا ہے بیوی —"

ہنسی کا ایک فوارہ چھوٹا مگر آفتاب اس میں حصّہ نہ لے سکا — میں نے سہم کر اُس کی طرف دیکھا — اُس کے روشن اور خوبصورت چہرے پر تاریکی اور غم کا یہ کیسا سایہ لپکا — ؟ خدا خیر کرے — تھوڑی دیر بعد جب وہ میز پر اپنا تحفہ رکھ رہا تھا تو میں نے دھیرے سے کہا۔

" واقعی آپ کو شادی کر لینی چاہیئے۔"

اُس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ میرا وجود ڈگمگا اُٹھا — شادی۔ کیوں — ؟" ہلکی سی درد بھری مسکراہٹ !

" دل بہلنے کے لئے — اور کیوں — کیا لوگ شادیاں نہیں کیا کرتے ؟"

"لیکن میں بار بار شادی کرنے کا قائل نہیں ہوں۔"

میں اُس کے دیئے ہوئے شیشے کے گلدان کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی، اس کی بات سُن کر چونکی —" بار بار شادی — ؟ تو کیا آپ نے شادی کی ہوئی ہے؟"

وہ ہنسا اور پھر اعتماد سے بھرپور لہجے میں بولا۔

" سُنو سحر — میں نے زندگی میں صرف تم سے محبّت کی، تمھیں چاہا اور تم سے ہی شادی کا خواب دیکھا۔ لیکن جب تم نے کسی اور کا دامن تھام لیا تو میں نے سوچا مجھی میں کوئی خامی رہی ہوگی جو تم نے مجھے نظر انداز کر دیا !"

چھن — میرے ہاتھوں سے شیشے کا گلدان گرا اور کرچی کرچی ہوگیا۔ اور

ہر کرچی جیسے میرے دل میں چبھ گئی۔ وہ کہے جارہا تھا ـــــ

"میں نے جب دیکھا کہ تمھارے دل میں میرے لئے کوئی جذبہ نہیں تو تمھارے راستے سے ہٹ گیا۔ میں محبّت میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں، میں کیوں تمھیں محبّت کرنے پر مجبور کرتا؟ لیکن یہ پھانس میرے دل میں کئی دنوں سے اٹک کر رہ گئی ہے کہ پوچھ تو لوں کہ کیا میں اتنا بُرا تھا ـــــ؟؟"

میں نے گھبرا کر اُسے دیکھا ـــــ اِدھر اُدھر دیکھا ـــــ سب باتوں میں مشغول تھے، قہقہے، مذاق، لطیفے ـــــ ہر طرف خوشیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ مگر میں ایسے میں کہاں تھی ـــــ؟ وہ سہم سا گیا ـــــ معافی مانگنے کے انداز میں بولا۔

"خدا کے لئے سحر مجھے غلط نہ سمجھنا ـــــ اور ـــــ اور ـــــ" وہ رُک کر بولا۔

ـــــ "اب سے خدا کے لئے کبھی مجھے شادی کے لئے نہ کہنا ـــــ میں بڑی تباہ زندگی گذار رہا ہوں ـــــ" وہ یونہی کھڑے کھڑے میز کی سطح پر انگلی سے اشعار لکھنے لگا۔ ع

بدل گئیں وہ نگاہیں یہ سانحہ تھا اخیر
پھر اس کے بعد کوئی انقلاب ہو نہ سکا

میں بُت بنی کھڑی تھی ـــــ میری محویت کو سلمیٰ کی آواز نے توڑا۔

"بھئی خالد صاحب ـــــ آپ نے سحر کے لئے ساڑی تو خوب پسند کی لیکن کچھ نامکمل سی ہے ـــــ"

"کیا مطلب ـــــ؟" خالد پریشان ہو کر پوچھ رہا تھا۔

"مطلب یہ کہ آپ کی پسند کردہ اس ساڑی میں پتیاں ہیں، ڈنڈیاں ہیں، پھول ہیں سب کچھ ہے، مگر کانٹے نہیں ہیں ـــــ حالانکہ پھول کے ساتھ کانٹے تو ہونے ہی چاہئیں ـــــ"

میں نے بڑے کرب سے سر اُٹھا کر سلمیٰ کی طرف دیکھا —— "کانٹے؟ ساڑی پھولوں سے لدی ہے تو کیا ہوا —— کیا میری زندگی میں کانٹے نظر نہیں آرہے تمھیں —" لیکن یہ آواز میرے دل سے نکلی تھی، ہونٹ تو بے صدا ہی تھے۔

مجھے یوں کھڑے کھڑے کتنے زمانے گذرے مجھے پتہ نہیں —— جب میں نے چلنے کے لیئے قدم اٹھایا تو آفتاب کہہ رہا تھا۔

"سنبھل کے سحر —— راہوں میں شیشے کی کرچیاں ہیں۔ کہیں پاؤں میں نہ چبھ جائیں۔"

میں نے بے بس ہو کر اُسے دیکھا —— "تم پاؤں کی بات کرتے ہو اور یہاں تو دل لہولہان ہے ——" میں پھر بھی خاموش ہی تھی۔

اندر "فش پونڈ" والا مخصوص گیم شروع ہو چکا تھا۔ چلّانے اور دھم مچانے کی آوازیں کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں، کسی نے ہمیں آواز دی —— "بھئی دو مچھلیاں غائب ہیں انھیں پکڑ لاؤ نا ——"

لیکن میں اندر جانے کی بجائے بیڈ روم میں چلی آئی —— زور سے آنکھیں میچ کر سونے کی کوشش کی، لیکن خوشبوں کی طرح نیند بھی جا چکی تھی۔ ذہن کے آسمان پر یادوں کے ستارے ایک ایک کر کے ٹوٹتے رہے۔ ہر جانا پہچانا چہرہ چاند بن کر اُبھرتا ڈوبتا رہا۔ سب کے آخیر میں صرف ایک ہی چہرہ چمکتا رہ گیا —— یہ آفتاب تھا!!

وہ لمحہ جب میں نے پہلی بار دل کے سارے جذبوں کے ساتھ آفتاب سے محبت محسوس کی ——!

شبنم باجی کی شادی تھی۔ ہمارا گھر بیحد چھوٹا اور شکستہ سا تھا اس لیئے اُن کی شادی پھوپھی اماں کی شاندار کوٹھی میں ہونی طے پائی۔ پہلی بات تو بہن کی جدائی کا احساس

اور دوسری بات اپنی غریبی کا احساس۔ یوں لگ رہا تھا کہ دل کا شیشہ کرچیاں کرچیاں ہوا جا رہا ہے۔ اے کاش ابّو زندہ ہوتے، ہم بھی صاحبِ حیثیت ہوتے۔ لاکھ سگی پھوپھی سہی، پھر بھی باجی کی شادی کسی اور کے ہاں نہ ہو کر اپنے بنگلے میں ہوتی۔ زندگی نے کس قدر خوبصورت اور پُر بہار دن دیکھے تھے اور آج کس قدر بے بسی کا سامنا تھا ــــ؟ امّی کس قدر تباہ ہو رہی تھیں ــــ؟ میرا دل اندر ہی اندر رونے لگا ــــ شام کے سات آٹھ بجے کا وقت تھا۔ اندر باجی کی رخصتی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ کئی لڑکیوں نے مل کر باجی کو سنوارنا شروع کر دیا تھا ــــ باجی کی سسکیاں تھیں کہ رُکنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں ــــ کئی برسوں سے جو بندھن بندھا تھا وہ اب ٹوٹنے جا رہا تھا۔ نئی زندگی میں قدم رکھتے ہوئے انھیں کس قدر خدشے ستا رہے ہوں گے۔ جانے اس راہ میں کیسے کیسے ساتھی ملیں۔ وہ پیچھے مُڑ کر دیکھیں گی بھی تو سوائے آنسوؤں اور کراہوں کے کیا ملے گا ــــ؟ کیا ایک لڑکی کا مقدر یہی ہوتا ہے خدایا کہ ہر گام پر ہر موڑ پر سہم سہم کر یہ سوچے کہ زندگی میں جس اجنبی ساتھی کا ہاتھ تھاما ہے، وہ اُسے خوش بھی رکھے گا یا نہیں کیا محرومیاں ہی اس کا نصیبہ ہیں یا پلکوں سے ٹوٹ کر گرنے والے ہر آنسو، ہر موتی کو اُس کا پردیسی ساتھی اپنی آنکھوں میں سمیٹ لینے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے ــــ! میرے ٹوٹے دل نے دعا دی ــــ

"خداوندا ــــ باجی نے بڑے بُرے دن گذارے ہیں۔ اُن کی راہ کا ہر کانٹا پھُول بن جائے۔ ان کی ہر کراہ، ہر آنسو، ہر غم کا بدلہ اب یوں دینا کہ وہ پھولوں، خوشیوں اور بہاروں میں کھو کر رہ جائیں۔"

باجی وداع ہو رہی تھیں۔ اس وقت مجھے ان کے پاس ہونا چاہئے تھا مگر میں وہاں باغ کے ایک کونے میں سنگ مرمر کی بنچ کے ایک کونے پر سر نہوڑائے

یوں بیٹھی تھی جیسے کوئی مجسّمہ۔ آنسو میری آنکھوں سے رواں تھے۔ اندر سے سسکیوں اور چیخوں کی آوازیں بلند ہوتی سُنائی دے رہی تھیں۔ مجھے خود پر قابو رکھنا دشوار ہوگیا اُسی لمحہ میں نے اپنے ہاتھ پر کسی بیحد شفیق، مہربان اور محبّت بھرے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کیا۔ میں نے چونک کر سر اُٹھایا۔" اس وقت تنہا بیٹھی یہاں کیا کر رہی ہو۔؟ ارے تم تو رو رہی ہو۔ خدا خیر کرے۔ کیا ہوا۔؟"

یہ آفتاب تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس سسکیاں اور تیز ہوگئیں۔

" اُفّوہ۔ یہ لڑکیاں بھی رونے میں خوب ماہر ہوتی ہیں۔ بھئی ہوا کیا یہی ناکہ باجی کی شادی ہوگئی۔ انھیں دولھا مل گیا اور مجھے نہیں ملا۔ تو یہ ایسی کوئی رونے کی بات نہیں۔ اگلے سال تمھاری باری سہی۔" مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ آفتاب نے بھی مجھے ایک لمحے کو دیکھا اور مُسکرا کر کہا۔

" بھئی بُرا نہ ماننا سحر اس وقت تمھاری آنکھوں میں آنسو اور ساتھ ہی ہونٹوں پر ہنسی دیکھ کر ایک شعر یاد آگیا ؎

آتے ہی ان کے اشک ہمارے نکل پڑے
لو ساتھ ساتھ چاند ستارے نکل پڑے

میں نے آفتاب کی اس انتہائی بے باکی پر بڑی حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ مُسکرایا۔" بھئی میں نے یہ اپنے لئے نہیں کہا۔ میں چاند وانذ نہیں ہوں۔ بس یونہی معمولی سا آفتاب ہوں۔"

" معمولی سا آفتاب۔؟؟" دل نے سوچا۔ یہ معمولی سا آفتاب اگر میرے اندھیرے آسمان پر چمک اُٹھے تو۔؟" میں سہم گئی۔ دِل نے مجھے جگایا۔

"سحر ایسی انہونی خواہش نہیں کیا کرتے ــــ" غم کے سیاہ بادل نے پھر مجھے اپنے سائے میں کھینچ لیا۔ میرا شگفتہ چہرہ جو ابھی ابھی سچ مچ پھول کی طرح کھل رہا تھا، کھنچ سا گیا ــــ اکدم بہت سارے آنسو میری آنکھوں سے اُبل پڑے۔ ساتھ ہی ایک ہلکی سی چیخ بھی میرے مُنہ سے نکل گئی۔ آفتاب نے ذرا آگے بڑھ کر میرا آنسوؤں سے بھرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور بھاری آواز میں کہنے لگا۔

"سحر میں تمھارے غم کو سمجھتا ہوں۔ اِس وقت تمھیں شبنم کی جُدائی کا اتنا خیال نہیں ہے جتنا اس بات کا کہ اُس نے اور ساتھ ہی تم نے بھی، کس قدر دُکھی زندگی گزاری ہے، تمھارے دل میں یہ غم پل رہا ہے کہ ساری زندگی کٹھنائیوں میں گذارنے کے بعد آج جس کا ہاتھ تھاما ہے۔ پتہ نہیں وہ کس انداز سے پیش آئے ــــ اور زندگی اب اپنے آپ کو کس روپ میں پیش کرے۔ مگر سحر سب سے تُڑا کر لے جانے والا اتنا بے رحم نہیں ہوتا، دراصل اُسی ایک ہستی کے سہارے تو لڑکی اتنی ساری جدائیوں کو قبول کر لیتی ہے ــــ رضوان میرا دوست ہے، میں اُسے جانتا ہوں اور تم نے بھی دیکھا ہے کہ وہ شبنم کو کس قدر چاہت سے بیاہ کر لے جا رہا ہے۔ ایسے بے بنیاد وسوسوں کو اپنے دل میں جگہ نہ دو ــــ" اُس نے دھیرے سے میرا چہرہ چھوڑ دیا۔

"یہ پیاری پیاری آنکھیں رونے کے لئے نہیں بنی ہیں ــــ"

میرا دل ڈگمگا گیا ــــ آفتاب کی تسلی میں کس قدر اعتماد بھرا ہوا تھا۔ جی چاہا اک گناہ کر بیٹھوں کہ آفتاب کے آگے سر جھکا دوں ــــ جی چاہا اُس کے پاؤں تلے کی دُھول اپنی مانگ میں بھر لوں۔ جی چاہا کہ اک شکایت کر بیٹھوں کہ سورج کا ایک روپ ہوتے کے باوجود بھی اب تک تم نے میری دنیا کو کیوں اندھیرا رکھا۔ لیکن میں کچھ نہ کر سکی۔ میں نے اپنا بوجھل سر اٹھایا۔ وہ مجھ سے کس قدر بلند تھا۔ جیسے وہ آسمان تھا، اور میں زمین ــــ

مگر محبت جو کہ ان وسوسوں سے بالاتر ہوتی ہے میرے دل میں گھر کر چکی تھی ۔

محبّت میں سوچنے سمجھنے کی گنجائش ہوا کرتی تو میں آفتاب کو چاہنے سے قبل یقیناً یہ سوچ لیتی کہ وہ ایک بڑے باپ کا بیٹا ہے ۔ اُس کے ڈیڈی لاکھوں میں کھیلتے ہیں ۔ وہ بڑی سی کوٹھی میں رہتا ہے ۔ لمبی کار میں گھومتا ہے اور میں ـــــ ؟ مگر محبّت واقعی اندھی ہوتی ہے ـــــ !! اُس رات کی چھوٹی سی واردات کے بعد میں نے محبّت کو اپنا جیون بنا لیا ۔ میں آفتاب کے لیئے جینے لگی ۔ ایک لمحے کو بھی یہ نہ سوچا کہ اس کا انجام کیا ہوگا ۔ یہ بھی نہ سوچا کہ کیا وہ بھی مجھے چاہتا ہے ـــــ ؟ میں کیوں سوچتی ۔ میرا مذہب محبّت کئے جانا تھا ۔ یہ سوچنے کی مجھے ضرورت نہ تھی کہ وہ مجھے چاہتا ہے یا نہیں ـــــ چاہے گا یا نہیں ـــــ میں محبّت میں سودے بازی کو کیوں جگہ دیتی ۔ دل جو دینے کی چیز تھی دیدیا ۔ لینے کے بارے میں میں نے کچھ نہ سوچا ۔

لیکن زندگی ـــــ ! زندگی نے مجھے بتا دیا کہ میں نے آفتاب کے ہاتھوں میں اپنا دل صرف جلنے کے لیئے دیا تھا ۔ اُس نے میری محبّت کو کبھی محبّت نہ سمجھا ـــــ ؟؟ کیا وہ یہ سمجھتا رہا کہ یہ سب کچھ کھیل ہے ـــــ ؟؟ بھول شاید میری ہی تھی کہ اُس کی تسلّی اور دلاسے کو محبّت کا روپ دے بیٹھی ۔ یہ تو سوچا ہوتا کہ غم اور دکھ میں لوگ زخمی دل پر وقتی پیار کا پھاہا تو رکھ ہی دیتے ہیں ـــــ مگر پھر اِس چاہت کے نرالے ڈھنگ ؟

مجھے اچھی طرح یاد ہے عید پر پھوپھی امّاں نے ہم سبھوں کو اپنے گھر بلایا تھا ۔ عید کے ہنگامے کے بعد جب دوسرے دن ہم لوگ جانے لگے تھے تو پھوپھی امّاں نے امّی سے کہا تھا ۔

"ثریّا ــــ آفتاب نے کہا تھا سحر کو چند دنوں کے لئے روک لینا۔"

امّی نے ہڑبڑا کر مجھے دیکھا۔ میں نے پھوپھی اماں کو ــــ وہ ہنس کر بولیں۔

"وہ کہتا تھا شبنم کی جُدائی سے سحر بہت نڈھال ہے اور خود کو تنہا تنہا محسوس کرتی ہے۔ یہاں رہ کر اُس کا دل بہل جائے گا۔"

میرا من کھل اٹھا ــــ آفتاب کو میرا کس قدر خیال ہے۔ کیا..... کیا..... میں نے رُک رُک کر، ڈر ڈر کر، سہم سہم کر سوچا ــــ "کیا وہ بھی مجھ سے محبّت کرنے لگا ہے ــــ ؟؟" مگر پھر وہی نامراد دولت دیوار بن کر کھڑی ہوگئی اور میں نے خود کو تسلی دی ــــ "وہ نہیں چاہتا تو کیا ہوا ــــ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ میں ہی اُسے چاہتی ہوں!"

پھوپھی امّاں کے ہاں زندگی کا بالکل وہی ڈھب تھا، جو ناولوں، افسانوں یا پکچروں میں ہوتا ہے۔ غمِ زندگی سے دور دور یہ لوگ خوشیوں میں اِس طرح ڈوبے رہتے تھے کہ پتہ چلتا ہی نہ تھا کہ اس کوٹھی سے باہر دنیا میں فکریں، اُلجھنیں، غم اور آنسو بھی ہوتے ہیں ــــ پھوپھی امّاں کی ایک ہی لڑکی تھی۔ رعنا باجی ــــ ایک ہی لڑکا آفتاب ــــ مگر اُن دونوں کے دوست احباب، ملنے جُلنے والے اسقدر بے حساب تھے کہ بلا مبالغہ کوٹھی پر کسی ہوٹل کا گمان ہوتا تھا ــــ لوگ آرہے ہیں جا رہے ہیں۔ کافی چل رہی ہے۔ چائے بن رہی ہے۔ کھانے پک رہے ہیں کھلائے جا رہے ہیں۔ ریڈیو چیخ رہا ہے۔ پیانو کی خبر لی جا رہی ہے۔ پنگ پانگ بیڈمنٹن، کرکٹ چل رہا ہے۔ کیرم کی شامت آرہی ہے۔ ساتھ ساتھ فرج میں لگے ٹھنڈے ٹھنڈے پھل کھائے جا رہے ہیں۔ ریڈیو گرام پر مغربی موسیقی کے ایک ساتھ کئی کئی ریکارڈ چڑھا دیئے گئے ہیں۔ فلش بلب چمک رہے ہیں۔ دھڑا دھڑ تصویریں کھینچی جا رہی ہیں۔ مجھے یہ سب کچھ بڑا عجیب عجیب سا لگتا جیسے میں خواب

دیکھ رہی ہوں یا پریوں کے قصّوں والے دیس میں آنکلی ہوں۔ جہاں ہر طرف خوشیاں ہیں۔ بہاریں ہیں۔ رنگین ریشمی چمکیلے بھڑکیلے ملبوسات ہیں۔ سب کچھ ہے مگر دل نہیں۔ محبّت کی قدریں نہیں۔ وہ چوٹ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ اس دن لمبی سی کاریں لد کر سب سینما جا رہے تھے۔ حسب معمول میں اکیلی باغ کے کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اکیلے پن میں خیالات میں کھوئے رہنا، میرا سب سے بڑا علیش رہا ہے۔ میں خیالات سے تب چونکی جبکہ کسی نے میرے متعلق بات کی۔

" ارے بھئی جب سبھی جا رہے ہیں تو سحر کو کیوں چھوڑ رہے ہو ــــ !"

رعنا باجی کی آواز آئی ــــ بھئی اس کے کپڑے وغیرہ تو دیکھو۔ اور پھر بال بنانے کا تو اُسے ذرا سلیقہ نہیں ــــ بئے کا گھونسلہ بنے رہتے ہیں اُس کے بال ــــ"

رعنا باجی کی گہری سہیلی شیلا کی آواز آئی ــــ " مگر سچ پوچھو تو رعنؔا اِس حلیے میں بھی وہ پری جیسی لگتی ہے ــــ کیا بے پناہ حسن پایا ہے کم بخت نے۔"

" اونہہ ــــ بھئی چلئے نا بہت دیر ہو جائے گی ــــ میں نے دونوں ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹا۔ قدرے سامنے جُھک کر کار کی طرف دیکھا ۔ اسٹیرنگ پر آفتاب جُھکا ہوا تھا۔ رعنا باجی کا حکم پا کر وہ مستعد ہو گیا اور زون کی آواز کے ساتھ کار یہ جا وہ جا۔

مجھے آنسو روکنا دوبھر ہو گیا۔ امّی مجھے یہاں کس لئے چھوڑ گئی ہیں ــــ ؟ یوں کہیں دل بہلا کرتا ہے ــــ ؟؟ میں اس قدر روئی ہوں اِس قدر روئی ہوں کہ میری آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ اُسی لمحہ مجھے اپنے سر پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ یہ ہاتھ ! اسے تو میں جنم جنم سے جانتی ہوں ــــ اسی ہاتھ کو تھام کر تو میں نے

زندگی کے خواب زاروں میں قدم رکھا تھا۔ اسی ہاتھ کے سہارے تو چل کر میں نے دل کے دروازے پر دستک دی تھی —— آفتاب یہ تمہارا ہی تو ہاتھ ہے نا میرے آفتاب —— !

میں گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی —— آفتاب نے مجھے شرارت سے دیکھا۔ تم تو بس اس موقعے کی تاک ہی میں رہتی ہو کہ آنسو بہا سکو! چہرہ دیکھو ذرا، سُرخ گلاب ہو رہا ہے ——"

میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی —— "آپ کیوں پلٹ آئے؟"

میں نے نگاہوں سے سوال کیا —— میرے خاموش سوال کا اُس نے بشاشت سے جواب دیا —— "ٹکٹ نہیں ملی ——" وہ ہنسا —— میں نے غیر یقینی انداز سے اُسے دیکھا —— وہ مُسکرائے جا رہا تھا۔

میرے خدا —— میں کدھر جا رہی ہوں —— یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کہیں محبت دھیرے دھیرے ہم دونوں کے دلوں میں اپنے قدم تو نہیں جما رہی ہے آفتاب! خدا کے لئے آفتاب اس قدر قریب نہ آؤ —— تمہاری قُربت کا تصوّر ہی مجھے جلا کر رکھ دے گا۔ تم سورج ہو۔ سورج کی تمنّا خوبصورت سہی مگر زندگی مجھ پر اتنی مہربان نہیں کہ اُجالے میرا مقدّر بن جائیں ——!!

آفتاب نے کبھی بھولے بسرے بھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا۔ میں کبھی یہ جان ہی نہ پائی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے یا محض ہمدردی ہے۔ بالکل ویسی ہی ہمدردی جیسی غریبوں کے ساتھ امیروں کو۔ پیسہ والوں کو ہوتی ہے۔ کبھی کبھار اُس کے رویّے سے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ مجھ پر نچھاور ہونے سے بھی دریغ نہ کرے گا۔ لیکن جب میں اس جذبے کا تجزیہ کرنے بیٹھتی تو مجھے لگتا کہ وہ سب کچھ خدا ترسی اور ہمدردی ہے۔

وہی دل پر مرہم رکھنے کا پُرانا انداز ـــــ جس سے میں کبھی اُس کی محبت کا ثبوت نہ پا سکی۔

پھوپھی اماں کے ہاں ایک دن سب لوگ "میوزیکل چیرز" کھیل رہے تھے۔ یہ گیم یوں کھیلا جاتا تھا کہ اس میں بارہ کھلاڑی ہوتے تھے اور گیارہ کرسیاں، یہ گیارہ کرسیاں ایک قطار میں یوں رکھ دی جاتیں کہ ان کی سمتیں مخالف ہوتیں۔ اِدھر کوئی بھی ہارمونیم بجاتا رہتا اور بارہ کھلاڑی دھیرے دھیرے گیارہ کرسیوں کے اِرد گِرد گھومتے بھاگتے رہتے۔ جب ہارمونیم رُک جاتا تو اِکدم سب کرسیوں کی طرف لپکتے۔ جو ایک بچ جاتا وہ آؤٹ قرار دیا جاتا۔ اس طرح ایک کرسی اور ہٹا دی جاتی اور یوں آخر میں کرسی پا لینے والا جیت جاتا اور انعام کا مستحق ٹھہرتا ـــــ اس دن میں بھی اُس گیم میں شامل کی گئی۔ ـــــ کرسیاں گھٹتے گھٹتے اور ساتھی آوٹ ہوتے ہوتے آخیر میں صرف میں اور آفتاب ہی رہ گئے۔ میرا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ ہارمونیم رُکا تو حالانکہ آفتاب کرسی کے سامنے تھا مگر وہ ہٹ گیا اور مجبوراً مجھے بیٹھنا اور جیتنا پڑا ـــــ سب لوگ تالیاں بجانے اور شور مچانے لگے۔ لیکن رعنا باجی آگے بڑھیں اور زنّاٹے کے ساتھ بولیں۔

"ایسی چھچھوری حرکتوں سے تم کیا سمجھتی ہو کہ پیار کی بازی بھی جیت لوگی ـــــ؟ اِس بھرّے میں نہ رہو۔ زمین بن کر آسمان چھونے کی کوشش مت کرو ـــــ بھیّا تمھارے مقابل بہت عظیم ہیں۔ اور یہ سوچ لو کہ وہ منگنی شُدہ بھی ہیں ـــــ"

میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ سوچ بھی نہ سکی۔ ہوا کیا تھا؟ رعنا باجی مجھ سے کیوں بگڑ بیٹھیں۔ میں نے کب اُن کے بھیّا کو اُن سے چھیننے کی کوشش کی ہے۔ میں کب اِس گھر میں۔ اس محل میں! اس کوٹھی میں بہو بن کر آنا چاہتی ہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں چاہتی۔ کچھ بھی نہیں چاہا۔ ہاں ایک چھوٹی سی بھول ہو گئی ہے کہ میں نے تمھیں چاہا ہے۔ آفتاب ـــــ اور بس!

اُسی شام میں اپنے گھر چلی آئی اس ہتیے کے ساتھ کہ اب زندگی باقی رہی تو پھر کبھی اس کوٹھی میں قدم نہ رکھوں گی جہاں چراغوں کی بجائے دل جلائے جاتے ہیں۔ جہاں کے باغوں کے پھولوں میں خونِ دل کی لالی مُسکراتی ہے۔ میں کبھی نہ جاؤں گی۔ مگر میرے سارے جتن دھرے کے دھرے رہ گئے۔ جب ایک شام بیحد لمبی خوبصورت اور چکنی سی کار لے کر آفتاب آیا اور امی سے کہا کہ سحر کو امی نے فوراً بلایا ہے ——— امی بیچاری کو کیا معلوم تھا کہ تہہ میں کیا بات ہے۔ انھوں نے مجھے سوار کرا دیا۔ کار کے چلتے ہی میرے آنسو بھی شروع ہو گئے۔ آفتاب نے ذرا دور چل کر کار روک دی۔

"اُفوہ ——— پھر وہی ابر باراں!!" وہ جیسے حکم دئے جانے والے لہجے میں بولا ——— "یہاں سامنے تشریف لے آئیے آپ ———" میں جھجکی تو وہ چڑ کر بولا ——— "میں کہتا ہوں کہ سامنے آکر بیٹھو نا ———" میں دھیرے سے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ اُس نے مُسکرا کر مجھے دیکھا اور بولا ——— "امی وَمی نے نہیں بُلایا۔ میں خود ہی لینے آیا ہوں۔" میں نے بوکھلا کر اُسے دیکھا تو وہ ہنسا ——— "چلو ایک لمبی ڈرائیو پہ چلتے ہیں ——— تمھاری ساری تھکن دُور ہو جائے گی۔ تم جی اٹھو گی ———"

آفتاب ——— تمھاری قربت میں اگر میں ہوں تو مجھے کون سی تھکن زیر کر سکتی ہے ——— ؟ میں تو تمھیں دیکھتے ہی جی اُٹھتی ہوں۔ مجھے کسی سیر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ شے جو خون بن کر میری رگوں میں دوڑ رہی ہے، وہ تمھاری محبّت ہے۔ بس اِس دولت کو مجھے بخش دو۔ پھر میں کبھی خدا سے اپنے بخت کی نارسائی کا گلہ نہ کروں گی۔ مجھے صرف تمھارا پیار تمھارا ساتھ چاہئے میرے آفتاب! یہ سب کچھ میرے دل کی زبان نے کہا ——— میرے ہونٹ ساکت و صامت تھے اور آنکھیں ——— ؟ ان آنکھوں نے ہی تو مجھے تباہ کیا ——— نہ یہ ہوتیں نہ میں آفتاب کا جلوہ دیکھتی اور تباہ

ہوتی ــــ ! وہ آفتاب کو یوں دیکھے جا رہی تھیں بس چلے تو سدا کے لئے وہیں چھپا کر رکھ لیں ۔

وہ رات ـــــ زندگی کی یادگار رات ـــــ رعنا باجی اور آفتاب کے بہت سے دوست احباب اور لکھنؤ والی ممانی جان کے سارے بچے مِل کر باغ میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ بات یوں نکلی کہ مردوں کو کس قسم کی بیویاں پسند کرنی چاہئیں اور بیویاں کس قسم کے مردوں کو پسند کریں ـــــ ایک صاحب بولے ـــــ "کیوں یار آفتاب تمھارا کیا نظریہ ہے اس کے متعلق ـــــ آفتاب نے بے پناہ سنجیدگی سے جواب دیا ـــــ "یار بیوی کے تعلق سے اپنا ایک ہی نظریہ ہے کہ بیحد اُلجھے الجھے بالوں والی ہو اور بیحد صاف سُتھری نہ ہو ـــــ اس سے یہ ہوتا ہے کہ شام کو جب تھک تھکا کر گھر آؤ تو یہ احساس بڑا سکون دیتا ہے کہ بیوی بڑی سگھڑ اور خانہ دار قسم کی ہے ۔ دن بھر کے کام سے بال اُلجھ گئے ہیں ـــــ رنگ سنولا گیا ہے، کپڑے ذرا میلے ہو گئے ہیں ـــــ وہ ہنس کر ذرا رُکا اور رعنا باجی کی طرف دیکھ کر بولا ۔ ہردم ہی ہی ہاہا کرنے، بن ٹھن کر سدا بیٹھی رہنے والی خواتین کو میں اِکدم ڈس لائک کرتا ہوں ـــــ"

یوں جیسے سارا قصور میرا ہی تھا، رعنا باجی نے مجھے بیحد گھور کر دیکھا اور جل کر آفتاب سے مخاطب ہوئیں ـــــ "مگر بھیّا صاحب آپ کو مبارک ہو کہ آپ کی ہونیوالی دلہن ان تمام صفات سے مبرّا ہیں جو آپ کو پسند ہیں ـــــ شاہینہ بیحد صاف ستھری رہتی ہے، بال بڑے سجے سنورے رہتے ہیں اور خدا کے کرم سے اُس کے ہاں اتنے نوکر ہیں کہ اُسے بیل کی طرح کام میں جُت کر کپڑے میلے کرنے کی بھی ضرورت نہیں پیش آتی ـــــ"

میں نے پہلی بار آفتاب کو اتنے غصّے میں دیکھا ـــــ "رعنا خاموش رہو

ورنہ زبان کھینچ لوں گا ــــــ نالائق کہیں کی ــــــ" ماحول اچانک بڑا ٹینس ہوگیا۔
کچھ سوچ کر آفتاب نے خاموشی اختیار کرلی ــــــ رعنا باجی اپنی انسلٹ بری طرح
فیل کرکے بالکل بچوں کی طرح روتی ہوئی اُٹھ گئیں ــــــ "بڑے آئے مجھے ڈانٹنے
والے ــــــ سب کچھ ڈیڈی سے نہ کہہ دیا تو نام نہیں ۔ بڑے آئے شادی کرنیوالے
ــــــ" انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں ۔

پھر سب اُٹھ گئے میں اکیلی بیٹھی رہ گئی ــــــ خزاں رسیدہ پتے ایک ایک کرکے
ٹوٹتے اور میرے قدموں میں آکر ڈھیر ہوتے رہے ۔ اس ڈھیر میں بیٹھے بیٹھے اچانک
میں نے یوں محسوس کیا کہ میں خود بھی ایک خزاں رسیدہ پتہ ہوں جو خزاں کے بے رحم
ہاتھوں یہاں ٹوٹ کر آگرا ہے ــــــ بڑی رات گئے میں ڈھیر سے اُٹھی ــــــ باغ
میں موسم اور بے موسم کے جتنے بھی زرد رنگ کے پھول تھے سب کو جمع کیا اور ایک
گلدستے کی شکل میں جمع کرکے آفتاب کی میز پر رکھ آئی ۔

دوسرے دن ایک عجیب و غریب حادثہ ہوگیا ــــــ رعنا باجی کو دیکھنے
کے لئے کچھ مہمان آنے والے تھے ــــــ ویسے تو بڑے باپ کی بیٹی ہونے کے
باعث اُنھیں کئی پیغام آچکے تھے ــــــ ان میں ایسے بھی تھے جو مالا مال تھے۔
ایسے بھی تھے جنھیں امیر گھرانے کی بیٹی کے ساتھ ساتھ ہزاروں روپے کے جہیز کی
بھی آس تھی ۔ مگر یہ جو مہمان آرہے تھے یہ اسقدر رئیس تھے کہ اُن کے بارے
میں سُنا گیا کہ وہ کہتے تھے کہ "آسمان خدا کا زمین میری ــــــ" یعنی چاند سورج
ستارے اور آسمان ہی ایسی چیزیں ہیں جنھیں میں حاصل نہیں کرسکتا، ورنہ زمین
پر شاید ہی کوئی شے ایسی ہو جسے میں چاہوں اور خرید نہ لوں ــــــ!

پھوپا صاحب ایسے کوئی پرانے خیال کے آدمی نہ تھے۔ رعنا باجی بھی پردہ نہیں کرتی تھیں، خود ہی کار ڈرائیو کرتی تھیں۔ شاپنگ کو کھلی کار میں جاتی تھیں ــــ اُن پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔ اکلوتی تھیں۔ ماں باپ کی بیحد لاڈلی تھیں۔ خالد صاحب اپنا پیغام خود ہی لے کر آرہے تھے۔ کیونکہ ان کے ماں باپ عرصہ ہوئے انتقال کر چکے تھے۔ ٹی پارٹی کا بیحد بڑے پیمانے پر انتظام ہوا تھا، اس کی کرتا دھرتا رعنا باجی ہی تھیں۔

شام بڑے خالد صاحب آئے۔ پارٹی انھوں نے خوب انجوائے کی اور سب میں بیحد گھل مل گئے۔ جاتے جاتے وہ بیحد خوش تھے۔ پھوپا صاحب سے انھوں نے بالکل فرینک ہو کر کہا ــــ "آپ کے گھر کا ماحول مجھے بہت پسند آیا۔ سب لوگ بھی۔ سحر کو میں نے ہر لحاظ سے بہترین پایا ــــ مجھے بار بار فارن آنا جانا پڑتا ہے۔ جلد ہی پھر جانا ہے بہت بہتر ہو جو آپ اس نیک کام کو جلد سے جلد نپٹا دیں۔"

پھوپا صاحب نے بیحد اطمینان سے جواب دیا۔ "جیسی آپ کی مرضی۔"

اُس رات جب میں نیند کے لئے تڑپ رہی تھی اور نیند مجھ سے بھاگی جا رہی تھی، آنسوؤں کی سوغات دے کر ــــ کہ پھوپا صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور بیحد پیار سے بولے۔

"بیٹی سحر آجکل کا زمانہ ایسا نہیں ہے کہ شادی بیاہ جیسے مسئلے میں لڑکیوں کی رائے نہ پوچھی جائے ــــ خالد نے رعنا کی بجائے تمھیں پسند کیا ہے ــــ ٹھیک ہے۔ تم بھی میری ہی بیٹی ہو اور اس لحاظ سے زیادہ توجہ اور محبّت کی مستحق ہو کہ تمھارے سر پر باپ کا سایہ نہیں۔ بیٹی خالد کو میں رعنا کے لئے ہر لحاظ سے پسند کر چکا تھا۔ صرف خالد کی اپنی پسند باقی رہ گئی تھی۔ سو اس نے آج تمھیں پسند کر لیا ــــ

ظاہر ہے مجھے یہ رشتہ دل سے پسند ہے۔ تمھاری ماں کو بھی ہوگا ہی۔ تم اپنی رائے بتلا دو۔ مگر میں اپنے طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ اس سے اچھا رشتہ تمھیں پھر کبھی نہ آئے گا سوچو اور مجھے جواب دو۔ وقت بڑا قاتل ہے وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ ایسا نہ ہو کہ بعد کو تم پچھتاتی رہو ـــــ"

"لیکن پھوپا صاحب میں آفتاب کو چاہتی ہوں۔ میں اس کے بغیر زندگی کا تصوّر تک نہیں کر سکتی۔ پوچھنا کیا ضرور ہے۔ کیا آپ کو محسوس نہیں ہوتا کہ میرا انگ انگ اس کا دیوانہ ہے ـــــ خدا کے لئے پھوپا صاحب رعنا باجی کو خالد صاحب سے بیاہ دیجئے۔ اور مجھے بہو بنا کر اپنے قدموں میں جگہ دے دیجئے ـــــ"

میں نے بے صدا آواز سے چلّا چلّا کر یہ سب کچھ کہا مگر پھوپا صاحب کچھ نہ سن سکے ـــــ میں چکرا کر اُن کے پیروں میں گر پڑی اور وہ میری خامشی کو میری رضا سمجھ بیٹھے۔

پھوپا صاحب نے باپ بن کر میری شادی کا سارا بار اُٹھا لیا۔ دن رات میں یہی سوچتی رہتی اس محبّت کے بوجھ کو میں کس طرح سہار پاؤں گی ـــــ؟ کہیں خالد پر یہ راز افشا ہو گیا تو ـــــ؟ آفتاب تم تو مرد تھے۔ تم نے یہ بزدلی کیسے دکھائی۔ کیوں نہ اپنی امّی اور ڈیڈی سے صاف کہہ پائے میں سحر سے شادی کرنا چاہتا ہوں! سوچتے سوچتے مجھے ہنسی آ جاتی ـــــ مگر سحر بی بی ـــــ آفتاب نے تم سے محبت کا اقرار ہی کب کیا ہے جو تم اِن زاویوں سے سوچتی ہو ـــــ اگر محبت ہوتی تو ضرور کہتا۔ مگر کیا تمھیں یقین ہے کہ وہ تمھیں چاہتا بھی ہے ـــــ؟ یہی ایک غم تھا جس نے جان سی لے لی ـــــ اور یہی ایک سہارا تھا جس نے جینے کا حوصلہ بخشا کہ جب اُس نے مجھے چاہا ہی نہیں تو میں کیوں اپنی محبّت سے خالد کو محروم کر دوں ـــــ؟

یہ سوچ کر میرا جی جل اُٹھتا کہ میرے ہی لئے آفتاب کے دل میں ہمدردی اور خدا ترسی کا جذبہ کیوں اُبھرا جسے میں نادان، محبت سمجھ بیٹھی۔ اب کبھی آفتاب سے سامنا ہونے کی نوبت آتی تو میں نگاہیں چرا لیتی۔ عورت سب کچھ برداشت کر جاتی ہے، محبت کی تذلیل نہیں سہہ سکتی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ آفتاب پر اپنی بے لوث محبت کا راز کھول دوں اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ میں اسے شاید اس لئے چاہتی ہوں کہ اُس کے پاس دولت ہے، کوٹھی ہے۔ کار ہے۔ نہیں میری محبت اتنی سستی نہیں ہے ـــــ اے خدا مجھے صبر کی طاقت دے۔ میں نے خود کو حالات کے ہاتھوں سونپ دیا۔

خالد کے یہاں بیاہ کر آئی تو مجھ پہ زندگی کے نئے دروازے کُھل گئے۔ خالد نے دُنیاوی عیش کے ساتھ ساتھ مجھے اِس قدر بھرپور محبت دی کہ میں اپنے نصیب پر آپ نازاں ہو گئی۔ زندگی میں کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ کبھی بُھولے سے میرا دل نہ دُکھایا۔ جو بات میرے منہ سے نکل گئی گویا پتھر کی لکیر ہو گئی۔ اور اُسے پورا کرنا خالد پر فرض ہو گیا۔ میرا دل جو آفتاب کی محبت میں جل کر راکھ ہو چکا تھا، خالد کی محبت سے جی اٹھا۔ میں اپنا ماضی بھول گئی۔ سب کچھ بھول گئی۔ صرف یہ یاد رہ گیا کہ میں خالد کی ہوں اور خالد میرا ـــــ زندگی میں جتنی محرومیاں تھیں، کھونے کا جو کچھ احساس تھا سب مٹ گیا۔ میں خوشیوں میں مگن ہو گئی۔ ہر بات بھول گئی۔ ہر یاد کو بُھلا دیا۔ ہر یاد کو فراموش کر دیا۔

زندگی کا تقاضا ہی یہ تھا کہ خالد کی بے پناہ محبت کا جواب محبت سے دے سکوں۔ آج آفتاب آگیا اور اپنے ساتھ یادوں کی بے شمار کرچیاں بھی لے آیا، جو

میرے دل میں چُبھ کر رہ گئی ہیں ——— اور اب جس سے زندگی بھر قطرہ قطرہ خون نچڑتا رہے گا اور میں ویران راتوں میں آنسوؤں کے چراغ جلائے یہ سوچتی رہا کروں گی کہ یہ سب کیا ہو گیا ——— کیا ہو گیا ——— آفتاب نے پوچھا ہے ——— "مجھ میں کیا خامی تھی۔ کیا میں اتنا بُرا تھا کہ تم اپنا نہ سکیں؟ میں محبّت میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں میں کیوں تمھیں محبّت کرنے پر مجبور کرتا ——— تمھارے دل میں میرے لیے کوئی جذبہ ہی نہ تھا تو میں بھی تمھارے راستے سے ہٹ گیا ——— "!

وہ میرا بے پناہ احساسِ کمتری خدایا ——— جس سے سدا میرے لب بندھے رہے۔ کسی لمحہ بھی آفتاب کے سامنے زبان نہ کھول سکی۔ ہر بار آنسوؤں سے بات کا جواب دیا۔ یا کبھی مُسکرا کر رہ گئی۔ یہ سوچا ہی نہیں کہ ہر بار کی خامشی اُسے غلط فہمی میں بھی مبتلا کر سکتی ہے۔ میری خامشی نے اسے غلط فہمی میں ڈالا کہ میں اُسے نہیں چاہتی اور اُس کے یوں محتاط رہنے سے میں یہ سمجھی کہ وہ مجھ سے صرف ہمدردی جتا رہا ہے۔ یہ کیسی بھول ہو گئی خدایا ——— لیکن اگر یہ غلط فہمیاں پیدا نہ ہوتیں تو بھی کیا میں آفتاب کو حاصل کر سکتی تھی ——— ؟ آفتاب اتنی بڑی ٹکر لے سکتا تھا کہ اپنی منگنی توڑ کر مجھ سے شادی کر لے ——— ! پیسے کی طاقت بہت بڑی ہوتی ہے آفتاب ——— چلو یہی سوچ کر تم خوش رہو زندہ رہو کہ میں نے ہی تمھیں ٹھکرا دیا ہے۔ اگر میں تمھاری ہو جاتی، تب بھی ایسے اذیّت ناک ماحول میں شاید ہی جی پاتی، جہاں رعنا باجی کے دل چیرنے والے طعنے سدا کانٹوں کی طرح دل کو چھیدتے رہتے۔ اب سوچتی ہوں کہ اُن کی مجھ سے بے پناہ نفرت بھی ٹھیک ہی تو تھی آفتاب ——— بھلا کون بہن چاہے گی کہ اُس کا بھائی ہیرے جواہرات کو چھوڑ کر کنکروں کو گلے لگالے۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کب سجا ہے ——— ؟ تمھاری کوٹھی میں رہ کر میں سدا احساسِ کمتری کے بوجھ تلے دبی

رہتی۔ شاید ہی کبھی سر اُٹھا کر چل پاتی۔ میری خودی اور انا کی شکست کے کچو کے میرے دل کو گھائل کر چھوڑتے ـــــ تم سوچو گے کہ دل کے بہلانے کو کیسی کیسی انوکھی باتیں بنا رہی ہوں، سوچو گے خالد کیا کم امیر ہے، پھر کیا اس کے ساتھ رہ کر مجھے احساسِ کمتری نہیں ہوا ـــــ؟ نہیں آفتاب ـــــ خالد کی بات اور ہے۔ میرے بچپن سے لے کر میری جوانی تک کا ہر لمحہ تم لوگوں کے سامنے رہا اور میں نے اور تم نے، اچھی طرح جانا ہے کہ تم لوگ ستارے ہو آسمان پر چمکنے والے ـــــ میں دھول ہوں پیروں سے مٹ جانے والی۔ تم لوگ مجھے کبھی عزت کی نگاہ سے نہ دیکھ پاتے۔ خالد غیر تھا۔ اور پھر بے پناہ دولت نے اُس کے پاس دولت کی ویلیو ہی کھو دی ہے۔ بعد میں خالد نے مجھے بتایا کہ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پھوپا صاحب کی ایک ہی لڑکی ہے، یہ جانے بغیر کہ میں کون تھی، اس نے پیام پیش کر دیا۔ یہ تو قسمت کے کھیل ہیں۔ بچپن سے لے کر جوانی تک جس دولت نے سدا میرا دل دُکھایا، وہ میرے قدموں میں آئی بھی تو کب اور کیسے ـــــ کہ میں نے زندگی سے جیسے ناطہ توڑ لیا۔ میں زندگی کے کیسے کڑے دوراہے پر کھڑی ہوں خدایا کہ نہ موت کی دعا مانگ سکتی ہوں نہ زندگی کی آرزو کر سکتی ہوں۔ موت کے بارے میں سوچوں تو میری ننھی سی گڑیا کی موہنی شکل میرے بڑھتے قدم روک لیتی ہے۔ اُس نے کیا قصور کیا ہے کہ ماں کی محبّت سے اتنی کومل عمر میں محروم ہو جائے اور جو جینے کے بارے میں سوچوں تو کیسے جیوں ـــــ؟؟ اِک ایسی آگ سینے میں لگی ہے جو نظر تو نہیں آتی مگر میرا وجود بھسم کئے دے رہی ہے۔ میں زندگی بھر سلگتی رہوں گی۔ یہ آگ کبھی نہ بجھے گی۔ جھوٹے دلاسوں اور تسلّیوں سے بھی نہیں ـــــ!!

بارش کے ننھے مُنّے قطرو! ـــــ میری جلتی ہوئی زندگی میں ٹھنڈک بھر دو۔ ہیروں کی طرح چمکنے والی بوندو! ـــــ میں اپنا آنچل پھیلا کر تم سے بھیک مانگتی

ہوں کہ اس لمحہ بہ لمحہ بھسم کر دینے والی آگ کو ٹھنڈا کر دو ــــ رات کی اس بے پناہ تاریکی کو اپنے جھل مِل کرتے حُسن سے اُجالے بخش دو ــــ !

مگر میں کس قدر نادان ہوں ــــ کیا یہ آگ پانی کے قطروں سے بجھ پائے گی ــــ ! اِس آگ کو کوئی پانی نہیں بُجھا سکتا ــــ اس تاریکی کو کوئی آفتاب بھی منوّر نہیں کر سکتا ــــ اس سیاہ رات کی کوئی سحر نہیں ــــ دِل کا شیشہ چُور چُور ہو چکا ہے ــــ کتنی ساری کرچیاں میری رُوح میں پیوست ہو گئی ہیں ــــ خدایا! میں نے دریچے سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لی ہیں۔ باہر بارش ہو رہی ہے تاریکی نے ہر چیز کو ڈھانک رکھا ہے ــــ آج کی رات کس قدر تاریک ہے۔ آج کے بعد سے تو ہر رات ہی تاریک ہے ــــ میرا لہو لہان دل ڈوبا جا رہا ہے۔ اور میں ڈوبتے دل کو تھام کر تاریکی سے پوچھ رہی ہوں ــــ کیا سچ مچ اب کبھی سحر نہ ہو گی ــــ؟"

برسات

میں نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا دل تھام لیا۔
نیلے رنگ کی لمبی سی کار پورٹیکو سے نکلی اور چکر کاٹ کر پھاٹک سے باہر نکل گئی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرا دل بھی باہر نکل پڑے گا۔
"تو عارف چلا گیا!" میں نے جیسے خود کو سنایا۔ "ہمیشہ کے لئے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے! اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ نہ آنے کی تمنا کرے گا!"
میری آنکھیں برسات کے پہلے پہلے بادلوں کی طرح رُک رُک کر برسنے لگیں
آج سے بہت پہلے ایک بار اور بھی عارف گیا تھا۔ جب میں یونہی اُداس دل اور روتی آنکھیں لئے اپنے کمرے میں جا پڑی تھی تو سامنے ہی میز پر مجھے کاپی میں لکھا ہوا ایک شعر نظر آیا تھا ؎

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

میں اندر کی طرف لپکی۔ شاید آج بھی عارف نے کچھ لکھ دیا ہو۔ میں نے کمرے کا کونہ کونہ چھان مارا۔ کاپیوں کے صفحات بکھیر دیئے۔ کتابیں اُلٹ پلٹ کر ڈالیں مگر — مگر بے چین دل کی، وہ لوٹ آنے کی، وہ تمنا آج کہاں کھو گئی، کدھر کھو گئی؟

آج کوئی مجھے یہ کیوں نہیں سُناتا ؎

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کِس دل سے آئے ہیں

آج میری بزم سونی ہو گئی ہے۔ جانے والا چلا گیا۔ اب نہ وہ تمنّا ہے نہ لوٹ آنے کی وہ تڑپ۔ اب صرف برسات ہے۔ آنکھوں کا پانی۔ جو موقع بے موقع برس برس کر پُرانی یادوں کو سیراب کیا کرے گا۔ یادوں کی وہ بستی کبھی ویران نہ ہوگی۔ سدا لہلہاتی رہے گی۔ عارف نے ایک بار مجھ سے پوچھا تھا۔

"شوبی! تمھاری آنکھیں سدا گیلی گیلی سی نظر آتی ہیں۔ کیا تم اکیلے میں روتی رہتی ہو؟"

میں نے ہنس کر کہا تھا۔

ایسی بات تو نہیں، مگر جانے مجھے کیوں برسات کا موسم اتنا پسند ہے۔ شاید ......"

وہ بات کاٹ کر بولا تھا۔

"شاید اُسی کی مناسبت سے آنکھیں برسات پر تُلی رہتی ہیں۔"

میں نے دھیرے سے جواب دیا تھا۔

"میرا نام بھی تو شبنم ہے نا ـــــ شبنم! جو سدا روتی رہتی ہے۔"

برسات کی بات پر مجھے اچانک وہ شام یاد آ گئی ہے۔ میں اور باجی ڈرائنگ رُوم میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ باہر چھم چھم برسات ہو رہی تھی۔ ابھی ابھی تھوڑی دیر پہلے باجی نے کریم کو تھرماس دے کر آئس کریم لانے کے لئے بھیجا تھا۔ باجی کو برسات میں آئس کریم کھانے کا خبط تھا۔

اِک دم کال بیل بجی ۔ باجی نے بڑی کاہلی سے لیٹے ہی لیٹے کہا ۔
" پیاری شوبھ ! ذرا دروازہ تو کھول دے ۔"
میں آرام کرسی میں دھنسی ناول پڑھ رہی تھی ۔ بیزاری سے بولی ۔
" خود ہی اٹھ جایئے نا !"
" میری پیاری بہن نہیں ہے تو ؟"
میں نے ذرا بشاشت سے انھیں دیکھا اور بولی ۔
" اچھا تو جو بھی چیز دروازے پر ملے وہ میری ہو جائے گی ۔"
وہ شرارت سے ہنس کر بولیں ۔" اچھا اچھا بھائی تو دروازہ تو کھول ۔ دروازے میں جو بھی ہے وہ تیرا ہے ۔"
میں ساڑی کا پلو سنبھالتی ہوئی گئی اور دھیرے سے دروازہ کھول دیا ۔ اِک دم میں چونک پڑی ۔ جتنی آہستگی سے میں نے دروازہ کھولا تھا اتنی ہی آہستگی سے میرے دل کا دروازہ بھی کھل گیا ۔ میں نے سہم کر، ڈر کر باجی کو دیکھا ۔ وہ خود بھی بجلی کی سی پھرتی سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں ۔ میرے کانوں میں باجی کے جملے گونجنے لگے ۔
" دروازے میں جو بھی ہے وہ تیرا ہے ۔"
میرا جی چاہا دھیرے سے جھک کر، یوں جیسے موسم سرما کی چاندنی راتوں میں ایک ہلکے سے جھونکے سے پھول آپس میں جھک کر سرگوشی کرتے ہیں ——— پوچھوں ۔
" دروازے میں کھڑے ہونے والے اجنبی، کیا تم میرے ہو؟"
مگر دوسرے ہی لمحے میں اپنی اس حماقت پر شرمندہ ہو گئی ۔ برسات کا پانی قطرہ قطرہ ہو کر اس کے سانولے چہرے سے ٹپک رہا تھا ۔ سفید قمیص کی آستین بھیگ کر اس کے بازوؤں سے چپٹ گئی تھیں ۔ ماتھے پر بکھر آنے والے بال ننھے ننھے بھنورں

کی شکل میں اُس کی پیشانی پر بیچ و تاب کھا رہے تھے۔ میں نے یہ سب کچھ کتنی دیر تک دیکھا۔ کتنے جُگ بیت گئے۔ وہ کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"میں اندر آجاؤں؟"

میں گھبرا کر راستے سے ہٹ گئی۔

"آجائیے نا!"

الفاظ میری لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے جانے کیسے نکلے اور میں اپنی ساری قوّت جمع کر کے کرسی پہ آگری۔ میں نے بات بنھانے کو ناول اٹھا لیا۔ مگر سیاہ حروف ناچ ناچ کر جیسے اعلان کرنے لگے۔

"دروازے میں جو بھی ہے وہ تیرا ہے۔"

"دروازے میں جو بھی ہے وہ تیرا ہے۔"

"وہ تیرا ہے!"

"وہ تیرا ہے!!"

میں نے بے بس ہو کر ناول پٹخ دیا۔ آنکھیں اٹھائیں تو باجی ابھی تک منھ کھولے اسے دیکھے جا رہی تھیں۔

وہ قدرے مسکرا کر بولا۔

"آپ دونوں یوں سراسیمہ کیوں ہیں بھئی؟ میں تو آپ کی خالہ امّی کا بیٹا ہوں نا۔ اِتنی بار آپ کے ہاں آچکا ہوں ــــــ آخر آج آپ دونوں کو کیا ہو گیا؟"

اِک دم باجی دلکشی سے ہنستی ہوئی بولیں۔

"ہوا تو کچھ بھی نہیں، بس یہ ہوا کہ آپ کے آنے سے پہلے ہم دونوں آئس کریم کی منتظر تھیں۔"

"اور نتیجے میں مَیں برآمد ہو گیا، ہے نا؟"

وہ ہنس کر بولا۔

"نہیں!" باجی بڑی سادگی سے بولیں۔

"یہ شوبی کی بچی دروازہ کھولنے اٹھتی ہی نہ تھی۔ میں نے اسے لالچ دیا کہ دروازہ میں جو بھی ہے وہ تیرا ہے۔ اور ___ اور ___ ہائے ___" وہ ہنستی ہنستی پلنگ پر گر پڑیں۔ "کتنی عجیب بات ہے نا؟ گویا آپ شوبی کے ہیں!"

مجھے باجی کی حماقت پر اتنا غصہ آیا۔ اگر ایسی کوئی بات ہم دونوں میں ہوئی بھی تھی تو یوں ہنس ہنس کر اُسے سُنانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ہنس کر میری طرف مُڑا اور بولا۔

"ہاں جی میں آپ کا ہوں۔"؟

میں جیسے زمین میں گڑ گئی۔ ایسی بات کا بھلا کیا جواب ہو سکتا تھا۔ بہت دیر بعد میں نے نگاہیں اٹھائیں تو وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ پانی میں نہایا ہوا وہ سانولا سلونا چہرہ! ___ اُف ___!! برسات نے اُس کے چہرے پر کتنا نکھار اور حُسن پیدا کر دیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے آج سے پہلے میں نے عارف کو نہیں دیکھا تھا۔ دیکھا بھی تھا تو ایسی نگاہوں سے کہاں دیکھا تھا؟ وہ ہمیشہ جو آتا تھا تو بھائی جان کے کمرے میں یوں ہی بیٹھا بے ہنگم قہقہے لگانے والا ایک عام سا لڑکا تھا۔ مگر آج برسات میں بھیگ کر آنے والا، سانولی رنگت اور جلتی آنکھوں والا یہ کوئی دوسرا ہی عارف تھا۔ جو بے نیازی سے پوچھ رہا تھا۔

"کیا تم میری ہو؟"

اور یوں برسات میری زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں لے آئی برسات کے موسم کا وہ بادل جو عارف کو بھگو گیا تھا میرے لئے کتنا قابل احترام تھا۔ اُس کالے بادل نے میرے دل کے عبادت خانے کے دروازے کھول دیئے تھے۔ میں شبنم سے اِک دم پھول ہو گئی تھی۔ ہنستے مُسکراتے والا پھول۔ اور اُس رات میں باغ کی روشوں پر پھواروں میں اپنا چہرہ اونچا کر کے گنگنا گنگنا کر بادل کو پکار اُٹھی۔ لے بادل! آ میں تجھے چوم لوں۔ میری زندگی میں خوشیاں بھر دینے والے پانی کے قطرو! آؤ میں تمھیں اپنی آنکھوں میں بٹھا لوں۔

کھڑکی میں سے باجی نے اُٹھ کر مجھے آواز دی تھی۔

" شوبی چلو کمرے میں بھیگ کر بیمار ہو جاؤ گی۔ اتنی رات کو کوئی یوں باغوں میں گھومتا ہے؟ "

مجھے یاد ہے ایک بار میرے ہاتھ سے اتفاقاً سینٹ کی شیشی چھوٹ گئی۔ تھی اور ڈر کے مارے میں نے باجی سے یہ بات چھپالی تھی۔ انھوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا تھا۔

تو نے یہاں سینٹ تو نہیں گرایا؟"

میں سہم کر بولی تھی۔

" نہیں تو، میں کیوں گرانے لگی؟"

وہ اُسی انداز سے بولتی گئیں۔

" تو جھوٹ کہے بھی تو کیا ہوتا ہے۔ کہیں خوشبو بھی چھپی رہ سکتی ہے؟"

مجھے اب اپنی وہی حالت نظر آنے لگی۔ اُن دنوں میں خود کو یوں دنیا کی نگاہوں

سے بچائے بچائے پھرتی۔ لیکن جیسے باجی نگاہوں ہی نگاہوں میں کہے جاتیں۔

"کہیں خوشبو بھی چھپی رہ سکی ہے"۔

فرق صرف اتنا تھا کہ وہ سینٹ کی خوشبو تھی۔ یہ پیار کی خوشبو تھی۔ میں اپنے پیار کا راز آشکارا کرتی بھی تو کیسے؟ اگر کہیں عارف کو پتہ چل جاتا کہ میں اُس سے پیار کرنے لگی ہوں تو؟ تو وہ کیا سوچتا؟ کیا میں بھی اس لائق تھی کہ میں بھی چاہی جاتی؟ مجھے اپنے مقابل ایک دم باجی کا خیال آگیا۔ سُرخ و سپید رنگ سنہرے بال، بجلیوں کی طرح رہ رہ کر چمکتی آنکھیں اور شوخ و شنگ سراپا۔ ایک میں تھی، برسات کی شاموں کی طرح سانولا رنگ، آنکھیں بڑی بڑی مگر بجھی بجھی نم نم سی۔ دُبلی پتلی خاموش سی لڑکی۔ سر پر سیاہ بالوں کے بادل دیکھ دیکھ کے مجھے اکثر خیال آتا کہ میں صرف رو ہی سکتی ہوں۔ نام بھی تو ایسا ہی کچھ تھا۔ شبنم! صورت شکل کے حسابوں میں اگر میں شام تھی تو باجی صبح۔ پھر بھلا کون شام کی تاریکی کو گلے لگا سکتا ہے۔ سبھی چمکیلی اور روشن صبح کو پیار کرتے ہیں ظاہر ہے عارف بھی اُدھر ہی جھکے گا۔ اور کون جانے وہ باجی کو پیار کرتا بھی ہو۔ کسی کے جی کا حال میں جان بھی کیسے سکتی ہوں؟

عارف آتا تو باجی ہنستی مسکراتی اس سے باتیں کرتیں۔ بھائی جان کے ساتھ مل کر اُس سے بیٹھی گپیں لڑایا کرتی تھیں۔ بیڈمنٹن۔ کیرم۔ تاش کھیلتیں اور یہ سب کچھ ہو جاتا تو بہت بازی پر تل جاتیں۔ ایسے میں کبھی ساتھیوں کی کمی پڑ جاتی تو مجھے بلایا جاتا۔ مجھے اُس ماحول میں اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا۔ سب کے قہقہے سُن سُن کر میرا جی ڈوبنے لگتا۔ میرے سانولے چہرے پر غم کی چھاپ گہری ہوتے لگتی۔

ایسے میں کوئی نہ کوئی کہہ اُٹھتا۔

"بھئی شوبی! سچ مچ تم ہماری بہن نہیں لگتیں۔"

الگ الگ یہ بات نہ صرف ہر بھائی بہن نے، بلکہ امّی اور ابّو تک نے کہہ دی تھی کہ میں ان کی بیٹی نہیں لگتی۔ قسمت کی یہ خوبی ہی تو تھی کہ جہاں سب بھائی بہن چاند ستاروں کا دوسرا روپ تھے، میں برسات کی رات تھی۔ قسمت کے لحاظ سے بھی اور صورت کے لحاظ سے بھی! ایسے میں میرا جی چاہتا کہ سب سے الگ تھلگ رہوں۔ جہاں کوئی مجھے میری سانولی رنگت کا طعنہ نہ دے سکے۔ جہاں میری بجھی بجھی آنکھوں کو اُلاہنے نہ دیئے جاسکیں۔ کوئی یہ نہ کہے کہ اس کی شکل کیسی رونی ہے۔ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ جسے وہ چاہتی ہے وہ بھی اُس کی ہنسی اُڑائے۔ محبت کا جواب محبت سے نہ ملے تو عورت عورت نہیں، ناگن بن جاتی ہے۔ مجھے یہ کب پتہ تھا کہ عارف مجھے چاہتا ہے یا نہیں۔ لیکن میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ وہ مجھے چاہے نہ چاہے لیکن مجھے اُلاہنا نہ دے۔ میری ہنسی نہ اُڑائے۔ اسی لئے میں ہر لمحہ دُنیا والوں کی نگاہوں سے دُور رہنا چاہتی۔

ایسے میں ایک دن جب عارف نے بیت بازی میں یہ شعر پڑھا ؎

ہوتا ہے رازِ عشق و محبّت انہی سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں، مگر بے زباں نہیں

تو مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے میری آنکھیں مجسّم آگ بن گئی ہیں۔ ہر لمحہ بجھی بجھی رہنے والی آنکھوں نے چنگاریوں کا رُوپ دھار لیا ہے۔ اور وہی چنگاریاں اُڑ اُڑ کر عارف کے دل تک پہنچ رہی ہیں۔ اور اُسے بولنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ ع

آنکھیں زباں نہیں ہیں، مگر بے زباں نہیں

میں سر کے درد کا بہانہ کر کے اِک دم وہاں سے اُٹھ بھاگی۔ جب باہر نکلتے نکلتے

میں نے پلٹ کر دیکھا تو باجی حیرت سے عارف کو دیکھ رہی تھیں جو کسی کا خیال کئے بغیر مجھی کو گھورے جا رہا تھا۔

یہ میری زندگی کا وہ سنہرا دور تھا جب پہلی بار کسی نے مجھ پر پیار کی نظر ڈالی۔ میری سنجیدگی میں اور بھی ٹھہراؤ آگیا۔ مجھے اس بوجھ کے سنبھالنے میں اور بھی دکھی ہو جانا پڑا۔ کیا سچ میں اس لائق تھی؟

پھر دن یوں سرسر گزرنے لگے جیسے پُروائی ہوا کے جھونکے۔

ایک شام کو بارش تھم گئی تھی۔

سارے میں پانی ہی پانی تھا۔

کہیں بہتا ہوا کہیں رُکا ہوا۔ بچّے کاغذ کی ناؤ اور کشتیاں بنائے پانی میں چھپاکے اُڑا رہے تھے۔ باجی نے منوّر کے ہاتھ سے ایک ناؤ لی اور ہنستی ہوئی پانی میں اُتر گئیں

ناؤ کو بہا کر بولیں۔

"دیکھوں تو کہاں ڈوبتی ہے؟"

عارف بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔

مجھے پورچ میں کھڑی دیکھ کر بولا۔

"شوبی! تم بھی آکر کھیلو نا!"

"میں ___؟" میں گھبرا کر، پھر اک دم ہنس کر بولی۔ "میں کوئی بچّی ہوں؟"

عارف برجستہ بولا۔

"تو گویا تمھاری باجی تو بچّی ہیں نا؟"

باجی اس بات پر ذرا اُلجھ کر بولیں۔

"یہ تو سدا کی رونی ہے۔ کبھی کسی بات میں دلچسپی نہیں لیتی۔ پانی سے کیا کھیلے گی یہ!"

عارف نے بڑی سادگی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"آؤ تو سہی!"

میں نے لرز کر عارف کو دیکھا۔

بس دیکھ ہی کر رہ گئی۔ کہتی بھی کیا۔

اِتنے میں عارف نے میرے نام سے ایک ناؤ بنائی۔ اور اسے پانی میں ڈال کر بولا۔

"شوبی آنکھیں بند کرلو۔ اگر اُس گلاب کے پودے تک تمھاری ناؤ پہنچ گئی تو سمجھو سب کچھ ٹھیک ہے، ورنہ....."

"ورنہ کیا ــــــ؟"

میں بے تابی سے بولی۔

"ورنہ تمھاری ناؤ بس ڈوبی ہی سمجھو۔"

وہ ہنس کر بولا۔

وہ ہنس رہا تھا تو مجھے بھی ہنسنا پڑا۔ لیکن جانے کیوں میرا جی رہ رہ کر کانپ رہا تھا۔ میری بند پلکیں ہوئے ہوئے لرز رہی تھیں کہ اک دم لالی چیخ کر بولی۔

"شوبی باجی کی ناؤ مسرت باجی نے ڈبو دی!!"

میں نے جھٹ آنکھیں کھول دیں۔

باجی وہاں سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔

عارف سنجیدگی سے بولا۔

"ہاں مسرّت تم نے یہ ناؤ ڈبوئی!"

باجی پیروں سے چھپاکے اُڑاتے ہوئے بولیں -

" رچھی ان کھیلوں میں کیا رکھا ہے ۔ وہمی کہیں کے ۔"

اور وہ اپنی ساڑی پنڈلیوں تک اٹھائے بجلیاں گراتی چلی گئیں ۔ میں نے دُکھ سے عارف کو دیکھا ۔

عارف نے مجھے دیکھا اور بے لبسی سے آنکھیں جُھکا لیں ۔

تو یوں میری زندگی کی ناؤ باجی نے ڈبو دی ـــــ عارف تم نے یہ کھیل کیوں کھیلا ـــــ کیوں ـــــ کیوں ـــــ کیوں ـــــ میں اپنے آپ میں گم رہتی ۔ مذاق مذاق میں جیسے کسی نے میرا جی لُوٹ لیا ـــــ یہ سب کیا تھا ۔ ننھی سی روشنی جو میری تاریک زندگی میں بھولے سے آگئی تھی کہیں منہ نہ موڑ لے ۔ میں مسرت کی اُس ننھی سی شمع کو مضبوطی سے تھامے دھیرے دھیرے زندگی کی طرف بڑھنے لگی ۔

زندگی میں وہ پہلا موقع تھا جب میں نے اپنی سالگرہ دھوم دھام سے منانے کے بارے میں سوچا ۔ سبھی بہن بھائیوں کی سالگرہیں بڑے دھوم دھڑکے سے ہوا کرتی تھیں ۔ مگر میں کسی ہنگامے کو روا نہ رکھتی ۔ اب کے برس میرا جی اُمنگوں سے بھرپور تھا ۔ میں بڑے انہماک اور دلچسپیوں سے اپنا لباس تیار کرنے لگی ۔ میں نے دیکھا تھا ، عارف کو نیلا رنگ بہت پسند تھا ۔ میں نے چپکے سے اپنے دل سے صلاح کی اور نیلا لباس تیار کرنے لگی ۔

ایک صبح میں بیٹھی اپنے لباس پر ستارے ٹانک رہی تھی کہ باجی آگئیں اور مجھ سے پوچھنے لگیں کہ میں کس سلسلے میں یہ لباس تیار کر رہی ہوں ۔ جب میں نے سالگرہ کی بات سُنائی تو وہ ہنس کر بولیں ۔

"میری سنتی ہے تو سیاہ لباس خوب رہے گا۔"

"سیاہ لباس اور سالگرہ پر!" میں لرز کر بولی۔ کہیں دیکھا نہ سنا۔ سیاہ لباس تو ماتمی موقعوں کے لئے ہوتا ہے۔"

وہ جلتے جلتے بولیں۔

"میں تو اس لئے کہہ رہی تھی کہ عارف کو سیاہ رنگ پسند ہے!"

عارف کو سیاہ رنگ پسند ہے! پھر تو مجھے سیاہ لباس ہی پہننا چاہیئے۔ میں نے طے کر لیا اور نیلے کو ادھورا چھوڑ دیا۔

سالگرہ قریب آ رہی تھی۔ میں بہت مشغول رہتی تھی۔ ایک دن میں سیاہ ریشم پر سرخ دھاگے سے پھول بنا رہی تھی۔ کہ عارف آ گیا۔ مجھے مصروف دیکھ کر وہ رکا تو ہنسی یونہی کہنے لگا۔

"تم مجھ سے ناراض تو نہیں شوبی؟"

میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

وہ پیچھے مڑا کچھ کہنے کو ہوا۔ پھر ذرا دکھ سے مسکرا کر یونہی چلا گیا۔ میرے دل میں پھانس سی پڑ گئی۔

سالگرہ کے دن بڑا ہنگامہ تھا۔ مہمان بھرے پڑے تھے۔ اِکدم باہر سے کوئی مجھے پوچھتا ہوا آیا۔

"شبنم بی بی کہاں ہیں؟"

عارف شرارت سے بولا۔ "وہ —— جہاں بہت روشنی ہو رہی ہے نا —— وہاں!"

میں نے شرما کر دیکھا۔ کتنی عجیب بات کہی عارف نے۔ بھلا جہاں میں رہوں

ہاں روشنی ہو سکتی ہے؟

میں نے باجی کو مخاطب کیا۔

"باجی! سُنی آپ نے عارف کی بات؟"

باجی چڑ کر بولیں۔

"ہاں بہت دنوں سے سُن رہی ہوں۔ آج کوئی نئی بات تو نہیں کی۔"

میں دم بخود رہ گئی۔ باجی مجھ سے ناراض کیوں ہیں؟ یہی خیال رہ رہ کر دل میں کچوکے لگاتا رہا۔ میز کے آس پاس سب کھڑے تھے۔ میں نے اٹھارہ موم بتیاں روشن کیں۔ ایک دم عارف بولا۔

"بجھانے سے پہلے دل میں کوئی اچھی سی دُعا یاد کر لو۔"

میں ہنس کر بولی۔

"اُس سے کیا ہو گا؟"

عارف حیرت سے بولا۔ "کیا ہو گا؟ اری پاگل لڑکی، وِش نہیں کرو گی؟ یہی وقت تو ایسا ہوتا ہے جب اللہ میاں دعائیں سُن لیتے ہیں۔"

میں جھکی۔ اٹھارہ شمعوں کا اُجالا میرے چہرے پر چھلکا۔ اور میں نے ارمانوں بھری دُعا مانگی۔

"میرے خدا! میری خوشیوں کی ناؤ کبھی نہ ڈوبے!"

فنکشن ختم ہوئے بعد جب سب اِدھر اُدھر بکھر گئے تو عارف ایک لمحے کو میرے پاس آیا اور بس اتنا ہی بولا۔

"مجھے تم سے امید نہ تھی کہ ایسے موقعے پر ماتمی لباس پہنو گی۔"

میں نے حیرت سے اُسے دیکھا تو وہ بولا۔

" پہلے اِس لئے نہ کہا کہ یوں تمھاری خوشی ذرا کِرکری ہو جاتی ۔ آخر تم اتنی غم پسند کیوں ہو ؟ " وہ جُھک کر بولا ۔ مُسکرانا سیکھو میری گُڑیا ! مسکراہٹ ہی تو زندگی ہے ! "

مگر خوشیوں کا بار مجھ سے نہ سنبھل سکا ۔ اور اس بوجھ کو سنبھالتے سنبھالتے میں بالکل ہی خاموش سی رہ گئی ۔ عارف آتا تو میں اُسے یوں دیکھتی کہ بس چلتا تو بس اپنی آنکھوں میں چھپا لیتی ۔ کبھی اس کے سامنے میری زبان نہ کھُل سکی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ، زبان کھولوں گی تو طاقت جواب دے جائے گی ۔ میری زندگی میری آنکھوں میں سمٹ کر آ گئی تھی ۔ میں کیسے کہہ دیتی کہ میں تمھیں کتنا چاہتی ہوں ۔ میری زندگی کا مقصد بس یہی تھا کہ تمھیں چاہتی رہوں ۔ دیکھتی رہوں ۔ زبان کھولتی تو شاید میں مَیں نہ رہ جاتی ۔ میری عبادت کا سارا زور ٹوٹ جاتا ۔ میں جو تمھارا اتنا احترام کرتی تھی کیسے اس بے ادبی کی متحمل ہو سکتی تھی عرفی ؟ !

کچھ دن یونہی عبادت کرتے گزر گئے ۔ انہی دنوں عارف خالہ امّی کے ساتھ لکھنؤ چلا گیا اور میں نے اپنی کاپی کے ایک کونے میں محبّت کی وہ مختصر داستان پڑھی تھی جو لاکھ صفحات پر بھاری تھی ؎

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر !
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

میں نے دُنیا پالی ۔ میری زبان جو آگے ہی خاموش تھی بالکل ہی خاموش ہو گئی میں نے سوچا دنیا کا وہ کتنا عظیم مفکر تھا جس نے کہا تھا محبّت میں ایک وقت وہ آتا ہے جب خاموشی ہی گویائی ہو جاتی ہے ۔ اب میں خاموش رہتی تھی مگر میرا

انگ انگ بولتا تھا۔

عارف لکھنؤ سے آیا تو میں نے ایک بات آزمائی کہ وہ اب رہ رہ کر مجھے کچھ اجنبی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ میں اُسے اپنی طرف دیکھتے پاتی تو آنکھیں آپ ہی آپ جھک جاتیں۔ اقرارِ محبّت کی اس سے حسین ادا اور کون ہوسکتی تھی۔ لیکن شاید عارف اس سے کچھ مطمئن نہ تھا۔ وہ مرد تھا۔ اور منھ سے کہلوانے کا خواہش مند تھا۔ ایک دن باغ میں مجھے تنہا دیکھ کر بولا۔

"شوبی! تم نے سُنا ہوگا میں انٹرویو کے لئے بلایا گیا تھا اور سلیکٹ بھی کر لیا گیا ہوں۔ اور اب پروفیسر ہو رہا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ خوش ہوگیا۔ میں نے خوشی سے تمتماتا ہوا چہرہ اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہ بولتا گیا۔ "ظاہر ہے اب میں تنہا نہیں رہنا چاہوں گا۔ اگر میں تمھارے لئے ابّو سے بات کروں تو؟"

ہوائیں میرے کانوں میں نغمے بکھیرنے لگیں۔ میں اور کیا سُن سکتی تھی۔ ہاتھو سے چہرہ چھپا کر بھاگ آئی۔ راستے میں باجی ملیں۔ خوشی سے دمکتا میرا چہرہ دیکھ کر اُنھوں نے سر گھما کر پیچھے دیکھا جہاں میں ابھی ابھی عارف کو چھوڑ آئی تھی۔ وہ مُنھ سے تو کچھ نہ بولیں۔ اُداس چہرہ لئے دھیرے دھیرے عارف کی طرف بڑھنے لگیں۔

میرے دن اور راتیں خوشی میں گزرنے لگیں۔ اب میں اس دن کی منتظر تھی جب میرے آنگن میں شہنائی بجتی۔ اور آنکھوں میں آنسو، مگر دل میں خوشی کے طوفان چھپائے میں عارف کے گھر جاتی۔ چھوٹا سا گھر، جہاں بس میں اور عارف ہوتے۔ اور خوشیاں ہوتیں۔

"میری خوشیوں کو کوئی چُرا نہ لے، نظر نہ لگا دے۔"

میں یہی سوچے جاتی اور اپنی اُن سہانی امانتوں کو سنبھالنے کی کوشش میں الگ تھلگ اور خاموش رہتی۔

مجھے نہیں معلوم زندگی کی اس دوڑ میں مجھ سے کہاں، کونسی بھول ہوئی کہ زندگی سچ مچ برسات بن کر رہ گئی۔

وہ چاند کی گیارہویں تاریخ تھی۔ آسمان پر جھمجھماتا چاند تھا۔ اور نیچے لان میں ہم سب۔ کریم نے کبھی ٹرے میں ڈاک لاکر رکھ دی تھی۔ لیکن خط ابّو کے نام تھے۔ اس لئے کسی نے نہ کھولے تھے۔ ابّو آئے تو حسبِ عادت زور زور سے خط پڑھنے لگے۔ ابّو کی عادت تھی خط یوں پڑھتے جیسے گنگنا رہے ہوں۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتے۔ مگر وہ زور زور سے گُن گُن کئے جاتے۔ آخر میں انھوں نے ایک خط ختم کیا اور امّی سے مخاطب ہوکر خوشی خوشی بولے۔

" تو بھئی اب تمھاری کیا رائے ہے۔ ہم تو اس رشتے سے بہت خوش ہیں۔"

" کس کا رشتہ؟ کیسی رائے؟"

امّی ذرا الجھ کر بولیں۔

" ارے بھئی اپنی مسرت کے لئے عارف کا رشتہ آیا ہے نا۔"

گیارہویں کا چاند ڈھیرے ڈھیرے سیاہ بادلوں میں چھپ گیا اور میرے دل کا چاند بھی سدا کے لئے ڈوب گیا۔

اب عارف کی حیثیت ایک منگیتر کی ہوگئی تھی۔ اس لئے اب اُس نے ہمارے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ اور ہمارے گھر میں شادی کے ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ تقدیر کا یہ اتنا بڑا ستم تھا کہ میں کسی سے گلہ تک بھی نہ کرسکی میں نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ خود اپنے آپ سے بھی نہ پوچھا کہ آخر عارف اتنا بدل کیوں گیا۔

میں شادی کی تیاریوں میں سب سے پیش پیش رہی کہ کہیں لوگ یہ نہ کہنے لگیں یہ کیسی بہن ہے جو اپنی سگی بہن کی شادی سے بھی یوں ناخوش ہے۔ معلوم ہوتا تھا دنوں کے پیروں میں زنجیریں پڑ گئی ہیں۔ جو وقت پر لگا کر اُڑتا تھا اب یوں گھسٹنے لگا تھا جیسے پیر زخمی ہوں۔

آخر شادی کا دن بھی آگیا۔ میں نے نہایت بے دِلی سے ایک سفید لباس تیار کیا تھا وہی پہنا بھی تھا۔ عارف دُولھا بن کر میری آنکھوں کے سامنے باجی کو بیاہ لے جانے آیا۔ اور میں سب کچھ دیکھتی رہی۔ آنکھیں برسات برساتی رہیں اور میں اوپری دل سے مُسکراتی رہی۔ عارف نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ بس ایک بار اتنا پُوچھا۔

"ارے یہ سفید لباس اور اپنی بہن کی شادی میں!! جانتی ہو سفید لباس بیوائیں پہنتی ہیں!"

میں اپنے دل کا، اپنی زندگی کا سارا درد سمیٹ کر بس اتنا ہی کہہ سکی۔

"میں بھی تو کنواری بیوہ ہوں۔"

لیکن میں اپنی بات کا ردِّ عمل دیکھنے کے لئے عارف کے چہرے کو نہ دیکھ سکی۔ کیونکہ اُسی لمحہ میری آنکھوں سے برسات شروع ہو گئی تھی۔

شادی کے ہنگامے بھی ختم ہو گئے۔ میں گھائل ہرنی بنی بن بن دل کا چین کھوجتی پھری لیکن دل کی ویرانی اور دُکھ کا مداوا کہیں نہ ملا۔ باجی کو لے کر عارف کو لکھنؤ جانا تھا۔ سروس جوائن کرنی تھی۔ باجی اپنی روانگی کی تیاریوں میں رہتیں اور میں دیوانوں کی طرح کونے میں مُنھ چھپائے بیٹھی رہتی۔ اور روتی رہتی۔ ایک دن عارف نہ جانے کیسے مجھے تنہا پاکر باغ میں چلا آیا۔

اُس نے مجھے دیکھا۔

جیسے ہمت سمیٹی اور دکھ سے بولا۔

"شبنم! یہ میری زندگی تھی۔ میرا مقدر، مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔ مگر تم یہ تو سوچتیں کہ ایک پیار بھرے دل کے سامنے روپیہ پیسہ کیا حقیقت رکھتا ہے؟ تم نے مسرت کے سامنے یہ کہا تھا نا کہ تم عارف ایسے حقیر اور غریب پروفیسر سے کبھی شادی نہیں کروگی! ــــــ میں تمھارے لئے دعا کروں گا کہ خدا تمھیں اتنا امیر شوہر دے تو تمھیں سونے کے برابر تول دے۔"

میرا سر گھومنے لگا اور دنیا چکر کھاتی محسوس ہونے لگی۔ میں نے تڑپ کر عارف کی طرف دیکھا۔

"یہ سب تم کیا کہہ رہے ہو عارف؟"

لیکن وہ کہے جارہا تھا۔

"میں آتا تو تم خاموش ہو جاتیں۔ مجھے جس بات سے دکھ پہنچتا، وہی کرتیں۔ سالگرہ کے دن تم نے جان بوجھ کر سیاہ لباس پہنا۔ حالانکہ تم جانتی ہو مجھے سیاہ رنگ سے دلی نفرت ہے۔ تم مجھ سے چھپاتی رہیں۔ لیکن مسرت نے مجھ سے ہر ہر بات کہہ دی۔ تب میں نے سوچا، بہت برا ہوگا اگر میں زبردستی تم سے پیار کئے جاؤں۔ تمھیں بیاہ لے جاؤں۔ لیکن اب بھی یہ تڑپتا دل تمھیں یہی دعا دے گا کہ تم عمر بھر خوش رہو۔"

میں چکرا کر زمین پر گر پڑی۔

مجھے ماضی کی ہر ہر بات۔ ہر ہر لمحہ یاد آنے لگا۔

آہ! محبت کا تیر ہم دونوں بہنوں کے دل میں ایک ساتھ چبھا۔ اور باجی نے عارف کو جیتنے کی خاطر........

لیکن وہ بھی تو مجبور تھیں۔

اب عارف کے سامنے سب کچھ دُہرانے سے فائدہ بھی کیا ہوگا۔ زندگی کی ہر ہر خوشی تو آنسوؤں کی برسات میں بہہ گئی ہے۔

میری بزم سونی رہ گئی ہے عارف! —— تم دل میں ہو مگر پھر بھی کتنی دُور —— تم کس دل سے چلے گئے عارف! —— اور کچھ نہیں تو اُس برسات ہی کا خیال کیا ہوتا جس نے تمھاری شوبی کی زندگی کی خوشیوں کو ختم کر کے رکھ دیا ہے! —— جانے والا بزم سے اُٹھ کر چلا گیا۔ مگر برسات کی ہر پھوار پر، قدموں کی ہر آہٹ پر کانوں میں یہی صدا گونج اُٹھتی۔

"دروازے پر جو بھی ہے وہ تیرا ہے۔"

جب تک میری آنکھوں میں برسات کی نمی موجود ہے، میرے دل کو یہ یقین ہے کہ تم میرے ہو، صرف میرے ——!!

مَیں تمھاری ہُوں

آج میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

دُکھ سے بھاری یہ رات ـــــ جو زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے، آج بڑی منتوں کے بعد میرے دوار تک آئی ہے۔ میں اس لمحے کو کھونا نہیں چاہتی۔ یہ رات وہ رات ہے جس کی آس میں مدتوں میں نے دُکھ کا زہر پیا ہے۔

آج کی رات اقرارِ محبت کی رات!

پتہ نہیں آج تم کہاں ہوگے ـــ جہاں تم ہوگے پتہ نہیں وہاں اس سمے کیسا موسم ہو۔ ہو سکتا ہے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہو۔ اور تم کسی پیڑ کے نیچے بھیگتے ہوئے مجھے ہی یاد کر رہے ہو! ہو سکتا ہے کوئی ٹھنڈی خون منجمد کر دینے والی رات ہو اور تم کہیں آتش دان کے سامنے آگ کے دہکتے شعلوں میں مجھے ڈھونڈ رہے ہو!!

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسوقت کہیں کالی گھور اندھیری رات ہو، چاند روپوش ہو، ایک دو تارے بھی نظر نہ آتے ہوں۔ رات کی بے پناہ تاریکی میں تم یادوں کے جگنوؤں کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہو ـــ یادیں جو مجھ سے متعلق ہوں گی۔ یہ مجھے یقین ہے کہ تم جہاں بھی ہوگے میرے ہی لئے ہوگے۔ جب بھی سوچو گے میرے ہی لئے سوچو گے۔ تمھارے ہونٹوں پر مُسکراہٹ میرے ہی نام سے آتی ہوگی۔ تمھاری آنکھیں میرے ہی لئے روتی ہوں گی۔

تمھارا دل میرے ہی نام پر دھڑکتا ہوگا۔ تم جو مجھے اتنا چاہتے تھے کہ جب سے دُنیا بنی ہے
شاید کسی نے کسی کو اتنا نہ چاہا ہوگا۔!

آج سوچتی ہوں ساتوں سمندروں کی سیاہی بنا کر بھی لکھنے بیٹھوں تو تمھاری محبت
کی داستان ادھوری رہ جائے گی! مجھ میں ایسی کیا بات تھی؟ تم نے مجھے اتنا ٹوٹ کر چاہا
—؟ کیا دنیا میں مجھ جیسا تمھیں کوئی نظر نہ آیا تھا —؟

ایک بار میں نے تم سے کہا تھا۔ "یادیں تو چاند ہوتی ہیں — جو گھٹتی بڑھتی رہتی
ہیں لیکن فنا نہیں ہوتیں" آج تمھاری یادوں کا چاند پوری آب و تاب سے ذہن کے
آسمان پر جگمگا رہا ہے۔ اس جگمگاہٹ کے صدقے میں تم سے آج اپنے دل کی بات
کہہ دینا چاہتی ہوں — حالانکہ بہت دیر ہو چکی ہے لیکن دل پر ایک مدّت سے
جو ایک بوجھ رکھا ہے اُسے ہٹانے کی سعیٔ لاحاصل تو کرلوں۔

آج میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ اعترافِ گناہ کہو یا اعترافِ محبت۔

میں تمھاری ہوں!

میں تم سے محبّت کرتی ہوں!

شاید آج سے برسوں پہلے تم یہ جملے سُن پاتے تو خوشی سے پاگل ہو جاتے۔
سارے میں ناچتے پھرتے۔ آسمان کے چاند ستاروں کی طرف لپک پڑتے — لیکن
ان دنوں میری زبان پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ میں خود ساختہ ڈر، خوف اور انجانے
جذبوں کے حصار میں گھری اپنے آپ سے بچتی چھپتی پھرتی تھی اور کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ
تمھارے نام پر مُسکراؤں۔

آج تمھارے نام کے ساتھ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں — میں جو کبھی
مُسکراتے ہوئے ڈرتی تھی آج تمھارے لئے کھلے عام روتی پھرتی ہوں!

یاد ہے ایک بار تم نے کہا تھا ــــ "محبّت کرنے والے نڈر ہو جاتے ہیں۔ خوف کا کوئی جذبہ انھیں باندھ نہیں سکتا۔" آج تمھاری کہی ہوئی کتنی ہی باتیں یاد آتی ہیں۔ تمھاری وہ آواز یاد آتی ہے جس نے زندگی کے اندھیروں میں روشنیوں کے چاند کھِلا دیئے تھے۔

وہ دن ــــ زندگی کا وہ دن ــــ پتہ نہیں اُسے کس نام سے موسوم کروں ــــ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتے ہی میں کارنر کی طرف لپکی۔ ارشد صبح سے باہر گئے ہوئے تھے۔ میں سمجھی انہی کا فون ہوگا۔ بے صبری سے میں نے ریسیور میں منہ ڈال کر کہا۔

"آپ اب تک کہاں تھے؟"

اُدھر سے ہلکی سی ہنسی کی آواز کے ساتھ سُنائی دیا۔

"آپ نے میری آواز پہچانی۔"

میں اسی بے صبری سے بولی ــــ "یہ آواز ــــ؟ یہ آواز تو وہ آواز ہے جسے سُنتے ہی بجھے ہوئے چراغ جل اٹھتے ہیں! بھلا میں اس آواز کو نہ پہچان پاؤں گی؟"

پھر وہی ہنسی اور اب کی بار ــــ "تب تو آپ غلطی کر گئیں!" ایک تیز سی ہنسی اور پھر کسی نے کہا ــــ "بہرحال آج میں نے جان لیا کہ آواز کا جادو کیا ہوتا ہے۔ دیکھئے آپ کو قسم ہے فون بند نہ کیجئے گا! اتنا سُن لیجئے کہ میں نے آپ کو اب تک دیکھا نہیں ہے لیکن اب سوچ سکتا ہوں کہ آپ کیسی ہوں گی ......"

میں جیسے نیند سے چونکی ــــ "ہائے اللہ! مجھ سے بھول ہوگئی۔ آپ ارشد نہیں تو کون ہیں؟"

اُدھر سے آواز آئی ــــ "ایک آواز جسے سُنتے ہی بجھے ہوئے چراغ جل اُٹھتے ہیں؟" اور کھٹ سے فون بند ہوگیا۔ میں سراسیمہ سی ہو کر کتنی ہی دیر تک ریسیور کو دیکھتی رہی

پھر میں نے آہستہ سے کریڈل میں فون رکھ دیا۔

رات کو ارشد آئے تو میں نے بڑی بے زاری سے صبح والا واقعہ کہہ سنایا۔

"پتہ نہیں کس نالائق کا فون آگیا تھا ارشی! میں سمجھی تمھارا ہوگا۔"

ارشد نے بات کاٹ دی ـــــ "ارے وہ میرے دوست کا ہوگا۔ سچ مچ بعید نالائق آدمی ہے۔" پھر وہ ہنس ہنس کر بتانے لگے کہ بعد میں وہ سیدھا میرے آفس ہی چلا آیا۔

"رہتا کہاں ہے؟" میں نے بلاوجہ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کلکتہ"

"یہاں کس لئے آیا ہے؟"

"ارے وہ کوئی معمولی آدمی ہے۔ بے حد قابل ڈاکٹر ہے بھئی۔"

"ٹھہرے گا کہاں ـــــ؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"میرے ہی ساتھ، اور کہاں جائے گا ـــــ میں اُسے لا رہا تھا لیکن اسے کچھ کام تھا ـــ کل آجائے گا۔"

میں سُن رہ گئی کچھ بول نہ پائی۔ اسی دم بہت سارے بچے ایک کٹی ہوئی پتنگ کے پیچھے شور مچاتے بھاگتے آئے۔ ارشد بھی بچوں میں بچہ بنے پتنگ لوٹنے کو لپکے میرا جی دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

"ارشی خدا کے لئے ....

خدا کے لئے ارشی ...."

ڈولتی ہوئی پتنگ ارشی کے ہاتھوں نہ لگ سکی۔ وہ ہاتھ ملتے ہوئے، ہنستے مُسکراتے پھر میرے پاس آ بیٹھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اتنے میں جیسے میرا سب کچھ لُٹ چکا تھا ـــــ

دوسرے دن میں نے زندگی میں پہلی بار تمھیں دیکھا۔ میں تمھیں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ میں ارشد کی منگیتر تھی۔ چند دنوں بعد ہماری شادی ہونے والی تھی۔ میں کسی اور کو اپنے اور ارشد کے بیچ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اور پھر کل تم نے فون پر چند ہی باتیں ایسی کی تھیں کہ میں دہل کر رہ گئی تھی۔ اس لئے میں بہت بجھی بجھی سی رہی۔

"شبنم ـــــ امی سے کہدینا یہ سالا اب یہیں رہے گا۔" ارشد نے محبت اور بے تکلفی سے اپنے دوست کی پیٹھ ٹھونکی۔ "ارے ہاں شبنم! میرے کمرے سے ملا ہوا جو کمرہ ہے وہ درست کروا دینا" پھر جیسے ارشد کو کچھ یاد آیا ـــــ

"ارے ہاں ثاقب ـــــ تعارف کرانا بھول گیا۔ یہ میری خالہ کی بیٹی ہیں شبنم....."

اور وہ تعارف ادھورا چھوڑ کر مسکرانے لگے۔

آج سوچتی ہوں اس دن ارشد تعارف مکمل کرا دیتے تو میری زندگی کا یہ رنگ نہ ہوتا۔ تم بھی میرے اتنے قریب نہ آتے اور میں ـــــ میں بھی یوں نہ لٹی ہوتی۔

تم نے مجھے ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر دیکھا اور سگریٹ جلانے لگے۔

ارشد اپنے دوست کو نوکروں کے اور میرے حوالے کر کے آفس چلے گئے اور میں نے اس دن زندگی کا سب سے بڑا دکھ سہا ـــــ جب میں تمھیں کھانے کے لئے بلانے تمہارے کمرے میں آئی تو تم نے مسکرا کر بہت پسندیدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور شرارت آمیز بے تکلفی سے بولے۔

"آپ تو بہت رنگین معلوم ہوتی ہیں بھئی!"

مجھے اچانک ہنسی آگئی ـــــ "یہ آپ نے کیسے جانا؟"

"بھئی یہ آپ کا سونے کا بدن، ہیروں کی سی آنکھیں، یاقوت کے ہونٹ، چاندی کی گھنٹیوں والی ہنسی اور..... اور....."

میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔

"آپ کو پتہ ہے میں .... میں ...."

میں تمھیں سُنانا چاہتی تھی کہ میں ارشد کی ہونے والی دلہن ہوں لیکن میں کہہ نہ پائی ــــ میں نے کہا تو بس یہ کہا۔

"میں ایسی باتیں سننے کی عادی نہیں ــــ"

اور میں نے سوچ لیا کہ شام کو جب ارشد آئیں گے تو میں کہہ دوں گی کہ آپ کے دوست کی ذمہ داری مجھ سے نہ سنبھلے گی ــــ لیکن شام کچھ اور ہی رنگ لے کر آئی۔ اس شام سردی کچھ زیادہ تھی۔ میں نے سیاہ رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ نہ جانے کیوں سر میں درد محسوس ہو رہا تھا اس لئے میں نے چوٹی گوندھی نہ جوڑا باندھا، یونہی کھلے بال پیٹھ پر چھوڑ رکھے۔ ارشد دیر سے لوٹنے والے تھے۔ فون آ چکا تھا۔ اُن سے پہلے تم آ گئے ــــ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے جب میں چائے کے لئے پوچھنے تمھارے کمرے تک آئی تو تم نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا اور اچانک ٹھٹک گئے تھے۔

"آپ ــــ؟"

میں یونہی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"آج کی سیاہ رات چاند کے لئے ترسے گی ــــ لیکن چاند! وہ تو یہاں آ چھپا ہے ــــ"

میں نے گھبرا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔ ایسا کرتے میں میرے بال میرے چہرے پر، ہاتھوں پر آ گرے۔ میں آج تک تمھاری اس بے باکی پر حیرت کرتی ہوں۔ تم نے آگے بڑھ کر میرے بالوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا اور ترسی ہوئی آواز میں کہا تھے۔

"اتنا سونا نہ لٹاؤ ــــ یہ سونے کے تاروں سے بنے ہوئے تمھارے بال،

یہ جھلملاتا ہوا جسم، یہ ہیرے موتیوں کی آنکھیں "۔ اور میرا چہرہ اٹھا کر تم نے عجیب سی بے کسی سے سوال کیا۔

" تم نے میرا فون کیوں ریسیو کیا تھا شوبی ___؟"

اُس شام نے مجھے گونگے پن کا تحفہ عطا کیا ___ اور جب ارشد آفس سے لوٹے تو میں یہ بھی نہ کہہ سکی کہ تمھارا مہمان میرے بس کا نہیں ہے! میں جیسے اپنی زبان کہیں رہن رکھ چکی تھی۔ ارشد نے جب ہنستے ہوئے تم سے پوچھا۔

" کہو یار! یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے نا تمھیں؟"

تو یاد ہے جواب میں تم نے کیا کہا تھا ___؟

" تکلیف ___؟ نہیں ارشد یہاں آکر تو مجھے زندگی ملی ہے۔ اب میں نے طے کر لیا ہے کہ یہیں پریکٹس کروں گا ___"

تمھارا یہ فیصلہ ارشد نے خوش ہو کر اور میں نے سہم کر سُنا۔

میں کچھ نہ کہہ سکی ___ کچھ نہ کر سکی ___!

پھر اس کے بعد اتنے سارے دن گزرے، اتنے سارے حادثات ہوئے کہ میں جو یہ سمجھتی تھی کہ میں ارشد سے محبت میں اپنی جگہ چٹان کی مانند ہوں، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اپنی جگہ سے کچھ ہل سی گئی ہوں ___ اپنی محبت کے ننھے سے دیئے کو سنبھالتے سنبھالتے میں تھک تھک گئی۔ بس ہر لمحہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب بُجھا کہ تب بُجھا ___ ہر لمحہ ایک ہی سوال دل کو ڈسے لیتا تھا۔

" میں کیا کروں ___ کدھر جاؤں ___؟"

بھلے سے میں ارشد کی صرف منگیتر ہی تھی لیکن اپنی جگہ تو میں یہ سمجھے ہوئے تھی کہ میں ارشد کی ہو چکی ہوں۔ کیا نکاح کے دو بول ہی سب کچھ ہوتے ہیں؟؟

آج سے برسوں پہلے جب میں بالکل چھوٹی سی تھی امّی کی حالت بے حد نازک تھی۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا، ایسے میں خالہ امّی نے امّی کو تسلّی دے کر مجھے گود لے لیا۔ میں تین سال کی تھی لیکن دُھندلی دُھندلی یادیں آج بھی ذہن کے پردے پر جھلملا جاتی ہیں کہ خالہ امّی نے آٹھ سال کے ارشد کے بازو میں مجھے بھی بٹھالیا ہے اور دم توڑتی ہوئی امّی سے کہہ رہی ہیں۔ "دیکھو شمیم میں نے اس گڑیا کو اپنی بہو بنالیا ہے۔ دیکھو ارشد نے اس کا ہاتھ کس خوشی سے تھام لیا ہے۔ گھبراؤ نہیں تم اچھی ہوجاؤ گی تو ہم گڑیا گڈّے کی طرح دُھوم دھام سے ان دونوں کا بیاہ کریں گے۔

لیکن امّی یہ سب دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہیں ــــ اور میں وقت سے پہلے بغیر برات کی دُلہن بنی خالہ امّی کے گھر آگئی۔ بچپن سے لے کر آج تک میری یادداشت میں کوئی لمحہ ایسا نہ آیا جب کسی نے مجھے ٹیڑھی نگاہ سے بھی دیکھا ہو۔ خالہ امّی کے اتنے سارے بچّے تھے پھر بھی وہ سب سے زیادہ مجھی کو چاہتیں ــــ سارے خاندان میں یہ بات مشہور تھی کہ میری اور ارشد کی شادی طے ہے۔ شادی ہونے میں کوئی رکاوٹ تھی بھی نہیں۔ صرف میرے بی۔ اے کرنے کا انتظار تھا۔ یہ آخری سال اور آخری مہینے تھے۔ ایک بار خالہ امّی کو میں نے کہتے سُنا ــــ "شبنم اپنی تعلیم پوری کرلے تو ہوجائے گی شادی بھی۔ بن ماں کی بچّی یہ نہ سوچے کہ میری تعلیم تک پوری نہ ہونے دی اور لے کے گھریلو بکھیڑوں میں ڈال دیا۔"

گھر میں بے حساب پیسہ تھا۔ نوکر چاکر، کاریں، آسائشیں ــــ کتنی طرح کے بزنس تھے ــــ سب کی اور خاص طور سے ارشد کی بے پناہ چاہت مجھے میسّر تھی۔ ایسے میں میں اور کیا سوچ اور چاہ سکتی تھی کہ میری خوبصورت اور جھیل کی سی ساکن زندگی میں تمہارے پیار کا پتھر آگرا!

سچ مانو میں نے زندگی میں اتنا دُکھ کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ میں تمھاری چاہت دیکھ کر گھبرا کر رہ گئی۔ میں تمھیں چاہ بھی کیسے سکتی تھی۔ پانی کی طرف تو پیاسا لپکتا ہے۔ میں تو آگے ہی سیراب تھی۔ میں کیا دیکھ کر تم پر ریجھتی؟ میری دنیا میں کس چیز کی کمی تھی۔

تم ارشد کی مرضی سے وہیں پریکٹس کرنے لگے تھے۔ میں نے کہیں سُن رکھا تھا کہ ڈاکٹر لوگ جذبات سے عاری ہو جاتے ہیں۔ کوئی لطیف حس ان میں باقی نہیں رہ جاتی، لیکن تم بالکل برعکس نکلے۔ تم جذبات سے کتنے بھرپور تھے اور تمھاری حُسن پرستی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ اکثر مجھے تم پر کسی شاعر کا گمان ہوتا ـــــ ایک بار تم نے میری کسی بات پر مُسکرا کر کہا تھا ؎

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھوں یا تم سے بات کروں

میں نے کچھ جھلا کر کچھ مُسکرا کر کہا تھا ـــــ "سُوّر!"

یاد ہے تم نے کہا تھا ـــــ "تمھارے منہ سے ادا ہو کر تو وہ بھی پاک ہو جاتا ہے!"

تم میرا کتنا احترام کرتے تھے ـــــ!؟

ویسی چاہت پھر مجھے کبھی نصیب نہ ہوئی مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بار تم چند دنوں کے لئے کلکتہ چلے گئے تھے تو روزانہ میرے نام ایک لفافہ آتا تھا جس میں صرف ایک کورا کاغذ رکھا ہوتا۔ مجھے یاد ہے اس سفید اور کورے کاغذ پر ہر جگہ ایک ساتھ میرا اور تمھارا نام لکھا ہوتا ـــــ جسے کوئی آنکھ نہ پڑھ سکتی۔ لیکن وہ دل کی آنکھ!

ایک دن ایک لفافہ ایسا بھی مجھے ملا تھا جس میں ایک کورا کاغذ تھا جس پر صرف ایک شعر کونے میں لکھا ہوا تھا ؎

اس قدر تیرا تصوّر کبھی بڑھ جاتا ہے
آئینہ دیکھوں تو منہ تیرا نظر آتا ہے

یہ کیسی چاہت تھی خدایا — ؟ میں — جس نے تمھاری طرف کبھی محبّت کی ایک نظر تک نہ پھینکی — اور تم، جس نے اپنی ساری زندگی ہی جیسے وار کر رکھدی!!
تم آئے تو جیسے گھر کا کونا کونا روشن ہو اٹھا — (یا میں نے ہی محسوس کیا تھا؟)
تمھاری بے تابی اور دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ تم نے آتے ہی میرے ہاتھ تھام لئے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا — ؟
میں سہم کر بولی تھی — "پلیز۔ آپ نے یہ میرا ہاتھ کیوں پکڑلیا!"
"کیوں — ؟ کیا اس ہاتھ پر میرا حق نہیں؟"
"نہیں — یہ گناہ ہے!"
"ارے چھوڑو یہ گناہ ثواب کی باتیں — میں جو اتنا جانتا ہوں تمھیں — سب سے بڑا مذہب محبّت ہے اور میں محبّت کرتا ہوں تم سے — سمجھیں —!"
"آپ تو پاگل ہو رہے ہیں — آپ کو کچھ بھی نہیں معلوم۔"
تم ہنسے — "ارے مجھے سب معلوم ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ مجھے عام لوگوں سے چند باتیں زیادہ ہی معلوم ہیں اور سب سے بڑھ کر مجھے یہ معلوم ہے کہ تم میری ہو! سو فیصدی میری!!"
میں پاگل سی ہو اٹھی۔
خدا کے لئے مجھے اتنا نہ آزمایئے — آپ نہیں سمجھتے آپ کیا کر رہے ہیں —" میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا اور سسک اٹھی تھی۔

اُن دنوں بہاریں کیسے جھوم جھوم کر آتی تھیں ۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے بہاروں نے اپنے دریچے بند کر دیئے ہیں۔ خوشبوؤں سے لدی ہوائیں اب میرے کواڑوں پر دستک نہیں دیتیں۔ میں بہاروں کی رُت، پھولوں کے رنگ، کلیوں کی خوشبوئیں سب کچھ بھول بیٹھی ہوں۔ ان دنوں میں کس قدر شوخ رنگ کے کپڑے پسند کرتی تھی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ تمہارے طویل قیام نے تمہیں ہمارے ہی گھر کا ایک فرد بنا دیا تھا۔ سب تم سے بے حد بے تکلف تھے۔ ان دنوں میں بی، اے سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوکر سارا دن سکھی سہیلیوں اور بہنوں کے ساتھ ہنستی چہکتی رہتی ـــ خالہ امی کو شاپنگ اور سلائی سے فرصت نہ ملتی۔ باہر ورانڈے میں ایک ساتھ درزی اور سُنار مصروف رہتے۔ گھر کے سب سے بڑے بیٹے کی شادی ہونے والی ہو تو یہی سب کچھ ہوتا ہے۔

اُس دن سب تمہیں پکڑ کر گھیر لائے۔

" دیکھئے ثاقب بھائی! یہ آپی کے دلہناپے کا جوڑا ہے کیسا ہے ـــ ؟"

چھپر کھٹ پر سُرخ جوڑا آگ کی طرح دہکتا ہوا پڑا تھا۔ تم نے ایک نظر جوڑے پر ڈالی تھی اور پھر مجھے دیکھ کر دھیرے سے کہا تھا۔

" کیا کہوں یہ جوڑا کیسا ہے ـــ تم پر کیسا کِھلے گا ـــ کاش تم یہ صرف میرے لئے پہنتیں ـــ"

میں اپنی جگہ لرز کر رہ گئی۔

اُس رات جب سب سو چکے تھے، چاند بُجھا بُجھا اور ستارے دُھواں دُھواں تھے۔ میں اُس اُداس رات کا سارا درد چھپائے تمہارے کمرے میں آئی۔ کتنی ہی دیر تک ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر میں نے جیسے ہمت سمیٹ کر بات شروع کی۔

" آپ ڈاکٹر ہیں ___ ہیں نا ___ ؟ "

تم کچھ نہ بولے۔ بس دیکھتے رہے ___ " مجھے تھوڑا سا زہر دے دیجئے۔ میں ایسی زندگی نہیں گزار سکتی۔ آپ کو پتہ ہے ارشد سے میرا کیا رشتہ ہے ؟؟ میں مرنا چاہتی ہوں ..... میں..... میں..... "

آنسوؤں نے میرا گلا روندھ دیا۔ تم دھیرے دھیرے میری طرف بڑھے۔ میں سحرزدہ سی یوں ہی کھڑی رہی۔ تم آگے بڑھے۔ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تم نے میرا چہرہ لیا ___ پھر تم میرے چہرے پر جھک گئے۔

میں جذبات کی شدت سے لرز کر رہ گئی ___ تم نے سر اٹھایا۔ سر اُٹھا کر کہا۔

" شوبی ___ یہ میری زندگی کا پہلا اور آخری اقدام ہے ___ پہلا اور آخری پیار! " اور جیسے زندگی سے سب کچھ چلا گیا ___ سب کچھ ___ تم نے مجھے کچھ کہنے تک کی مہلت نہ دی اور چلے گئے۔ ایک جملہ ___ ایک تیر ___ جو دل میں گڑ سا گیا۔

" شوبی! تم ہمیشہ سے میری تھیں۔ میری ہو! میری رہو گی!! لیکن صرف تمھاری خوشیوں کی خاطر ___ میں تمھاری راہ میں نہ آؤں گا ___ خدا کرے تم خوشی خوشی ارشد کی دُلہن بنو ___ "

اور جس رات مجھے دُلہن بننا تھا۔ مجھے سہاگ چڑھنا تھا ___ مجھے سُرخ جوڑا پہننا تھا ___ میں یوں بے حس تھی جیسے کوئی پتھر! جب زرتار طشت میں سُرخ جھم جھما جوڑا میرے لئے لایا گیا تو میں نے ساتھ بیٹھی سہیلی سے انکار کر دیا ___

" میں یہ سُرخ کپڑے نہ پہنوں گی ___ "

میرے کانوں میں تمھاری یہ بات گونج رہی تھی (کیا کہوں یہ جوڑا کیسا ہے ___ تم پر

کیسا کھلے گا ـــ کاش تم یہ صرف میرے لئے پہنتیں!)

"اری پاگل ہوئی ہے ـــ سب لوگ کیا کہیں گے ـــ؟" سہیلی نے کہا۔

"کیوں دُلہناپا تو محض رنگوں سے عبارت ہے۔ سُرخ رنگ کی کیا تخصیص ہے۔ ـــ اتنے سارے جوڑے ہیں۔ نیلے، پیلے، گلابی، ہرے، نارنجی، زعفرانی ـــ میں کوئی بھی پہن لوں گی ـــ سیاہ کیوں نہیں؟"

سہیلی نے مجھے لرز کر دیکھا۔ پھر وہ بھاگی بھاگی گئی اور خالہ امّی کو بلا کر لے آئی۔ خالہ امّی نے اُسے بھی میری ایک معصوم ضد سمجھ کر ہر ضد کی طرح سہہ لیا اور مجھے نارنجی رنگ کا جوڑا پہنا دیا۔ لیکن یہ میں کسے سناتی کہ یہ رنگ بھی تمھیں کتنا پسند تھا۔ ایک دن نارنجی ساڑی میں تم نے مجھے دیکھا تو کہا تھا۔

"سورج مارے ندامت کے اب دھوپ بکھیرنا چھوڑ دے گا۔ تم نے اُس کی نگاہیں جُھکا دیں ـــ"

وہ جوڑا میں نے کبھی نہ پہنا ـــ وہ سُرخ جوڑا جو صرف اس لئے بنا تھا کہ میں تمہارے لئے پہنتی ـــ اتنے سارے برسوں سے سنبھال سنبھال کر رکھا ہوا وہ جوڑا آج میرے جسم پر ہے ـــ اس کی سُرخیاں ذرا بھی ماند نہیں پڑی ہیں۔ گوٹے کناری کی جھلملاہٹ آج بھی ستاروں کو شرما رہی ہے ـــ آج یہ جوڑا میں نے اس لئے پہنا ہے کہ آج میرے دلہناپے کی رات ہے۔ میرے سہاگ کی ـــ میرے اقرارِ محبت کی رات!!

کیسے کیسے زمانے اس دل پر سے ہو کر گزر گئے ہیں ثاقب ـــ تم نے میرے لئے کیا کچھ نہیں سہا، کیا کچھ نہیں کیا، کیا کچھ نہیں دیا۔ میں تو ایک جملے سے بھی تمہارا دل نہ رکھ سکی کہ ہاں میں تمھاری ہوں ـــ میں تم سے محبّت کرتی ہوں۔

ایک بار ـــــ ہاں صرف ایک بار تم نے بڑی آس سے پوچھا تھا۔

"شوبی! اگر تم یہ کہہ دو کہ تم بھی مجھ سے محبّت کرتی ہو تو میں زندگی کا سارا زہر امرت سمجھ کر پی جاؤں۔!"

لیکن میں نے اپنے دل کو تھام کر بڑا سا جھوٹ بولا تھا۔

"میں ایسی بات کیسے کہہ دوں جو میرے دل نے کبھی سوچی بھی نہیں۔"

پھر میری شادی ہو گئی اور میں ارشد کے ساتھ دوسری کوٹھی میں چلی آئی ـــــ میں آ گئی لیکن زندگی کی ساری اچھی بُری یادیں وہیں چھوڑ آئی۔ (یا شاید میں ایسا سمجھتی تھی کہ میں اپنا ماضی چھوڑ آئی ہوں!)

ایک زمانے بعد ایک بار تم سے ملاقات ہوئی۔ تم اس قدر بدل گئے تھے کہ پہچانے بھی نہ جاتے تھے۔ تم نے پریکٹس وغیرہ بھی چھوڑ دی تھی۔ تمھاری بدحالی اور تباہی پر میرا جی دکھ کر رہ گیا ـــــ میں نے بہت کرب سے تمھیں دیکھا اور ایک ہی التجا کی ـــــ

"تم شادی کر لو ـــــ میری خاطر ـــــ"

تم ہنسے ـــــ وہ ہنسی جو لاکھ آنسوؤں سے بھیگی تھی۔

"کیا تم شادی کر کے خوش ہو ـــــ؟؟"

کتنی ہی دیر ہمارے درمیان خاموشی کی دیوار تنی رہی ـــــ پھر میں ہمت کر کے بولی۔

"لیکن تمھیں شادی شدہ دیکھ کر میں خوش ہو سکوں گی۔"

"لیکن شادی بار بار تو نہیں ہوتی نا شوبی ـــــ؟"

میں نے گھبرا کر تمھیں دیکھا ـــــ "میں سچ ہی تو کہہ رہا ہوں شوبی! میں نے مدّت ہوئی تم سے شادی کر لی اور سچ مچ بے حد خوش ہوں ـــــ" اور تم منہ پھیر کر رو دیے۔

میں خاموش بیٹھی رہی ـــــ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی سے جان نکل گئی ہے

—— دھیرے دھیرے میرے آنسوؤں سے میرا آنچل بھیگتا رہا اور میں قطرہ قطرہ کر کے شمع کی مانند پگھلتی رہی —— اچانک تم بولے۔

"شوبی! تم نے جو کہا میں نے صحیفۂ آسمانی سمجھ کر اس پر عمل کیا۔ آج بھی میں تمھاری بات مان لوں گا —— بتاؤ میں کس سے شادی کروں —— لیکن سچ کہوں شوبی! دنیا میں —— اتنی بڑی بھری پری دنیا میں تمھارا ثانی کوئی نہیں —— کوئی نہیں ہو سکتا —— تم نے کبھی آئینہ دیکھا —— ؟؟"

میرے کہنے پر تم نے غزالہ سے شادی کر لی۔ بھولی بھالی، تصوّراتی پریوں جیسا حُسن رکھنے والی غزالہ! جس سے شادی کر کے کوئی بھی مرد اپنے نصیب پر رشک کر سکتا تھا —— میری چچا زاد نند —— جو میری سہیلی بھی تھی۔ شادی کے بعد بھی تم رہے۔ شادی کے کچھ ماہ بعد غزالہ ماں بننے والی تھی۔ ایک دن اس نے بہت حسرت سے کہا تھا۔

" بھابی —— آپ میری دوست بھی ہیں اس لئے میں اپنائیت سے کہہ رہی ہوں کہ بھابی میرے نزدیک محبّت کی سب سے بڑی نشانی پیار ہے۔ لیکن بھابی شادی کو اتنے دن ہو گئے —— آج تک ثاقب نے مجھ سے پیار نہیں کیا —— ایسا کیوں ہے بھابی —— ؟ ایک بوسہ تک نہیں!"

میں سُن رہ گئی۔

کئی صدیاں مجھ پر سے ہو کر گذر گئیں —— مجھے وہ رات یاد آئی —— وہ لمحے یاد آئے —— وہ پیار یاد آیا جو کسی کی محبّت کی پہلی اور آخری نشانی تھی اور جیسے میں نے زندگی اور زندگی کی خوشیوں سے ہار مان لی۔

"اپنی شادی شدہ زندگی کا صدقہ کہو، دان کہو، بھیک کہو —— مجھے ایک خوشی ایک وعدہ دو ثاقب کہ تم کبھی خودکشی نہ کرو گے!"

تم نے ہنس کر (ایسی ہنسی جو آنسوؤں میں ڈوبی ہوتی ہے) کہا تھا۔

"اگر خودکشی کرنے پر یہ یقین ہوتا کہ تم مل جاؤ گی تو ضرور کر لیتا۔ لیکن جی کر تمھیں نہ پایا تو مر کر کیا پاؤں گا! اچھا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں ——!"

اور یہ وعدہ میں نے تم سے یوں لیا تھا کہ اُن دنوں تم اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ میری ڈسپنسری میں رکھے ہوئے زہر مجھے زندگی سے بغاوت پر اُکساتے رہتے ہیں۔

تم نے زندگی میں میری کوئی بات نہ ٹالی۔ یہ بات بھی مان گئے —— تم نے خودکشی نہیں کی۔ لیکن اس دور کے گوتم بنے، اپنے دکھوں کو اپنے میں سموئے تم ایک دن اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلے گئے —— کیسی کیسی تمہاری تلاش ہوئی لیکن تمھیں کوئی نہ پا سکا۔ اپنی زندگی پر نظر ڈالتی ہوں تو سراسر غموں کی پوٹ معلوم ہوتی ہے لیکن یہ بھی سوچتی ہوں کہ میں تمھیں دے بھی کیا سکتی تھی۔ لیکن اتنے سال گذر جانے پر آج جو میرے چاروں طرف دُکھ کا وسیع سمندر پھیلا ہوا ہے اور میں اس میں ڈوب جانے کو ہوں تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ ایک سچائی جو زندگی کی سب سے بڑی سچائی تھی، میں نے تم سے کیوں چھپائی —— میں نے تم سے کیوں چھپایا! کہ میں! میں بھی تم سے پیار کرتی تھی —— میں وہ حوصلہ کبھی اپنے میں پیدا نہ کر سکی جو میرے ہونٹوں پر پڑے ہوئے قفل کو توڑ سکتا، لیکن آج جبکہ بہاروں کی رُت مجھ سے روٹھ چلی ہے اور زندگی موت سے بدتر ہو چلی ہے میں صرف یہ اقرار کرنے کی خاطر تمھیں پکار رہی ہوں کہ میں تم سے محبّت کرتی ہوں —— میں تمھاری ہوں ——!! میں تمھاری ہوں —— صرف تمھاری!!!

———— ✧ ————

چہرے

ڈرائنگ روم میں خوب شور ہو رہا تھا۔ میں نے چپکے سے جھانکا تو دیکھا بھائی جان صوفہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ صوفہ کی دوسری طرف باجی بیٹھی تھی۔

ایک کرسی پر سلمیٰ بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ دوسرے صوفوں اور کرسیوں پر رضیہ، ناہید رفیعہ، زاہدہ، رفو اور بھی دوسرے بچے شور مچانے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہے تھے۔

"کیوں بھائی یہ شور کیوں ہو رہا ہے ؟"

میں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ارے آؤ آؤ بس تمہاری ہی کمی تھی"۔ بھائی جان مسکرا کر بولے۔ میں رضیہ کے پاس بیٹھ گئی۔ لیکن پھر اُٹھ کر بھائی جان، اور باجی کے بیچ میں بیٹھ گئی۔

"بھئی مجھے میرے سوال کا جواب تو ملا ہی نہیں"۔ میں نے سب پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔

"ارے بھئی ہم بیت بازی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن کون کس طرف رہے ؟ یہ فیصلہ کرنا ہے، اور اسی لئے یہ شور ہو رہا ہے"۔

باجی نے مجھے پوری رپورٹ سُنا دی۔

"اونہہ ـــ بھلا یہ بھی کوئی کام ہے جس کے لئے اتنا شور مچایا جائے"۔

ہم نے اپنی بڑائی جتائی۔ "سنو، بھئی میں، بھائی جان، اور باجی ایک ....."

"نہیں نہیں، ایسے نہیں۔ باجی ہمارے گروپ میں رہے گی۔"

ناہید اور رفیعہ میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی چیخ اٹھیں۔

"اتنا چیخو نہیں۔" میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ "سنو ناہید سلمہ باجی اور فراز بھائی ایک طرف، میں، بھائی جان، رفیعہ، اور رضیہ ایک طرف!"

"ہاں بھئی اب ٹھیک ہے۔" ناہید نے میری تائید کی ——

"ہاں بھئی تو بیت بازی شروع کی جائے، پہلا شعر کون کہے بھائی؟"

"پہلا شعر محفل کا سب سے حسین شخص کہے۔" بھائی جان بولے۔ سب کی نظریں بے ساختہ باجی پر پڑیں۔ نظروں کی بے پناہ یورش سے گھبرا کر باجی اپنے پیر کے انگوٹھے کو قالین پر رگڑنے لگی۔

باجی تھی بھی واقعی بڑی سویٹ، اسے دیکھ کر خواہ مخواہ پیارے پیارے اشعار گنگنانے کو جی چاہتا خصوصیت سے وہ قطعہ

تیری زلفیں ہیں کہ ساون کی گھٹا چھائی ہے
تیرے عارض ہیں کہ پھولوں کو ہنسی آئی ہے
یہ ترا جسم ہے یا صبح کی شہزادی کی
ظلمتِ شب سے الجھتی ہوئی انگڑائی ہے

جب کوئی باجی کو چھیڑتا اس کا منہ سرخ ہو جاتا، اور شرما کر سر جھکا لیتی۔ اس کی یہ ادا مجھے بیحد بھاتی، میرا دل چاہتا اسے ہمیشہ چھیڑتی رہو۔ اور وہ سدا شرما کر سرخ ہوتی رہے۔ سر جھکاتی رہے۔ باجی نے جھکی نگاہیں اٹھائیں، سب کو

دیکھا اور بات بنانے کو بولی ۔
"سلمٰی کہہ دو نا پہلا شعر ۔"
"واہ یہ حق تو آپ کا ہے ۔"
سلمٰی مُسکرا کر بولی ۔
"ہائے باجی، جلدی سے شعر کہہ دونا ۔" کوئی اُکتا کر بولا ۔
"پہلے شرط پر تو غور کر دو ۔" باجی بن کر بولی ۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ محفل میں سب سے زیادہ حسین وہی ہے ۔
"اللہ ری بے نیازی ۔"
فراز بھائی جواب تک اس بحث سے الگ تھے باجی کو گھورتے ہوئے بولے ۔
اس وار پہ باجی ذرا جل کر بولی ؎

اندیشۂ خزاں بھی ہے گلچیں کا خوف بھی !
ہنستے ہیں پھر بھی پھول تو فطرت کا کیا علاج

بیت بازی عجب انداز سے شروع ہو گئی ۔
"کوئی جیم کا شعر کہو بھئی جلدی سے !" میں بولی ۔
بھائی جان نے بہت ہی پیارا شعر کہا ؎

جنھیں تم کہہ نہیں سکتے، جنھیں ہم سُن نہیں سکتے
وہی کہنے کی باتیں ہیں، وہی سُننے کی باتیں ہیں

اُسی وقت رفّو جو کسی کام سے اُٹھ کر چلا گیا تھا پھر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا ۔
"ارے بھئی رفّو بھیّا ! کوئی "ن" کا شعر کہو نا ۔"

بھائی جان دس سال کے رفّو کو بڑے مزے سے رفّو بھیا کہتے تھے۔

"کیا۔؟" رفّو صاحب آنکھیں مٹکا کر بولے۔

"اجی صاحب آپ کی باجی کو "نون" کا شعر یاد نہیں ہے۔ کوئی شعر کہو۔"

"ذرا اُردو میں کہونا، ایسی انگلش کیوں بگھار رہے ہو؟" یہ رفّو کی خاص اصطلاح تھی۔ جب وہ کوئی بات اچھی طرح نہ سمجھ پاتا تو یوں ہی کہا کرتا۔

"ارے یار تم بھی اُلّو کی دُم ہو بس، ارے بے وقوف کوئی ایسا شعر پڑھ جس کا پہلا حرف "ن" سے شروع ہوتا ہوا" بھائی جان رفّو کا سر ہلا کر بولے۔

"اوں — تو یہ بات تھی — سُنو —" رفّو صاحب نے انتہائی سادگی سے یہ شعر پڑھا ؎

ندی ہوں میں، نالہ ہوں میں

آفت کا پرکالہ ہوں میں

ایک فلک شگاف قہقہہ پڑا اور رفّو جھینپ کر باہر بھاگ گیا۔

سلمیٰ نے "ن" کا شعر کہا ؎

نہ دے الزام اے ناداں زمانے کے حوادث کو

یہی فتنے تجھے ہر گام پر بیدار کرتے ہیں

میں نے سلمیٰ کے شعر کے جواب میں کہا ؎

نہ پوچھ مجھ سے مرے ہمنشیں خوشی کیا ہے

غمِ فراق کا رونا ہے زندگی کیا ہے

"جلدی سے "ی" کا شعر کہو، ورنہ مات!"

رضیہ نے ڈرایا۔ فراز بھائی نے ہڑبڑا کر یہ شعر پڑھے ؎

یہ کس کا ڈھلک گیا ہے آنچل
تاروں کی نگاہ جھک گئی ہے
یہ کس کی مچل پڑی ہیں زلفیں
جاتی ہوئی رات رک گئی ہے

بھائی جان فراز بھائی کے جواب میں بولے ؎

یہ سیہ پھولوں کی ساری واقعی کیا خوب ہے
اس پہ نکھرا نکھرا رنگ دلکشی کیا خوب ہے

باجی غیر ارادی طور پر شرما کر رہ گئی۔ اس نے سیاہ پھولوں کی ساری پہن رکھی تھی۔ فراز بھائی اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئے۔

ناہید نے پہلی بار شعر دیا ؎

یہ مے چھلک کے بھی اس حسن کو پہنچ نہ سکی
یہ پھول کھل کے بھی اس کا شباب ہو نہ سکا

میں نے جواباً یہ شعر کہا ؎

انگڑائی یہ کس نے لی ادا سے
کیسی یہ کرن فضا میں پھوٹی
کیوں رنگ برس پڑا چمن میں!
کیا توس قزح لچک کے ٹوٹی

باجی نے "ی" کا شعر کہا ؎

یونہی بیٹھے بیٹھے خیال آ گیا
اگر تم نہ ہوتے تو دنیا نہ ہوتی

اور شعر پڑھتے پڑھتے باجی نے بھائی جان کو ایسی نظروں سے دیکھا گویا واقعی بھائی جان نہ ہوتے تو دنیا داہ ہوتی۔

فراز بھائی نے باجی کی یہ حرکت دیکھ لی۔ وہ تو پہلے ہی سے جلے بیٹھے تھے اور بھی جل گئے۔ غصّہ اُتارنے کو بہانہ تراشا —!

"اختر! تم نے شعر غلط کہا ہے!"

باجی سمجھ گئی کہ فراز بھائی خواہ مخواہ غصّہ دکھا رہے ہیں قدرے چڑ کر بولی۔

"آپ کو معلوم ہو تو کہئے نا صحیح شعر"

فراز بھائی جھلّا کر بولے۔

"تو کیا میں جھوٹا ہوں؟"

باجی اُکتا کر بولی۔

"جھوٹا کون کہتا ہے لیکن صحیح شعر تو بتایئے"

فراز بھائی کو شعر کے غلط ہونے یا صحیح ہونے سے سروکار نہ تھا۔ انھوں نے اپنی جھنجھلاہٹ یوں اتاری کہ پاس پڑا ہوا شیشے کا پیپر ویٹ باجی کے دے مارا اور بولے —

"تو یہ صحیح شعر!"

باجی نے وار ہاتھ پر روکا تو اس کے ہاتھ کی تین چوڑیاں ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گئیں۔ اور خون بہنے لگا۔

خون دیکھ کر بھائی جان تلملا گئے۔

"یہ کیا کر دیا فراز؟"

بھائی جان تڑپ کر بولے۔

"تم بیچ میں مت بولو جی!" فراز بھائی نے ڈانٹ پلائی۔

"بولوں کیسے نہیں، اگر خون بھی کر دو تو نہ بولوں۔"

بات بڑھتی دیکھ کر فراز بھائی کمرے سے نکل گئے اور اچھی خاصی محفل درہم برہم ہو کر رہ گئی۔

فراز بھائی تو ہمیشہ کے ضدّی واقع ہوئے تھے۔ ذرا سی کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی اور انھوں نے اکڑ دکھائی۔

دادی امّاں نے مرتے وقت باجی کا ہاتھ فراز بھائی کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ مرنے والی کی آرزو کون نہ پوری کرتا؟ باجی ان ہی کی ہونے والی تھی۔

اور وہ اُس پر جا و بیجا رعب گانٹھتے رہتے۔ بے چاری مجبور و بے کس باجی!! کئی بار وہ ایسی محفلوں کو بے رونق کر چکے تھے۔ جب سب خوش رہتے اس وقت فراز بھائی کوئی نہ کوئی ایسی بات کر بیٹھتے کہ جس سے سب کئے کرائے پر پانی پھر جاتا۔

گھر میں کون تھا جو اُن سے خوش تھا؟

ایک دن ہم سب باغ میں بیٹھے تھے، جانے کس موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ باجی بولی۔

"میں تو کبھی نہیں روتی، چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ہمیشہ ہنستی ہی رہتی ہوں۔ کیوں ہے نا نا جو؟" اس نے مجھ سے تائید چاہی۔

ہمیشہ کی بات تو شاید غلط ہو۔ لیکن آپ عموماً ہنستی ہی رہتی ہیں۔"

" اچھا بھائی سب کو چیلنج کوئی بھی میری آنکھیں آنسو بتا دے۔" باجی ہنستے ہوئے بولی۔

"باجی تو اس انداز سے کہہ رہی ہے جیسے جس دن رو دے گی تو دُنیا کا آٹھواں عجوبہ ہی وجود میں آجائے گا۔" ناہید مجھ سے بولی۔

باجی پوری سُرخ ہو گئی۔ اور پھر جھینپ کر مسکرانے لگی۔ اور اس بات کے کچھ دنوں بعد میں نے بھائی جان کو سُنایا ــــــ "بھائی جان! دُنیا کا آٹھواں عجوبہ وجود میں آگیا۔

باجی کی آنکھیں سُرخ ہیں اور سوجی ہوئی بھی۔ شاید بہت دیر تک روتی رہی ہے۔" میں زبردستی بھائی جان کو باجی کے کمرے تک گھسیٹ لائی۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی الماری سے کوئی کتاب نکالی اور پڑھنے لگی۔ کتاب کو چہرے کے سامنے یوں رکھا کہ ــــــ چہرہ ہماری نظروں سے اوجھل رہے۔

"باجی! اس دن کی بات یاد ہے؟ ــ آپ کا چیلنج؟" میں نے کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی۔

"ہنسی اور آنسو پر کسی کا اختیار نہیں۔"

اور باجی کی بادام جیسی بڑی بڑی آنکھوں کے گوشوں سے دو آنسو اس کی گود میں ٹپک پڑے۔

"لیکن باجی! آپ تو کہتی تھیں....."

اُس نے میری بات کاٹ دی۔

"ہاں کہتی تھی، لیکن تمھیں کیا معلوم نا جو، جانتی ہو جب حضرت آدمؑ جنت سے نکالے گئے تو......"

"اب یہ آدم کی بچی کوئی نیا قصّہ چھیڑے گی۔ یوں بھی مجھے یہ آدم اور حوّا کے قصّے ذرا نہیں بھاتے۔"

میں نے اُکتا کر بھائی جان کو دیکھا، اور پھر باجی کو، اور پھر اُٹھ کر چپکے سے چل دی۔
دروازے کے پاس جاکر میں تھوڑی دیر کے لئے کھڑی ہوگئی۔
پہلے تو باجی کی سسکیوں کی آواز پر مجھے بہت رحم آیا۔ بے چاری باجی کتنا سسک سسک کر رو رہی تھی۔ پھر ایک دم ہنسی کی آواز آنے لگی۔ یہ باجی بھی بس پاگل ہی ہے۔ روتے روتے ہنسنے لگ گئی۔ کچھ بھی تو میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں جلدی سے وہاں سے چلی آئی۔ اور وائلن پر ایک دُھن بجانے لگی۔

بہت دنوں بعد پتہ چلا کہ فراز بھائی نے باجی کو ایک ایسی "کڑوی" بات کہی تھی کہ وہ آٹھواں عجوبہ وجود میں لانے پر مجبور ہوگئی تھی۔ یہ بات مجھے باجی نے بتائی۔ لیکن یہ نہ بتایا کہ وہ بات کیا تھی؟

سلمٰی بہت دنوں سے نہیں آئی تھی۔ ایک دن صبح ہی صبح سلمٰی ٹپک پڑی۔ میں نے اسے ایکدم جھنجھوڑ ڈالا۔
"بتا۔۔ اتنے دنوں سے کیوں نہیں آئی تھی؟"
"اسٹڈی جو کرنی تھی۔" اس نے ناک سکوڑی۔
"ہونہہ، تو گویا ہم یہاں مکھیاں ہی مارتے رہتے ہیں۔ ہے نا ۔۔۔؟"
میں نے ایک چپت اس کے گلابی گال پر جمادی۔
"اور تمھیں کام ہی کیا ہے۔ ناولیں پڑھنا ۔۔۔ وائلن پر الٹی سیدھی دھنیں بجانا یا پھر گھر بھر کے بچوں کو ستانا۔"
سلمٰی نے ایسے انداز سے کہا کہ مجھے زور سے ہنسی آگئی۔
"اری سلّو!"

میں سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "ایک بات کہوں؟"

"کیا۔۔۔؟" وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔

"باجی کا چیلنج تو یاد ہے نا؟"

"ارے بہت اچھی طرح سے۔"

"تو سنو۔۔۔"

میں نے دو تین دن پہلے کی پوری روداد اسے سنا دی۔ سلمیٰ بہت توجہ سے سنتی رہی اور پھر مسکرا کر بولی۔

"تو سمجھو بیڑا پار ہے۔"

"بیڑا پار ہے؟" میں حیرت سے بولی۔ کیا بک رہی ہو بھئی۔ اپنی تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"واہ، سمجھ میں کیسے نہیں آتا؟ یعنی بھائی جان اور باجی کی شادی بالکل پکّی!"

"وہ کیسے؟" بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ "اور یہ فراز بھائی جو باجی کے نام پر دھرنا دیئے بیٹھے تھے، ان کا کیا بنتا؟"

"تم پاگل ہو سلمیٰ؟ ذرا عقل کی بات کیا کرو۔"

"ناجو! تو بڑی بھولی ہے میری ناجو!" سلمیٰ نے میرے گال پر تھپکی دے کر کہا۔

میرے کچھ بھی پلّے نہ پڑا، میں اُکتا کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

"ارے دوست خوب چوری پکڑی، کیا کر رہے ہو یہاں؟ ابھی تیری امّی سے کہتی ہوں، رفّو کھیل رہا ہے۔ پڑھتا پڑھاتا خاک نہیں"۔ رفّو کو ڈرائنگ روم میں کھیلتا دیکھ کر میں نے اپنی جھنجھلاہٹ اتارنی چاہی۔

"کھیل کب رہا ہوں جی۔" وہ چڑچڑا کر بولا۔

"پھر کیا مچھر مار رہے ہو؟"

"یہ فراز بھائی کی فوٹو تھی نا؟ میں نے اُسے نکال کر فریم میں بھائی جان اور اختر آپا کی فوٹو لگا دی ہے۔"

رفو تالی پیٹ کر بولا۔

"ارے — شریر!" میں حیرت سے بولی، یہ کیا کیا تو نے؟ فراز بھائی اگر دیکھ لیں تو زندہ بھی نہ چھوڑیں گے تجھے۔"

"صورت تو ایسی ہے جناب کی۔ اور فوٹو لگا رکھی ہے ڈرائینگ روم میں!" رفو نے بہت ہی مضحکہ خیز شکل بنائی، میں اکدم ہنس پڑی۔

"ارے رفو! اگر بھائی جان باجی سے شادی کر لیں تو؟"

میں نے رفو کی رائے پوچھی

"واہ بھئی — واہ — کیا مزہ آئے گا۔" پھر خود ہی بولا۔ "یہ فراز بھائی سلمیٰ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ پھر تو باجی یقیناً بھائی جان کو مل جائے گی۔"

"واہ رے واہ خود غرض — اپنی باجی کے لئے میری سلمیٰ کو کنوئیں میں پھینک رہا ہے۔" میں نے اُسے دھمکایا۔

"فراز بھائی کنواں! — فراز بھائی کنواں!!"

وہ تالیاں پیٹنے لگا۔

میں ڈر گئی، یہ فراز بھائی تو یوں ہی اوٹ پٹانگ سے ہیں۔ اگر پتہ چل گیا کہ ناجو نے یہ خطاب دے رکھا ہے تو بوٹیاں ہی نوچ ڈالیں گے۔

"ارے سنو جی!" میں اسے چپ کرنے کو بولی۔ "بھلا جی تم کس سے شادی کرو گے؟"

"میں ــــ ؟" وہ بہت شاعرانہ انداز سے بالوں کو جھٹکا دے کر بولا۔

"میں ـــ ؟"

اور پھر میرے گال پر انگلی ٹکا کر بولا۔ "تم سے !"

"ہونہہ ـــ تم سے !!"

میں اسے چڑانے کو بولی۔ "صورت تو دیکھو اپنی، مجھ سے شادی کرنے چلے ہیں۔"

وہ روہانسا ہو کر بولا۔

"امّی سے کہتا ہوں۔ ناجو کی بچّی ستا رہی ہے۔"

میں اُسے پکڑنے کو لپکی، لیکن وہ باہر بھاگ گیا۔

میں نے میز پر سے فوٹو اٹھا لی اور سوچنے لگی ـــ

"کاش رفّو کے معصوم ہاتھوں کے صدقے یہ دونوں ہمیشہ کے لئے ایسے ہی ایک ہو جائیں۔" سوچتے سوچتے میں خود ہی مسکرا پڑی!

ایک بہار کی سہانی شام کو بھائی جان آرام کرسی پر لیٹے کچھ گنگنا رہے تھے۔ باجی کوئی ناول پڑھ رہی تھی، رفّو اپنے آس پاس بہت سی کاپیاں کتابیں پھیلائے اسکول کا کام کر رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بھائی جان سے بولا۔

"بھائی جان! HEART کے معنی کیا ہیں؟"

"رفّو بھیّا بات تو بڑے پتہ کی پوچھی ہے تم نے، لیکن مجھے خود نہیں معلوم، اپنی باجی سے پوچھ لو نا۔"

رفّو باجی کی طرف دیکھنے لگا۔

"ڈکشنری میں کیوں نہیں دیکھ لیتے جی۔" باجی ناول میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔

"ڈکشنری دیکھنی نہیں آتی۔" رفّو قدرے ڈر کر بولا۔

"ہائیں؟"

باجی ناول پٹخ کر بولی۔

"اتنے بڑے ہو گئے اور ابھی تک معنی دیکھنے نہیں آتے؟ لاؤ میں بتاؤں۔"

رفّو نے ڈکشنری باجی کے ہاتھ میں تھما دی۔

"دیکھو جس لفظ کے معنی دیکھنے ہوں اس کے شروع کے تین حرف دیکھا کرو، اب جیسے یہ HEART ہے نا...."

باجی نے ایک دم بھائی جان کو دیکھا ___ اُف! وہ نگاہیں، اُن میں غصہ، رحم، پیار، مُسکراہٹیں سبھی کچھ پوشیدہ تھا۔ باجی نے ڈکشنری پٹک دی۔ اور ناول اٹھا کر باہر نکل گئی۔ میں نے بھائی جان کو دیکھا، وہ مُسکرا رہے تھے۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔

میں نے ڈکشنری اٹھالی۔ اور دیکھنے لگی کہ کون سی چیز باجی کو ناراض کر سکتی ہے۔ ارے، یہ کیا؟ دل کی شناخت کے لئے چھوٹا سا جو دل بنا ہوا تھا اس میں سیاہی سے لکھا ہوا تھا۔ بیحد باریک باریک حرفوں میں۔

"دل کو ہے تم سے پیار کیوں؟ یہ نہ بتا سکوں گا میں"

"کیا ہے ناجو؟" بھائی جان نے مُسکرا کر پوچھا۔

"کسی شیطان نے اس میں کچھ لکھ مارا ہے،" باجی نے اسے اپنی طرف منسوب کرلیا

تبھی تو چڑ کر چلی گئی "۔
میں نے ڈکشنری بھائی جان کے سامنے کر دی۔
" ناجو! میرا خیال ہے میں ہی وہ شیطان ہوں "۔
" آپ؟" میں بھونچکی رہ گئی۔ " بھائی جان!"
" کیا ہے ناجو؟"
" میں اٹک اٹک کر بولنے لگی ــــ"
" تو...... کیا...... آپ...... ؟"
" تم نے سمجھنے میں بہت دیر کی ناجو! یہ بات تو تم سے زیادہ رفّو جانتا ہے ــــ ہے نا رفّو بھیا؟"
بھائی جان رفو سے مخاطب ہو گئے۔ رفّو صاحب کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی مسکرانے لگے۔ اور میرے پیٹ میں چوہے کودنے لگے کہ کب یہ بات سلمیٰ کو سنا سکوں گی۔

لیکن اس دنیا میں جو سوچو وہ کہاں ہوتا ہے۔ ہر ارمان اور ہر آرزو پوری ہو جائے تو دنیا کا نام دنیا نہ رہے۔ تمنّاؤں اور ارمانوں کے سسکتے اور پورا نہ ہونے کا نام ہی دراصل، دنیا ہے "۔
لاکھ سوچو، وہی ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے۔ قسمت کا لکھا کبھی نہیں مٹتا۔ انسان ہر چیز پر قادر ہونے کے باوجود کتنا بے بس ہے۔
فراز بھائی اور باجی کی شادی ہو ہی گئی۔ ہمارا گھر اچھا خاصا ویرانہ بن گیا۔ جیسے اس گھر میں کبھی قہقہے گونجے ہی نہ تھے۔
جیسے اس اُجڑے باغ میں کبھی بہار آئی ہی نہ تھی۔

سلمیٰ نے بی۔اے کے بعد۔ایم۔اے میں داخلہ لے لیا تھا۔اس نے بھی آنا کم کر دیا تھا۔کبھی کبھار آجاتی۔جب کبھی وہ آتی تو ہم دونوں باجی کی باتیں کرتے، باجی —— باجی کتنی پیاری تھی، کتنی سویٹ تھی، پھولوں کی خوشبو چاند کی کرنوں، سورج کی شعاعوں سے زیادہ پیاری اور حسین باجی، جو زندہ ہوتے ہوئے بھی ہم سے اتنی دور تھی کہ ہم اسے حاصل نہ کر سکے۔

میں بلّی کی طرح ہر چیز کو سونگھتی پھرتی، کسی کام میں دل نہ لگتا۔وائلن بجانے بیٹھی تو وہ اُلٹی سیدھی تانیں نکلتیں کہ طبیعت جھلّا جاتی۔

ناول، جو میری زندگی تھے، جنھیں میں امتحان کے دوران بھی پڑھتی رہی، اب مجھ سے نہ پڑھے جاتے، کتابوں پر گرد کی تہیں جم گئی تھیں۔

باغوں میں پھول اب بھی کھلتے لیکن ایسا معلوم ہوتا، جیسے ان میں وہ خوشبو نہیں، وہ روپ نہیں، وہ نکھار نہیں۔

رفو نے ڈرائنگ روم میں پھر فراز بھائی کی فوٹو لگا دی تھی۔اب اس کے معصوم قہقہے بہت کم گونجتے۔باجی سب کی روح وداں بھی وہ کیا گئی، باغوں کی بہاریں چلی گئیں۔

پھولوں کی خوشبوئیں چلی گئیں، زندگی کی رنگینیاں مر گئیں، ستاروں کی روشنی، ہواؤں کی مستی، چاند کی چاندنی بے نور ہو کر رہ گئیں۔

ایسا محسوس ہوتا جیسے ہر چیز اپنی اصلیت کھو بیٹھی ہے۔ہم سب نے جو سہانا سپنا دیکھا تھا، اس کی بھیانک تعبیر ہمارے سامنے تھی۔

بھائی جان دن بھر اپنے کمرے میں بند رہتے۔ان کی صحت گرتی جا رہی تھی ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اگر انھیں دلی خوشی نہ ملی تو ٹی بی ہو جائے گی۔

دو تین سال یوں ہی گزر گئے، اور بھائی جان دق کے راستے پر گامزن ہو گئے!

بھائی جان کی طبیعت بہت خراب ہو چکی تھی۔ زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہ گئی تھی۔ باجی بھائی جان کو دیکھنے آئی تو اس کی گود میں ننھا جاوید بھی تھا۔ بالکل بھائی جان جیسی آنکھوں والا ـــــ ہم نے یہ بھی سنا کہ فراز بھائی اس بات پر بہت چڑتے ہیں کہ جاوید کی آنکھوں میں بھائی جان کیوں جھلکتے ہیں؟
ایک دن سلمیٰ بھی آئی ہوئی تھی، ہم سب اسی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بھائی جان پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی پائنتی فراز بھائی بیٹھے سگرٹ پی رہے تھے۔ ان کے بازو ہی باجی بیٹھی بھائی جان کے پیر دبا رہی تھی۔ میں جاوید کو لئے چپ چاپ سی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔

"ناجو، باجی بیت بازی کریں گے نا؟" ناہید بولی۔

مجھے دو تین سال پہلے کا وہ دن یاد آگیا، جب ہم بیت بازی کر رہے تھے اور باجی بے قصور پٹ گئی تھی۔ باجی نے گہری گہری نظروں سے تاکا اور بولی۔

گزر گئیں جو بہاریں اب ان کا ذکر ہی کیا۔

میں نے ان ہی افراد کی دو پارٹیاں پھر بنا دیں۔ بھائی جان بے حد کمزور آواز سے بولے۔

"پہلا شعر محفل کا سب سے حسین آدمی کہے۔"

سب چونک سے پڑے اور سب کی نظریں باجی پر مرکوز ہو گئیں، مجھے بہت تعجب ہوا جب باجی نے بغیر کسی حیلے بہانے کے خود ہی یہ شعر پڑھ دیا ؎

اندیشۂ خزاں بھی ہے گل چیں کا خوف بھی
ہنستے ہیں پھر بھی پھول تو فطرت کا کیا علاج

اور دو موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر بھائی جان کے پیروں پر گر پڑے۔ گرم گرم آنسو!! اپنے جلو میں آہوں کی تپش لئے گرم آنسو،

بھائی جان چونک سے گئے۔ وہ سمجھے شاید یہ سگریٹ کی گرم راکھ گر رہی ہے۔ پیر سمیٹتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں بولے۔

"یار — فراز! ذرا ہاتھ پرے کر کے سگریٹ کی راکھ جھٹکو۔ پیر کو چر کے لگتے ہیں۔"

انتظار کے پھول

وہ شام زندگی میں پھر کبھی نہ آئی۔

کیسے دُکھ کی بات ہے کہ ایک ہی لمحہ میں جس پر اپنا سارا جیون وار دیا اُس کا نام نشان تک نہیں معلوم!

زندگی بھر کی غمناک داستان۔ محض چند الفاظ اور یادوں کا اثاثہ! مجھے پتہ نہیں تم کہاں ہو گے؟ اس وقت کیا کر رہے ہو گے؟ ہو سکتا ہے تمھارے پاس ایک خوبصورت سا گھر ہو، پیاری سی بیوی اور خوشی سے اچھلتے کودتے کئی بچے ہوں۔ تم تھکے ماندے دفتر سے آتے ہو گے، کیتنے سارے لوگ تمھیں گھیر لیتے ہونگے۔ تمھاری تھکن اک دم غائب ہو جاتی ہو گی۔ زندگی اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ تمھیں مصروف کر دیتی ہو گی۔ ایسے میں تم کیا جانو کہ کسی اور نے بھی تمھارا انتظار کیا ہے۔ ایسا انتظار جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ نہ ہو گا! دو چراغ آنکھوں کے جو برابر جل رہے ہیں، اِس امید اور آس میں کہ شاید تم کبھی لوٹ آؤ ــــــ

ان چراغوں کی روشنی کبھی نہیں بجھ سکتی۔ جنھیں تمھاری محبت نے زندگی بخشی ہو وہ کیسے فنا ہو سکتے ہیں؟

وہ شام ــــ جب زندگی میں پہلی اور آخری بار میں نے محبت کا مزہ چکھا۔

وہ امرت جسے عورت صرف ایک بار پیتی ہے اور ساری زندگی اسی نشہ میں مدہوش رہتی ہے۔ شاید تمھیں یاد بھی نہ ہو، لیکن میں تو صرف اُسی ایک لمحہ کی یاد لے کر جی رہی ہوں ـــــ کتنی سہانی شام تھی، تنہائی کا زہر بوند بوند کر کے میرے دل میں اُتر رہا تھا ـــــ

کہاں جاؤں ـــــ؟ ایسے حسین موسم میں گھر بیٹھے رہنا کس قدر حماقت ہے ـــــ!

ایک بار بہت دن پہلے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایروڈرم گئی تھی۔ یہاں وہاں سارے میں ہم لڑکیاں اچھلتی پھرتی تھیں۔ دیوزاد مہیب پرندوں کی طرح اُڑتے اُترتے بھاگتے طیاروں کو دیکھ کر ہم نے کیسے کیسے پروگرام آئندہ زندگی کے لئے مرتب کر ڈالے تھے۔ ساری دنیا گھومنے، جی بھر کے خوشیاں سمیٹنے کے ارمانوں بھرے خواب ـــــ!

پھر رات گئے جب لندن کے لئے روانہ ہونے والے جہاز کے بارے میں لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوا تو ہم سب دوڑی دوڑی اوپر ٹیرس پر پہنچ گئیں اور جھک جھک کر ان خوش نصیبوں کو دیکھنے لگیں جو نیچے اپنے اپنے بیگ، پرس، اوورکوٹ، سوئٹر سنبھالے، اپنے اپنے بچوں کی انگلیاں، شوہر بیویوں کے ہاتھ تھامے رنگین خوابوں کو دل میں بسائے نئی دُنیاؤں کی تلاش میں اڑنے جا رہے تھے۔

اس لمحہ میں نے بھول کر بھی نہ سوچا تھا کہ زندگی اور نئی دنیا کی کھوج میں میں ہمیشہ تنہا ہی بھٹکتی پھروں گی!

"آج بھی میں کیوں نہ ایرپورٹ چلی جاؤں ـــــ؟" میں نے دل میں سوچا

اور فوراً آمادہ ہوگئی —— ایرپورٹ کی دنیا بھی کیسی رنگین اور جھلملاتی دُنیا ہوتی ہے۔ گھنٹوں گزر جاتے ہیں اور وقت کا احساس تک نہیں ہوتا۔

پتہ نہیں کیوں اس دن میں نے اتنا بھرپور سنگار کیا کہ آئینہ دیکھ کر خود ہی حیران رہ گئی۔ کوئی زیور ایسا نہ چھوٹا جس نے مجھے سہاگن کہنے کی گواہی نہ دی ہو، آنکھوں میں، کاجل کی گہری گہری لکیریں کھینچنے کے بعد میں خود ہی ہنس پڑی۔

'ارے میں یہ سنگھار کس کے لئے کر رہی ہوں آخر —— ؟'

شاید وہ میرے دلہناپے کی پہلی اور آخری گھڑی تھی۔

چلتے چلتے میں نے ایک تازہ تازہ کھِلے گلاب کو اپنے جوڑے میں سجالیا، یہ گویا میرے دلہناپے کی تکمیل تھی۔ اس دن میں راہ چلتی تھی تو لوگ مجھے دیکھ دیکھ کر دانتوں میں انگلی دبا لیتے تھے۔ ٹھٹک جاتی تھی تو لوگ گڑبڑا کر ٹھوکر کھانے لگتے تھے —— میں نے گھبرا کر ایک ٹیکسی ہائر کرلی تھی۔ شاید مجھے ڈر تھا کہ ایسا نہ ہو کہ میرا سنگھار باسی ہو جائے جس کے لئے انتظار کیا ہے اس کے دیکھتے دیکھتے تک میں مُرجھا نہ جاؤں!

رات اپنی ساری خوبصورتیوں اور دلنوازیوں کے ساتھ میری منتظر تھی، لمبے چوڑے لاونج میں جیسے ہی میں نے قدم رکھا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یکبارگی ساری روشنیاں ماند سی پڑ گئی ہیں۔ اپنے حسن کا یہ بے پناہ احساس اس لمحہ سے پہلے کبھی تو مجھ میں نہ جاگا تھا۔ آخر یہ سب کچھ کیا ہو رہا تھا؟

میں گھبرا سی گئی۔ کتنی ساری نگاہیں میرے چہرے کا طواف کر رہی تھیں!! میں نے باریک ریشمی ساری کا پلّو اپنے چہرے اور سر کے گرد لپیٹ لیا۔ کسی خوش ذوق نے فقرہ بھی کسا —— !

اے بھائی چاند چاند ہی ہوتا ہے۔ کہیں بدلیوں سے بھی حُسن چھپایا جا سکتا ہے؟"
میں نے سہم کر اِدھر اُدھر دیکھا، یہ کیا حماقت میں نے کر لی تھی جو اکیلی ہی چلی آئی، کم سے کم کوئی سکھی سہیلی ہی ساتھ ہوتی۔ اکیلے پن کے احساس سے میرا دل نہ جانے کیوں اداس ہونے لگا۔

اسی دم لاؤڈ اسپیکر پر اناؤنسر نے لندن کی پرواز کا اعلان کیا۔ یہاں خالی اور اکیلی بیٹھی ہوں۔ ٹیرس جا کر جہاز کو پرواز کرتے کیوں نہ دیکھوں؟ اور میں اوپر چلی گئی۔

مسافر اپنے اپنے سامان کے وزن اور چیکنگ سے نپٹ کر ایک ایک کر کے نیچے کھلے احاطہ میں جمع ہو گئے تھے۔ جہاں سے انھیں چل کر جہاز میں سوار ہونا تھا۔ الوداع کہنے والے اب وہاں تک نہیں جا سکتے تھے۔ اس لئے وہ سب لوگ اوپر سر اٹھا کر ٹیرس پر کھڑے ہوئے اپنے عزیزوں، رشتے داروں، پیاروں سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک آدھ بات سُنائی دیتی۔ ایک آدھ شور شرابے میں کھو کر رہ جاتی ——— ایک شریر لڑکا اوپر کھڑی لڑکی سے اشارے سے سگریٹ مانگ رہا تھا۔ لڑکی نے اِدھر اُدھر دیکھا اور دبے دبے لہجہ میں بولی ———
"لیکن وہاں سگریٹ پینا منع ہے۔"
" یہاں نہیں وہاں، رن وے کے پاس، میں تب تک بجھا دوں گا پلیز ——— !"
" اچھا میں جلا کر پھینکتی ہوں، تم ذرا پرے ہٹ جاؤ۔"
ایک خوبصورت سی عورت میرے پاس کھڑی بار بار گیلی آنکھیں پونچھ لیتی اور پھر زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر بکھیر کر نیچے جھک جاتی۔ چوتھی بار میں نے

اسے دیکھا تو وہ شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ خود ہی بول اُٹھی ——

"میرے شوہر لندن جا رہے ہیں، میں ایسی حالت میں نہیں کہ ان کے ساتھ جا سکوں۔" اور وہ شرما گئی —— صرف چند دنوں کی بات ہے مگر کمبخت آنسو ——"

اُس نے پھر جھانک کر دیکھا، میں نے دیکھا۔ اس کا شوہر وہیں سے۔ زور سے بڑے پیار بھرے اصرار سے کہہ رہا تھا۔ "تم ایسے کرو گی تو میں ابھی واپس آجاؤں گا۔"

محبّت —— محبّت —— محبّت !! کسی کے چہرے پر مسکراہٹیں تھیں، کسی کی آنکھوں میں آنسو —— ایک ہی جذبہ کارفرما تھا۔ ایک ہی حقیقت —— !

اب جہاز کی پرواز میں چند منٹ رہ گئے تھے۔ نیچے ٹھہرے ہوئے لوگ ایک ایک کر کے جہاز میں سوار ہونے کے لئے جانے لگے۔ سامان سنبھالتے ہوئے، مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے —— ہاتھوں میں۔ گلے میں پھول کی مالائیں، گلدستے، محبّتوں کے مٹ جانے والے نقوش —— پھول جو محبّت کے اظہار کی علامت ہیں، جو مرجھا جاتے ہیں، مٹ جاتے ہیں، لیکن محبّت کی دنیا میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ جو محبّت کو خوبصورتی بخشتے ہیں۔

اب ٹیرس کی ریلنگ سے کئی لوگ چمٹے ہوئے تھے۔ ہر جانے والے کو کوئی نہ کوئی سی آف کرنے، وش کرنے، دعا دینے۔ خداحافظ کہنے والا موجود تھا، دعاؤں کے پھول نچھاور ہو رہے تھے۔

اسی لمحہ —— اسی لمحے میں نے ایک اداس چہرہ دیکھا۔

گہرے رنگ کا سوٹ، کندھے سے اوور کوٹ لٹکا ہوا۔ ایک ہاتھ میں بڑا سا بیگ۔ بار بار وہ سر اٹھا کر ٹیرس کی اور دیکھتا اور ہر بار ایسا کرتے میں اُس کے

ماتھے پر پڑا ہوا بالوں کا گھنا گچھا پیچھے جھول جاتا، ہر آگے بڑھتے قدم کے ساتھ وہ پیچھے بھی دیکھ لیتا —— ان نگاہوں سے کہ شاید کوئی مجھے بھی خدا حافظ کہہ دے، شاید کوئی مجھے بھی بھگوان کو سونپ دے، شاید کوئی مجھے بھی وِش کردے! اس کے ہاتھوں میں کوئی پھول تھا نہ گلے میں کوئی مالا۔ شاید کسی نے اسے محبت کے دو بول، بول کر وداع نہیں کیا تھا۔ شاید اسے یہ آس تھی کہ کوئی آ ہی جائے گا۔ جاتے جاتے —— محبت بھری نگاہ کا سایہ پڑ ہی جائے گا۔

—— جب ہی تو وہ رہ رہ کر، بار بار پلٹ پلٹ کر دیکھتا تھا ——

لیکن اتنے سارے لوگوں کے ہجوم میں بھی وہ تنہا ہی تھا ——

اور یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ میں خود بھی حیران رہ گئی۔ میں نے جب دیکھ لیا کہ اس کے ساتھ کسی کی دعا نہیں ہے تو عورت پن کی ساری محبتوں، ہمدردیوں اور بے پناہ پیار کے ساتھ میں نے اپنے جوڑے کا پھول نکال کر اس کی طرف اُچھال دیا۔ پھول اس کے قدموں میں جا گرا اور پھول کو اٹھاتے اُٹھاتے اس نے جن نظروں سے مجھے دیکھا وہ نظریں!! —— وہی نظریں میرا سہاگ بن گئیں!!

چند ثانیئے وہ وہیں ٹھٹک کر کھڑا رہ گیا۔ حیران حیران سی، کچھ شرمندہ شرمندہ سی نگاہوں سے وہ مجھے دیکھا کیا۔ پھر اِک دم اس کے چہرے پر گلاب سے کھل اُٹھے۔ سیدھے ہاتھ کا بیگ اُس نے بائیں ہاتھ میں منتقل کیا اور پھر، ہوائی جہاز تک پہنچنے تک، ہر دو قدم کے بعد مُڑ کر مجھے دیکھ لیتا اور وِش کر لیتا ——

جب جہاز کی سیڑھی چڑھ کر وہ جہاز کے اندر داخل ہونے کو تھا، تو اب ہمارے درمیان اتنی دوری حائل ہو چکی تھی کہ چہروں کے نقوش دھندلا چکے تھے ——

لیکن پھر بھی میں نے دیکھا کہ ایک لمحہ کو وہ رُکا، پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ خوب زور زور سے ہاتھ ہلایا اور اندر چلا گیا۔

اس لمحہ تو مجھے یہ خوشی تھی کہ چلو میں نے کسی کا دل رکھ لیا ــــ کسی کو اُداس ہونے سے بچا لیا۔ تنہائی کا زہر کسی کی روح میں گھُلنے نہ دیا۔ لیکن اس کے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی اِک دم میرے حلق میں جیسے کچھ اٹکا شاید یہ آنسو تھے ــــ

اور پھر اک دم میں نے بھری دُنیا میں اپنے آپ کو تنہا پایا۔ تب میں نے جانا کہ میں نے آج اپنا دل کھو دیا ہے۔ کسی کو خوشی دے کر اپنی زندگی میں اداسیوں کا رنگ گھول لیا ہے۔ تنہائی کا زہر قطرہ قطرہ میرے جیون میں ٹپکے گا۔ اور میں یونہی سسکتی رہوں گی ــــ

وہ دن ــــ اور آج کا دن ــــ تم کیا گئے میرا تو دیس ہی میرے لئے بدیس ہو گیا۔ قطرہ قطرہ ٹپکنے والے آنسوؤں کا حساب تمھیں کیا دوں ــــ؟ زندگی کی ساری خوشیاں ایک ہوائی جہاز کی گھڑگھڑاہٹ سے وابستہ ہو کر رہ گئیں ــــ ایک دن، دو دن، ایک ہفتہ، دو ہفتے، ایک ماہ دو ماہ ــــ کتنے ماہ و سال آتے گئے، گذرتے گئے اور میں جیسے اس ایروڈرم اور ٹیرس کی دیوانی بن کر رہ گئی ــــ جہاز اترتا تو میں بھی پاگلوں کی طرح نیچے لاؤنج میں آ کھڑی ہوتی۔ شاید وہ چاند کبھی نظر آ جائے۔ جو ایک لمحہ کو میرے گھور اندھیارے جیون میں چمکا تھا۔ شاید وہ نگاہیں پھر کبھی میری نگاہوں سے مل جائیں جنھیں بنا سوچے سمجھے ہی میں نے اپنا سہاگ مان لیا تھا ــــ

لیکن کتنی رتیں آئیں اور گئیں، کتنے جاڑے، کتنی برساتیں، کیسے کیسے قاتل موسم

کیسی کیسی جان لیوا پُروائی چلی، لیکن تم نہ پلٹے اور آنکھوں کے دیئے اپنی لو کم کر بیٹھے —— بالوں پر بگلوں کے پروں کا گمان تو نہیں ہوتا، لیکن یہ بھی بتا ہی دوں کہ جیسے ساری جوانی انہی کی نذر ہوگئی —— تم کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ کس طرح مجھے ہر کر چلے گئے؟

سوچتی ہوں تو یہ سارا ایک کھیل سا نظر آتا ہے۔ نہ تمھاری ذات پات معلوم نہ مذہب، نہ نام، نہ نشان، نہ گھر دوار —— پھر بھی میں نے تمہیں اپنا سب کچھ مان لیا۔

تمھارے لئے ہر ایک جگہ سے ناطہ توڑ لیا۔ کس لڑکی کے پیام نہیں آتے، مجھے بھی ایک سے بڑھ کر ایک پیام آئے۔ لیکن میں نے جو اُن نگاہوں کو اپنا سہاگ مانا پھر کسی در پر یہ سیس نہ جھکایا ——

نہ جانے دل کیوں یہ کہتا ہے کہ تم آؤ گے، کبھی نہ کبھی ضرور آؤ گے۔ اسی لئے میں نے آج تک سفید لباس نہیں پہنا —— میں تو سدا سہاگن ہوں نا؟ سہاگنیں تو ہمیشہ رنگین لباس پہنتی ہیں۔ بھلا جو کبھی تم آؤ اور مجھے سفید ساری پہنے دیکھو تو کیا سوچو گے؟ لیکن تم آؤ تو!! —— کوئی سُنے تو یقین نہ کرے، بھلا ایسی باتیں زندگی میں ہوا کرتی ہیں ——؟

لیکن تم کیا جانو محبّت کے ترسے ہوئے اس دل کو تمھاری وہ نگاہ کیسے سیراب کر گئی۔ وہ نگاہ، وہ چاند جو زندگی کے تاریک آسمان پر صرف ایک ہی لمحہ کو چمکا اور ہمیشہ کے لئے انتظار کے کبھی نہ مرجھانے والے پھول دے گیا ——!!

اِک چنبیلی کے منڈوے تلے

"میرے چاند"

خدا کرے تم اتنے برس زندہ رہو جتنی بار چاند چڑھا ہے اور جتنی بار سورج اس آسمان پر چمکا ہے۔ خط لکھنے کے لئے قلم ہاتھ میں سنبھالتی ہوں تو کچھ سوجھتا نہیں، تمھاری پیاری صورت آنکھوں میں جھومنے لگتی ہے۔ ایسے میں لکھ بھی کیا سکتی ہوں؟ یہ چند حروف تو اس لئے لکھ کر بھیج رہی ہوں کہ تمھیں یاد دلا سکوں، آج کی رات آم کے اسی گھنے پیڑ تلے میرا انتظار کرنا جس کے سائے میں بابا نے ایک پیاری سی کیاری بنا رکھی ہے اور جس میں کھلی چنبیلی سے سارے میں مہک رچی رہتی ہے ——

آج اسی چنبیلی کے منڈوے تلے میں تمھاری ہو جاؤں گی نا —— ! میرا دل انجانے وسوسوں اور نئے پرانے ارمانوں سے دھک دھک ہو رہا ہے —— لیکن مجھے تمہارے پیار پر اتنا ہی بھروسہ ہے جتنا خدا کی ذات پر —— اسی لئے تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تمھارے پاس آ رہی ہوں ——

یہ سچ ہے میرے چاند ! کہ بابل کی گلیوں سے ہزار محبت ہونے کے باوجود ایک وقت وہ آتا ہی ہے جب یہ ساری محبتیں زنجیر لگنے لگتی ہیں، اور جی چاہتا ہے

جلد سے جلد اس قید سے چھٹکارا دلے۔ میں آج کتنی خوش ہوں، اس کا احساس سوائے تمھارے اور کون کر سکتا ہے ——؟

آج میں اس بات پر مغرور رہوں کہ بابا نے مجھے پڑھنا لکھنا سکھا کر اس لائق تو کیا کہ میں اپنے احساسات تم تک پہنچا سکوں —— یہ سب تمھیں اس لئے لکھ رہی ہوں کہ مجھے یقین ہے، ملنے پر زبان میرا ساتھ نہ دے پائے گی۔ زبان میرا ساتھ نہ دے سکے تو کیا غم —— قلم تو میرا اپنا ہے ——

تو چاند —— ! اب میں چلوں —— ؟ خدا کرے یہ خط تم تک اسی طرح آسانی سے پہنچ جائے جس طرح بلا کسی کھٹکے میں تمھارے خوابوں میں چلی جاتی ہوں۔ دل کے سارے پیار کے ساتھ ——

تمھاری ہی
عاشی

خط پیار کی خوشبو سے مہکتا ہوا خط —— بابا کے بوڑھے لیکن مضبوط ہاتھوں میں کانپ رہا تھا۔ کپکپاہٹ جو کمزوری سے نہیں۔ غصّہ ضبط کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

ہونہہ! —— تو یہ ہے شریفوں کی روسیاہ اولاد۔

اسی لئے تو کہتے ہیں لڑکیوں کو پڑھانا لکھانا نہیں چاہئے۔ یہ کرتوت، بدنامی کے داغ —— اُس کا چہرہ سُرخ ہو اٹھا۔ ایک بار پھر اس نے اس لرزتی ہوئی پیار کی کائنات پر نظر ڈالی جہاں باریک اور خوشنما لکھاوٹ میں گھرا "میرا چاند" مسکرا رہا تھا۔

بے حیائی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ کنواری لڑکی اور کسی غیر مرد کو، میرے چاند کہہ کر مخاطب کرے! بابا کی آنکھوں سے خون سا چھلکنے لگا۔

"بابا ـــــ کھانا تیار ہے۔ روٹی کھا لیجئے۔" دنیا بھر کی مٹھاسوں میں ڈوبی یہ رسیلی آواز سن کر بابا غصّے سے کھول گیا۔

" روٹی کیوں کھاؤں، تجھے ہی نہ کھاؤں ؟"

اُس نے چلّا کر کہنا چاہا لیکن مصلحتاً ضبط کر گیا۔ کراری اور کڑوی آواز سے بس اتنا ہی کہہ کر رہ گیا۔

" آج کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

جی تو یہ چاہتا تھا بات اس طرح پوری کرے۔" رات کو خون جو پینا ہے۔" لیکن ٹال گیا۔

بابا کا جواب سن کر عائشہ جھومتی ہوئی باہر آئی۔ وہ چل کیا رہی تھی رقص کر رہی تھی۔ چہرے پر گلال بکھرا ہوا تھا۔ اور رات کے رت جگے کے تصوّر سے آنکھوں میں ابھی سے گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔

"کیوں بابا؟ جی اچھا نہیں ـــــ ؟ اس نے پاس آکر بڑی ملائمت سے پوچھا۔

" اچھا بھلا ہوں۔ لیکن بھوک ہی نہیں تو کھاؤں گا کیسے ـــــ ؟"

اس نے مارے غصّہ کے منہ پھیر لیا۔

عائشہ کا دل باپ کی اس ادا سے بجھ سا گیا۔ اب وہ اکیس سال کی ہو رہی تھی اور اس کی یادداشت میں ایک بھی لمحہ ایسا نہ تھا جب باپ نے یوں بے رخی سے یوں بات منہ پھیر لیا ہو اور پھر آج ـــــ ؟

آج تو ویسے ہی اس کا دل میکہ چھوڑنے کے خیال سے ٹوٹا ٹوٹا تھا۔ ویسے ہی اس کے دل پر آنسوؤں سے بھرے ڈھیروں بادل چھائے ہوئے تھے۔

ایسے میں بابا یوں ناراض ہیں۔

وہ آنے والی خوشیوں اور موجودہ غموں سے چمکتا اور سہمتا چہرہ اُٹھائے کچھ دیر تو باپ کو دیکھتی رہی پھر سر جھکائے اندر چلی گئی۔

اور کوئی وقت ہوتا تو بابا کبھی اسے اس طرح اداس نہ جانے دیتا۔ بیوی کی موت کے بعد سے تو اس کا جان اور ایمان سب کچھ عائشہ ہی تھی ——

پورے اکیس برسوں تک اس نے کس پیار سے اسے پالا تھا۔ کبھی بیٹی کو ایک ہلکی سی گھڑکی تک نہ دی۔ ایک سے ایک اچھا پیام اس کے لئے آیا لیکن اس نے ہر پیام کو یہ سوچ کر رد کر دیا کہ جس طرح میں نے اپنی عائشہ کو لاڈ پیار اور آرام سے رکھا ہے —— اور کوئی نہ رکھ پائے گا ——

جب بھی جس چیز کی فرمائش کی۔ اپنی بے مائیگی کے باوجود بیٹی کی خواہش پوری کی۔ غریبی کے ایام میں خود بھوکا رہ کر ننگا کھلا رہ کر اسے کھلایا پہنایا لیکن یہ کبھی نہ ظاہر ہونے دیا کہ ایک سید کو جو اتنا خوددار اور غیرت مند ہو کہ کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتا ہو، یہ سب کرنے میں کتنی تکالیف کا سامنا ہوتا ہوگا اور آج —— ! —— آج اُسی بیٹی نے محبتوں کا یہ صلہ دیا۔ عزت ڈبونے میں کوئی کسر ہی باقی نہ رکھی ——

آخر میں کس دُنیا میں جی رہا تھا کہ اس حد تک بات طے ہو گئی اور مجھے پتہ ہی نہیں اور آج بھی کیا پتہ چلتا اگر وہ خنزیر کی اولاد الّو گھبرا کر نہ بھاگ نکلتا ——

ہوا یہ کہ آج صبح ہی صبح بابا جب مسواک لے کر اپنے باغیچہ کی منڈیر پر بیٹھا ہی تھا کہ ادھر سے الّو گذرا۔ بابا نے آپ ہی آپ سارے گاؤں کے بچوں بڑوں کی ذمہ داریاں اپنے ذمّہ لگالی تھیں کہ کون کدھر جاتا ہے کون کیا کرتا ہے۔

فلاں نے آج عربی کا درس لیا یا نہیں، فلاں نے قاعدے کا پہلا سبق یاد کیا یا نہیں ـــــــ

پھر بابا کی مذاق کرنے کی بھی عادت تھی۔ چھوٹے بڑے سبھی ان کی زد میں رہتے تھے۔ سبھی لوگ بابا کی بزرگی اور بڑے پن کی وجہ سے اُن کا ادب کرتے تھے۔ بچوں کا تو سوال ہی تو کیا، بڑوں میں سے بھی بابا نے جو بات جس سے کہہ دی اس کا مان لینا گویا فرض ہو گیا۔۔۔ ـــــــ

ایک دن پہلے اٹو نے مدرسے میں عربی کا درس نہیں لیا تھا۔ یہ بات بابا کو معلوم تھی آج صبح ہی صبح اُسے جو اس طرح جلدی جلدی بھاگتا دیکھا تو بابا کی شرارت کی رگ پھڑکی بیٹھے بیٹھے بولا ـــــــ

"کیوں رے! کل مدرسے سے غیر حاضر رہا اور آج ماں کی چوری سے یہ نیفے میں کیا اڑس کر بھاگا جا رہا ہے۔"

بچہ پھر بچہ ٹھہرا۔ اس کا ہاتھ ایک دم نیفے پر گیا اور ہکلا کر بولا۔

"م ـــ م ـــ میں ـــ نے کچھ بھی ....."

لیکن اس کی بوکھلاہٹ سے بابا کو شک ہوا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ مسواک منڈیر پر رکھ کر بابا اٹو کی طرف لپکا تو اٹو سرپٹ دوڑا۔

بچپن اور بڑھاپے کی دوڑ میں بڑھاپا ہی جیتا۔ کیونکہ بڑھاپا راستی پر تھا اور بچپن جس کا نام اٹو تھا۔ بچپنے کی بھول میں راستے سے ہٹ کر پگڈنڈی پر اتر رہا تھا کہ اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا اور پھر ـــــــ اس کی گردن بابا کے مضبوط ہاتھ میں تھی۔

بابا نے اس کا نیفا ٹٹولا تو پرچہ کھڑکھڑانے کی آواز آئی اور دوسرے ہی لمحہ

نیفے سے خط اور جیب سے موتی چور کا ایک لڈو پٹ سے زمین پر آ گرا جو غالباً رشوت کے طور پر اسے ملا ہو گا۔ ننھے نامہ بر نے بغیر کسی پوچھ تاچھ کے حلفیہ بیان دے دیا۔

"عائشہ باجی میرے ہاتھ لال بھائی کو ہمیشہ خط بھجواتی ہیں بابا ——! پر میرا اس میں کیا قصور ہے۔ میں تو سبھی کا کام کرتا ہوں۔ اُن کا بھی کر دیتا ہوں مگر وہ کہتی ہیں میری بات کسی سے نہ کہنا۔ اس لئے میں —— ڈرتا ہوں۔ ورنہ ....."

بابا کے کان اس کی آواز پر کب تھے وہ تو اس وقت اپنے آپ کو پاگل پاگل سا محسوس کر رہا تھا۔

لال خاں —— وہ خونی —— وہ حرامزادہ، وہ پٹھانوں کی کمینی اولاد ——! اور اس کے نام ایک سیّد زادی کا یہ خط ——؟!

اور آج کی رات! یہ شادی کی نام نہاد رات —— یہ عزت لوٹ کر چل دینے کی کمینے پن کی انتہا کی رات —— لیکن جب اپنا پیسہ کھوٹا ہے تو پرکھنے والے کا کیا دوش —— اِس کُتیا نے یہ تو سوچا ہوتا کہ اس طرح عزت گنوا کر بھاگ کر جائے گی تو اپنی زندگی تو تباہ کرے گی ہی، باپ کے مُنہ پر زمانہ تھوکے گا لیکن یہ حرامزادہ .....

ایک خیال دوسرے خیال سے ٹکرا جاتا اور پہلا خیال وہیں دم توڑ جاتا۔ ایک سوچ دوسری سوچ سے ٹکرا کر اس کے دماغ کے پرخچے اُڑا رہی تھی ——

"اچھا بٹیا رانی ٹھیک ہے، آج تمھیں ضرور اس قید سے چھٹکارا مل جائے گا جس کا ذکر تم نے اپنے خط میں کیا ہے ——!! اس نے سوچا ——

دن بھر بابا ـــــ اپنے دروازے کے سامنے بیٹھا بندوق چمکاتا رہا تاکہ کوئی نادر بر دروازے سے داخل نہ ہونے پائے۔

عائشہ نے دو ایک بار آکر کھانے کو پوچھا بھی، پھر اس کا اُلجھا ہوا انداز دیکھ کر پلٹ پلٹ گئی۔ شام کو وہ بیٹھک تک آئی اور بولی۔

"بابا ـــــ! دن بھر نہ کھایا نہ پیا، یہ بندوق کی صفائی کیوں ہو رہی ہے؟"

"آج بہت دنوں بعد شکار کھیلنے کو جی چاہتا ہے، بیٹی۔" صبح سے پہلی بار بابا ذرا بشاشت سے بولا۔

لیکن اس بشاشت کے پیچھے جو گہرا طنز چھپا ہوا تھا۔ اُسے عائشہ نہ سمجھ سکی۔ ایک دم وہ بچّوں کی طرح باپ کے گلے میں جھول سی گئی۔

"بابا اگر آپ ہرن ماریں گے تو اس کی کھال سے میں جھولنا بنواؤں گی۔ اس میں بالکل سردی نہیں لگتی۔"

بابا کا دل ایک لمحے کو کانپ سا گیا۔ کیا گہرے پیار کو اسی دن کے لئے پروان چڑھایا کرتے ہیں کہ اپنے ہی ہاتھوں بندوق سے بھون دیں، لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ ٹھٹھک گیا۔

"بیٹی اب سردیوں میں تجھے کسی جھولنے کبھی شال کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔"

"کیوں بابا؟"

حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل کر اور بھی خوبصورت ہو گئیں اور وہ بابا سے الگ ہو کر ٹھٹھک سی گئی۔

وہ سنبھلا ـــــ "میں اسی مکان کو ایسا آرام دہ بنا دوں گا کہ سردی گرمی اثر ہی نہ کرے۔"

وہ خوش ہوگئی، پھر پیار سے بولی۔

" بابا میری ایک بات آپ مانیں گے۔"

" ہاں ہاں بول"

وہ بناوٹی خوش دلی سے بولا۔

" بابا آپ کے پاس جو بچھوے اور چھاگلیں رکھی ہیں وہ آج مجھے پہننے کو دے دیجئے نا۔"

" ضرور ضرور ——" بابا جھوم کر بولا۔" اسی دن کے لئے تو تیری ماں کے زیورات اُٹھا کر رکھے تھے کہ تو پہننے کے قابل ہو جائے۔ لیکن جائے گی کہاں پہن کر؟"
وہ نہیں چاہتا تھا کہ بیٹی کو ہلکا سا بھی شبہ ہو جائے کہ باپ اس کے راز سے آگاہ ہے۔

" بابا آج میں اور میری ساری سہیلیاں مل کر ڈنڈار[۵] کرنے والی ہیں۔"

بابا نے کچھ کہے بغیر چابی اس کے حوالے کر دی۔ عائشہ رقص کرنے کے سے انداز میں چلی گئی۔

شام پڑے سُرخ سُوجی آنکھوں سے عائشہ باپ کے پاس آئی اور گلے لگ کر بولی۔

" بابا! واپسی میں مجھے دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہوئیے گا کیونکہ ڈنڈار سکینہ کے گھر ہے اور اس کا گھر بہت دور ہے۔

اس کی آواز جس میں رہ رہ کر گھنگھرو چھنکا کرتے تھے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بابا اب بھی کچھ نہ بولا —— جانتا تھا گھر چھوڑ کر جانے کا سارا دُکھ

۵؎ رت جگا، جس میں رات بھر بیاہن کے دیہاتی گانے گائے جاتے ہیں۔

آنکھوں کی راہ سمٹ آیا ہے، ایسے میں وہ ذرا بھی چھیڑتا تو ندیاں بہہ جاتیں، وہ مصلحتاً خاموش رہا ـــــ

عائشہ کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد وہ اٹھا، بندوق سنبھالی اور گاؤں کے آخری کنارے پر واقع اپنی امرائی کی طرف چلا، جس کے نیچے اس نے تھوڑی سی سبزی اور پھول اگا کر اسے کیاری سا بنا دیا تھا ـــــ

چھم چھم کرتی عاشی تیزی سے آگے بڑھی اور لال خاں کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی ـــــ

"میں آگئی میرے چاند!"

بابا دم سادھے، سانس روکے، دور آم کے گھنے پیڑ کے موٹے تنے کے پیچھے سے دیکھا اور سنا کیا۔

لال خاں نے اسے جھک کر دونوں ہاتھوں میں بھر کر اوپر اٹھایا ـــ 'کالا دیو ـــ اس کا نام لال خاں کس نے رکھا ہوگا ـــــ'

بابا نے جل کر سوچا، لیکن چڑھتے چاند کی روشنی میں جب بابا نے اس کا چہرہ دیکھا تو ٹھٹھک کر رہ گیا ـــــ چہرے پر وہ نمک برس رہا تھا کہ دیکھنے سے منہ میں پانی آجائے، بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، مضبوط اعضا ـــــ اس نے کھلونے کی طرح عاشی کو اٹھایا اور کھڑا کر دیا۔

"تم میرے قدموں میں بچھنے کے لئے نہیں، دل میں آنکھوں میں بسنے کے لئے ہو گڑیا ـــــ!"

عائشہ کچھ نہ بولی، ایک ہی سسکی نے اس کا سارا جسم ہلا دیا ـــــ

تھوڑی دیر بعد کہنے لگی ـــــ

" کاش بابا خود مجھے اپنے ہاتھوں وداع کرتے ۔"

" یہ ناممکن تھا عائشہ ــــ "

لال خاں سنجیدگی سے بولا ۔

" تم اپنے باپ کو جانتی ہو ، وہ پُرانی روایتوں میں جکڑے ہوئے ہیں ۔ وہ زمانے کی سوچتے ہیں دنوں کی نہیں ــــ تمھیں معلوم ہے عاشی ۔ میں نے تمھیں حاصل کرنے کے لئے کیا کیا نہیں کیا ۔ شہر جاکر اعلیٰ تعلیم حاصل کی ، عزت کی نوکری حاصل کی ، شریفانہ طور پر پیغام بھجوایا ــــ لیکن بابا جب بھی ملے مجھے انھوں نے حقیر ہی سمجھا ــــ !

جانے کس نے میرے خاندان میں کبھی خون کیا ہوگا ، اس کے حوالے سے سدا مجھے خونی ہی کہہ کر پکارا ، میں یہ سب کچھ سہہ سکتا تھا ۔ لیکن تمھاری رفاقت ، تمھاری جُدائی نہیں سہہ سکتا تھا ۔ اور اسی لئے میری عاشی میں نے تمھیں گھر چھوڑنے پر اکسایا ــــ گھر سے بھاگنے پر نہیں ــــ !

اس لئے کہ تم ایک شریف اور سید باپ کی بیٹی ہو ، میں اپنے ساتھ قاضی کو بھی لایا ہوں ، پہلے وہ نکاح کی رسم اس چنبیلی کے منڈوے تلے ادا کریں گے ۔ پھر تم بابل کی گلیوں سے سچ مچ دلہن بن کر وداع ہو گی ــــ

اُس وقت تک میں تمھارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لوں گا ــــ میری رگوں میں بھی شریف باپ کا خون ہے میری گڑیا ــــ ؟ "

عائشہ میکے سے جانے والی دلہنوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ اُس کا دل شک اور یقین کے مابین اب تک ڈگمگا رہا تھا ــــ

سنبھل کر بولی ۔

"میرا دل گھبرا رہا ہے، جلدی سے یہاں سے نکل چلو۔"

بڑے پیار سے وہ بولا۔

"تم سمجھتی نہیں ہو جان! اگر ہم یونہی نکل گئے تو دوسرے گاؤں والے ہمیں بھگوڑا کہیں گے ــــــ" میں کیسے سمجھاؤں کہ میں تمھیں ذلت اور بے عزتی سے زندہ نہیں رکھنا چاہتا ــــــ "میں تو چاہتا ہوں کہ میری رانی جب بھی چلے غرور اور فخر سے سر اونچا کر کے چلے۔"

پھر لال خاں نے روایتی فلموں کے ہیرو کی طرح تین بار تالی ٹھونکی۔

اور عقب سے ایک بڑے میاں نکل کر آئے۔

قرآن شریف درمیان میں رکھ کر انھوں نے ذرا گھبرائے ہوئے انداز میں لال خاں کے قوی ہیکل جسم کی طرف دیکھا پھر ڈری ہوئی آواز سے بولے۔

"لیکن میاں گواہ کہاں سے آئیں گے۔ آپ کو معلوم ہے اسلامی شریعت کے مطابق دو گواہوں کا بوقت عقد موجود ہونا ضروری ہے ــــــ؟"

"قاضی صاحب! ایسے پاکیزہ دلوں کو سوائے خدا کے بھلا اور کس گواہ کی ضرورت پڑ سکتی ہے ــــــ۔"

بابا نے ایک ساتھ خوشیوں اور دُکھوں سے بوجھل دل سے کہنا چاہا ــــــ! لیکن آنسوؤں نے اس کی گویائی چھین لی تھی۔

ــــــ ⁂ ــــــ

تختِ طاؤس

اماں نے خط لکھوانا شروع کیا ـــــ

"لکھو بیٹی ـــــ"

"پتہ نہیں ان بوڑھی آنکھوں کو کب تیرا سہرا اور چاند ایسی دلہن دیکھنا نصیب ہو۔ یہاں تو ہر دن موت سے قریب تر ہو رہی ہوں تو ایک بار چند روز کے لئے ہی سہی آجا......"

اماں بولتی رہیں ـــــ ان کے گلے میں رہ رہ کر پھندے سے پڑتے رہے ـــــ آنسو پی پی کر، ہپا ہپا کر جب وہ خط مکمل کروا چکیں تو آس بھرے لہجے میں بولیں ـــــ

"بیٹی اس کا جواب کب تک آجائیگا؟"

"جواب ـــــ ؟" میں نے حلق میں پھڑ پھڑاتے دل کو بڑی مشکل سے قابو میں کر کے کہا ـــــ "یہی کوئی بارہ پندرہ دن میں اماں ـــــ"

"اماں" ـــــ میں نے چیخ چیخ کر کہنا چاہا ـــــ "یہ سارا کھیل اب مجھ سے نہیں کھیلا جاتا ـــــ تم جو ہر پندرہ دن کو ایک خط پاتی ہو وہ میری طرف سے ہوتا ہے اور جو جواب تم لکھواتی ہو وہ تمھارے بیٹے تک نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ اماں آج تک کوئی ہرکارہ ایسا پیدا نہیں ہوا جو مرنے والوں تک خطوں کو پہنچا سکے ـــــ

میرا صورت لوٹو اماں ــــ تمھارا بیٹا، تمھارا شہزادہ ــــ وہ تمھاری زندگی کا اکلوتا اور آخری سہارا جنگ میں کام آچکا ہے ۔ تم اسے خط لکھواتی رہو گی، اس کی دلہن کے لئے جوڑے سی سی کر رکھتی رہو گی، لیکن وہ اس جگہ جا چکا ہے اماں، جہاں تمھارے آنسو اور آہیں بھی نہیں پہنچ سکتیں ــــ"

لیکن میں نے اماں کے کمزور، ناتواں، اور دکھوں سے بوجھل جھکے ہوئے وجود کو دیکھا اور اپنے پہلو میں ٹوٹتے دل کو مسوس کر ذرا بشاشت سے کہا ۔

اماں ــــ خطوں میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ تم اتنی بے کل کیوں ہو جاتی ہو ــــ" اس کا دنیا میں سوائے تمھارے کوئی ہے ؟ پھر وہ تمھیں یاد نہ کرے گا تو اور کسے کرے گا ؟"

" ارے نہیں بٹیا ــــ وہ جھلائے ہوئے، مگر پیار سے لبریز لہجے میں بولیں ــــ" ان آجکل کے چھوکروں کا کوئی ٹھیک نہیں ہے، چار یار دوستوں میں مل بیٹھے اور یہ بھی بھول بیٹھے کہ کوئی ماں بھی ہے ۔"

" ارے نہیں اماں تم غلط سوچتی ہو یوسف ایسا نہیں ہو سکتا ــــ"

" اب بٹیا تو اس کی طرف سے نہیں بولے گی تو کون بولے گا ویسے تو ہمیشہ تو خود اس سے جھگڑتی رہی لیکن جہاں میں نے کچھ کہا تجھے ادبدا کر اس پر پیار آیا۔ ہاں بٹیا یہ بھی یاد سے لکھ دینا کہ منہ دکھائی میں تو اپنی دلہن کو انگوٹھی پہنائے گا یا کلائی پر گھڑی باندھے گا ــــ مجھے تو ایک ایک چیز جوڑنی ہے، وقت پر ایک دم سے سوجھتا بھی تو نہیں ۔ یاد سے پوچھوا لینا بیٹی ــــ"

" ہاں اماں ــــ" میں نے سر جھکا لیا ــــ" اور کچھ کہنا ہے اماں"؟ میں نے ٹوٹتے دل سے پوچھا ــــ

"نا بٹیا ـــــ اب کیا لکھنا ہے ۔ اور جو پوچھے تو اتنا لکھوانا ہے کہ آسمان جتنا بڑا کاغذ بھی کافی نہ ہو ۔ یہ ماں کا دل ہے نا بٹیا ـــــ ؟ اس کے پیار اور ممتا کا کوئی اور چھور نہیں ہے ۔"

میں اُٹھنے لگی تو اچانک جیسے انھیں پھر کچھ یاد آگیا ـــــ "بٹیا یہ بھی پوچھ لینا کہ آجکل تو نیا زمانہ ہے ۔ نئے نئے فیشن نکلے ہیں ۔ ہمارے زمانے میں تو سہاگ کا سُرخ جوڑا چڑھتا تھا، اب تو گلابی ۔ نارنجی اور سفید تک چڑھنے لگے ہیں، اپنی پسند کا رنگ بھی بتلادے ـــــ"

وہ اَن دیکھی دلہن ـــــ وہ پھولوں بھری سہاگن جو وقت سے پہلے ہی بیوہ ہوگئی ، اماں اُسے کون سا رنگ سجے گا ؟ نہ دولہا ہے نہ دولہن ـــــ اماں یہ بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے اس راز کو پالتے پالتے مجھے دق ہوجائے گی ۔ مگر میں نے خود کو سنبھال کر کہا ـــــ

" اطمینان رکھو اماں میں سب کچھ لکھ دوں گی ۔" اور اپنے کمرے میں آکر سسک پڑی ـــــ

اماں بیچاری کے نصیب بھی کیا نصیب تھے ۔ بچپن سے غریبی میں گذر بسر ہوئی ۔ جوانی آنے پر ماں باپ نے اپنی ہی حیثیت دیکھ کر شادی کردی ۔ شادی کے ایک سال بعد ایک معمولی سی بیماری میں میاں اللہ کو پیارے ہوگئے ۔ یوسف باپ کی موت کے دو ماہ بعد دنیا میں آیا ۔ جوان بیوہ کا اکلوتا سہارا ـــــ غریبی کے ہاتھوں نوکری ڈھونڈتی ڈھونڈتی جب وہ ہمارے در پر پہنچی ہیں، اس وقت ہمارے یہاں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی ۔ کئی ننھی ننھی جانوں کو چھوڑ کر میری امی موت کو اپنا چکی تھیں ۔ بڑے بچے تو

کیسے بھی پل ہی جاتے ہیں۔ مگر ایسا بچہ جس نے ماں کے سینے کے گرم اور نرم زندگی بخش لمس کو محسوس تک نہ کیا ہو ـــــ جس نے ابھی دنیا کو آنکھ کھول کر دیکھا تک نہ ہو۔ ایک دم بھری پُری دنیا میں تنہا رہ جائے ـــــ یہ کوئی اس دل سے پوچھے جس کے سر اتنے سارے بچوں کی ذمہ داری آپڑی ہو۔

زینت بی بی کو فوراً ہی ملازمت پر لے لیا گیا۔ کیونکہ اُن کی اپنی گود میں خود ایک چھوٹا سا دودھ پیتا بچہ موجود تھا۔ چھوٹے بچے بھلے سے دوسروں کے ہوں اُن کو ایک ایسی ہی عورت پال سکتی ہے جس کے اپنے دل کو مامتا کی کلپ لگی ہوئی ہو۔ مگر زینت بی نے تو کچھ زیادہ ہی کر دکھایا۔ اپنے نسبتاً بڑے بیٹے کو انھوں نے اوپر کے دودھ پر لگا دیا۔ اور اپنے نئے مالکوں کی بچی کو یعنی مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ راتوں کی نیندیں اور دن کا چین حرام کر کے اپنے جسم کا خون پلا پلا کر انھوں نے گھر والوں سے ایک التجا کی۔

" غلطیاں انسان سے ہوتی ہیں۔ میں بھی انسان ہوں۔ خطاؤں کی پوٹ! مگر میرے کسی قصور پر بھی مجھے اس گھر سے نہ نکالا جائے۔ اس بچی سے جُدا نہ کیا جائے اس کے بغیر میں جی نہ سکوں گی۔ میں نے اس کے لئے نو مہینے کا وہ کرب نہیں جھیلا جسے جھیل کر ایک ماں جنت کی خالق بنتی ہے۔ مگر میں نے اُسے اپنی جوانی نذر کی ہے جو ایک عورت کا خوبصورت ترین سرمایہ ہوتی ہے۔"

اور یہ حقیقت تھی کہ میری خاطر راتوں کو جاگ جاگ کر وقت بے وقت کی روں روں پر اپنا چین لٹا کر انھوں نے اپنے خوبصورت سیاہ بالوں کو غمناک اُجالے عطا کئے تھے اور وہ جو سارے گھر کی محض زینت بی تھی۔ ان دو ننھے منے ہونٹوں کی جنھوں نے پہلی بار بولنا سیکھا تو اماں ہی سیکھا۔ شروع سے اخیر تک اماں ہی اماں بکتی گیا

اور وہی ایک ہستی اماں جیسے خوبصورت خطاب کی مستحق ہو سکتی ہے جو کسی معصوم کی تکلیف پر اپنی آنکھیں نم کر سکے۔ اور یہاں تو اماں نے جیسے ساری زندگی بھر کے لیے میری خاطر آنسوؤں کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔

میں جب ذرا بڑی ہوئی اور ایسی چاہنے والی ماں کا اصل روپ دیکھا اور جانا تو میرا دل درد اور کرب سے بھر گیا۔ ان کی وہ چھوٹی اور اندھیاری کوٹھری۔ جھلنگی چارپائی سن لائٹ صابن سے دھلی چادر —— غریبانہ مگر صاف ستھرا بستر۔ میں نے پہلی بار جب امیری اور غریبی کے فرق کو سمجھا تھا تو پہلی بار اپنے حسابوں ان سے بڑا بھاری وعدہ کیا تھا۔

"اماں جب میں بڑی ہو جاؤں گی نا تو تمھیں چاندی کے تخت پر بٹھاؤں گی خوب نرم نرم ریشمی روئی بھرا گدا۔ اس پر ریشمی چادر۔ ساری دنیا آئے گی اور دیکھے گی اور حیرت سے پوچھے گی بھئی یہ چاندی کے اس شاندار تخت پر کون بیٹھا ہے؟" اور میں بڑے فخر سے سب کو بتاؤں گی —— "یہ میری اماں ہیں ——"

اماں بڑے پیار سے ہنس پڑی تھیں اور مسکرا کر بولی تھیں "اور یہ یوسف میرے لئے کچھ نہ کرے گا ——؟"

"کرے گا کیسے نہیں وہ بڑا ہو کر تمھارے لئے ایک چاند جیسی بہو لائے گا۔ پھر اپنے گھر میں خوب سارے ننھے ننھے بچے ہوں گے۔ اور مارے شور کے تم ان کے پیچھے بوکھلا بوکھلا کر بھاگو گی"

یہ خواب ایک ساتھ میں نے اور اماں نے دیکھا تھا۔ مگر خواب کی تعبیر یہ تھی کہ اماں کا جوان بیٹا جنگ میں مارا جا چکا تھا۔ اور وہ آس بھری نامراد ماں ہر پندرہ دن میں اپنے جگر گوشے کو ایک خط لکھواتی تھی کہ میرے اعضاء تھک گئے

ہیں، سر پہ سورج سایہ فگن ہے۔ دکھوں اور غموں نے وقت سے پہلے ہی الوداع کہہ دیا ہے۔ ایسے میں آنکھوں کی ایک ہی تمنّا ہے کہ بس تجھے دولہا بنا دیکھیں۔"

امّاں مجھے یوسف سے کسی طرح بھی کم نہ چاہتیں ورنہ یوسف کی جُدائی شاید انھیں مار ہی ڈالتی۔ اُنھیں خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ وہ مجھے بے پناہ چاہتی ہیں اور میں تو خدا کے بعد اُنھیں کے سہارے زندہ رہی تھی۔ ایسے میں یہ میرے لئے کیسے کرب کی بات تھی کہ پچھلے کئی سال سے اس راز کو پالے جا رہی تھی۔ لگتا تھا دل میں پھوڑا ہو جائے گا۔ اور یہ بوجھ کسی دن یوں بڑھے گا کہ میرا دل پھٹ جائے گا۔ میں اس دن کے بارے میں سوچتی کہ جب ایک غمناک سے دن ایک خط آیا تھا۔ جس نے ہمیں یہ اطلاع دی تھی کہ یوسف میدانِ جنگ میں کام آگیا۔ اگر میں ضبط اور حوصلے سے کام لے کر اُسی دن امّاں کو بتا دیتی کہ امّاں تم نے جو ایک پودا لگایا تھا وہ بھری جوانی اور بھری بہار میں منہ موڑ گیا ہے۔ اور اب زندگی بھر کے لئے تمھاری آنکھوں میں آنسو ہیں، تو شاید وہ مسلسل دکھ سہتے سہتے پتھر بن چکی تھیں، یہ دکھ بھی سہہ جاتیں۔ لیکن میں خود ہی یہ قدم نہ اٹھا سکی۔ اور میں نے ایک بڑے جوکھم کا فیصلہ کر لیا۔

"میں زندگی بھر ــــــ امّاں کی زندگی بھر اس راز کو پالتی رہوں گی کہ یوسف مر چکا ہے۔"

یوسف ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے امّاں کو ۲۵ روپے بھی بھجواتا تھا ــــــ یہ مرحلہ میرے لئے سب سے کٹھن تھا۔ میں پچیس روپے ماہانہ آخر کہاں سے لاؤں گی۔ بہرحال یہ منزل بھی طے کرنی ہی تھی۔ میں امّاں کی طرف سے خط لکھتی۔ ان بیچاری کو تو لکھنا پڑھنا آتا ہی نہ تھا، وہ مجھ سے کہتیں۔ میں لکھتی جاتی۔ پھر یوسف کی طرف سے میں خود ہی

جواب لکھ کر پوسٹ کر دیتی۔ یوسف کی زندگی میں مخصوص فوجی نمبروں والے خط آتے تھے، ممکن ہے اماں تاڑ جائیں کہ اب خط ویسے نہیں ہوتے، تو اب میں خط کا پی میں رکھ کر انھیں سنایا کرتی۔ ہر مہینے بڑے جتن سے منی آرڈر کرتی اور اماں انگوٹھا لگا کر وہ روپے وصول کرتیں اور خوش ہو ہو کر خرچ کرتیں۔

"اے بیٹی ـــــ اب کی بار چاندی کی پازیب خرید لیں گے۔ دولہن سارے میں چھم چھم کرتی گھومے گی تو گھر میں بڑی رونق لگے گی ـــــ"

"بٹیا اب کے سال ناک کی نتھ بنوا لیں گے۔ نتھ نہ ہو تو دلہن کے نور نہیں کھلتا۔ روپ نہیں اترتا" ـــــ "بیٹی اس ماہ کنگن خرید لیں ـــــ؟ کنگن نہ کھنکیں تو....

میں سوچتی۔ میری شادی ہو جائے گی تو کون اس راز کو پالے گا ـــــ؟ شادی تو بہر حال ہونے ہی والی تھی۔ پھر سوچتی اماں کو اپنے ساتھ ہی اپنی سسرال لیکر کیوں نہ چلی جاؤں ـــــ؟ لیکن ہم کچھ اور سوچتے ہیں وقت کچھ اور کرتا ہے۔ میری شادی کی بات ابھی پکی ہوئی ہی تھی کہ اماں کو نمونیہ ہو گیا اور آخری بلاوا آ گیا ـــــ

شاید مرنے والوں کو احساس ہو جاتا ہے کہ یہ ہماری آخری گھڑی ہے ـــــ اس دن جب اماں کی سانسیں اکھڑی اکھڑی چل رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور رک رک کر بڑی مشکل سے بولیں ـــــ

"بٹیا تو جنتی ہے۔ تجھ ایسی بیٹیاں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں ـــــ تو نے میرے لئے وہ کیا جو پیٹ کا بیٹا بھی نہ کرتا ـــــ"

"اماں میں تمھارے پیٹ ہی کی بیٹی ہوں۔ تم نے مجھے زندگی دی تھی اماں، اپنا خون پلایا تھا۔ اور اولاد کسے کہتے ہیں اماں ـــــ؟"

"نہیں بٹیا ـــــ پیٹ کی اولاد بھی اتنا نہیں کر سکتی جو تو نے کیا ـــــ بٹیا ـــــ

وہ کراہ کراہ کر بڑے آنسو بھرے لہجے میں بہت رُک رُک کر بول رہی تھیں۔

"بٹیا جس دن یوسف کی موت کا خط آیا، میں ساتھ والے کمرے میں صفائی کر رہی تھی اور تو سمجھی میں باورچی خانے میں ہوں —— بڑے ماموں کو تو نے خط سُنایا اور کہا —— "ماموں میاں۔ اماں کو یہ بات معلوم نہیں ہونی چاہیئے ورنہ وہ رو رو کر جان سے چلی جائیں گی...."

اماں —— میں چیخی —— مگر انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔"

میں نے سوچا۔ جب میری بیٹی میری جان مجھے دُکھی نہیں دیکھنا چاہتی تو مجھے بھی اس راز کو پالنا ہی ہوگا —— اور میں نے بھی اپنی وہی پرانی روش قائم رکھی —— مرنے والا تو جان سے گیا، مگر تیرے لئے میرا دل کیسے کیسے ٹوٹتا تھا میری بیٹی۔ لیکن اگر میں کہہ دیتی کہ مجھے سب معلوم ہے، مجھے پتہ ہے کہ یوسف مرگیا، تو تُو مجھے غمگین نہ دیکھ پاتی اور میں تیرے آنسو نہ دیکھ پاتی...

میں پتھر کی مورت بنی سُن رہی تھی اور وہ رُک رُک کر کہے جا رہی تھیں ——

"میں نے وہ سب زیور دراصل تیرے لئے خرید رکھے ہیں بیٹی —— پیسہ تو اڑ ہی جاتا ہے بیٹی —— اس سے زیادہ تیز رفتار شے میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ دھیمے قدموں آنے والا۔ تیزی سے جانے والا —— اسی کے کارن میرا بیٹا مجھ سے چھٹا ——"

سوچتی تھی میری بٹیا جو اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر یہ روپیہ مجھے بھجوا رہی ہے اُسے فضول نہ گنواؤں۔ اب میرا آخری وقت ہے بیٹی۔ تیرے سامنے تیری زندگی ہے، خدا کیسے میری دُعا پوری نہ کرے گا —— وہ تجھے ہر خوشی سے نوازے گا بیٹی —— تیری ایک آرزو تھی بیٹی کہ مجھے چاندی کے تخت پر بٹھائے۔ تو نے تو مجھے اُس تخت طاؤس پر بٹھایا ہے بیٹی، —— جسے دل کہتے ہیں۔

میں اُس دل کی عظمت کے آگے اپنا سر جھکاتی ہوں بٹیا...... اور اُٹھنے کی کوشش میں آماں جو آگے کو ہونے لگیں تو لڑکھڑا کر پیچھے کو آپڑیں ۔۔۔ پھر وہ کبھی نہ اٹھ سکیں ۔

میں رونا چاہتی ہوں تو مجھے آماں کی وہ بات یاد آتی ہے کہ ۔۔۔ میں تیری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھی اسی لئے اس راز کو پائے رہی ۔۔۔" میں آنسو ضبط کرنا چاہتی ہوں، کر بھی لیتی ہوں ۔۔۔ لیکن روتے ہوئے دل کو کیسے منع کردوں ۔ کیسے سمجھاؤں ۔۔۔ ؟